Mir Zaheer Abass Rustmani
چار چاند
نیلم احمد بشیر
T2-BOO-306

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
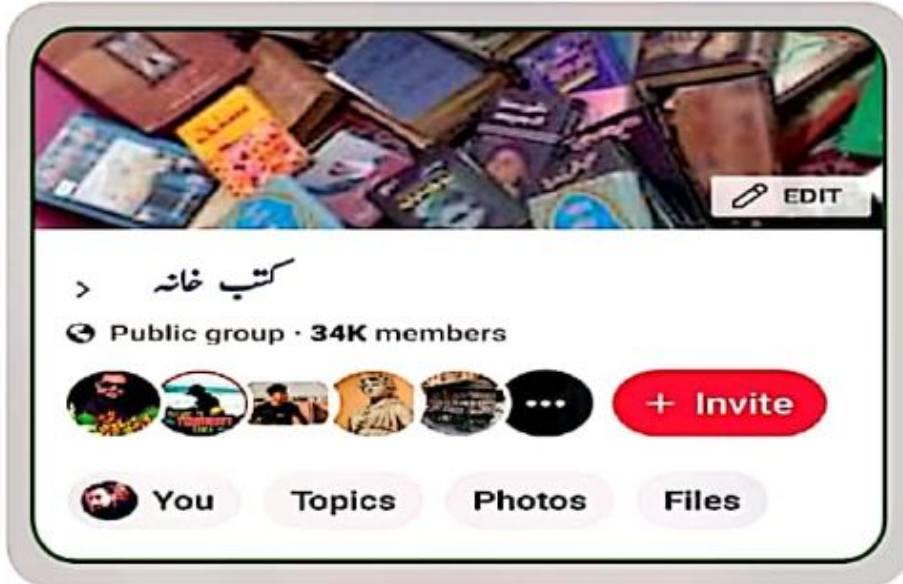
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

نیلم احمد بشیر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

انتساب

اپنے باغ میں کھلنے والی نئی کونپلوں

سویرا اور شاہ میر کے نام

فہرست

خاکے - چتر کاریاں

مضامین - خیال میں

چتر کاریاں

قُقنس

نیلم کی پہلی کتاب "گلابوں والی گلی" کی افتتاحی تقریب میں میں نے کہا تھا یہ چنگاری سلگ کر شعلہ بنے گی اور آج میں بجرم سے کہہ سکتی ہوں کہ میری پیشین گوئی میں کوئی لگی لپٹی نہ تھی۔ اس نے پچھلے چند برسوں میں جو بھی لکھا وہ ادب عالیہ میں شمار ہوا اور اس کی پہچان نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان، امریکہ، لندن، کینیڈا کے اردو ادب کے دنیا میں موجود ہے اور ابھی تو اللہ کے فضل سے اس کے پاس بہت وقت ہے۔ اردو ادب کے گلزار میں وہ بہت سے پھول کھلائے گی۔ اس کے ادب میں اور حساسیت میں جدیدیت کی جو مہک ہے، آنے والا کل اس سے بھیگ بھیگ جائے گا اور اس طرح وقت کی قید سے آزاد ہو کر اس کا ادب زمانوں پر محیط ہوگا۔ جب سے وہ پیدا ہوئی ہے مجھے منہ زبانی یاد ہے۔ اس کے پیدا ہونے سے پہلے سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے سارے گھر کی رانی میں تھی۔ تھن متھنی ہونے کے باوجود گھر والے مجھ پر بل بل جاتے تھے۔ میں جھتی تھی محبتیں وصولنا میرا پیدائشی حق تھا اور ان محبتوں کے بدلے میں کسی کو کچھ دینے کا سلیقہ مجھے بالکل نہیں آتا تھا۔ پھر اچانک اک واقعہ ہوا۔ سارے گھر کی لاڈلی ہماری بھابھی میکے سے مڑی تو اس کی گود میں ایک گلابی سی گڑیا تھی۔ سارا گھر تو اسے دیکھ کر دیوانہ ہوا سو ہوا۔ اسے گود میں لیتے ہی میرے اندر تو جیسے ممتا کے فوارے چھوٹ نکلے۔ میں اسے کسی کو واپس دینے پر تیار نہ تھی۔ چند ہی گھنٹوں میں وہ میری اور اپنے نوجوان چچا کی "ایک تھی ملکہ" بن گئی۔ ہم نے اس کا نام نور جہاں رکھ دیا اور زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ محبت انیرنے کی بجائے دوسروں پہ لٹانا ایک زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ میں خود بھی ابھی چھٹی ساتویں میں تھی۔ اسے گھر چھوڑ کر سکول جانا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی چمکیلی آنکھوں میں بھی تارے دمکنے لگتے۔ سارا گھر نیلم کے

گرد بھنورا بنا پھرتا تھا۔ اس پر صدقے واری جانے کے لیے گھر بھر میں جھگڑے ہوتے لیکن مجھے تو اپنی بھابھی سے بھی جلن ہوتی جو اس پر اپنا حق جتلاتی۔

پھر ایک حادثہ ہوا۔ بھائی کی تبدیلی اچانک کراچی ہو گئی اور وہ نیلم کو بغل میں داب کر کراچی چل دیے۔ ہمارے گھر کی جیسے بتیاں گل ہو گئیں۔ اس کی کلکاریوں کے بغیر گھر سُونا سُونا ہو گیا۔ میری اور نیلم کی محبت کا وہ پہلا دور تھا۔ اس کے دنیا میں آنے سے پہلے میں ہی سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ اس کے کراچی چلے جانے کے بعد میں اچانک بزرگوں میں شامل ہو گئی۔ پھر میں نے اس کے پیچھے بار بار کراچی جانا شروع کر دیا۔ اس پر اتنی دور سے میری اجارہ داری تو قائم نہ ہو سکی لیکن محبت کا جو رشتہ ہمارے درمیان برسوں پہلے شروع ہوا، وقت اس میں کبھی کوئی دراڑ پیدا نہ کر سکا۔ پھر جب زندگی کے حقائق مجھ پر وا ہونا شروع ہوئے اور نیلم اور چھوٹی سنبل نے عنفوانِ شباب میں قدم دھرا تو عمر کے فرق کے باوجود میرا ان کا رشتہ ساتھ کھیل کر بڑی ہونے والی سہیلیوں سا ہو گیا۔ وہ زندگی کے ان انجانے مقامات کے بارے میں متجسس تھیں جہاں سے میں گزر چکی تھی۔ میں دبے دبے لفظوں میں ان پر زندگی کے وہ راز افشاں کرنا چاہتی تھی جو مجھ پر کھل چکے تھے لیکن میرے تجربات اذیت ناک ہونے کی وجہ سے میں ان سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ ان دونوں کی آوازوں میں پیدائشی طور پر بانسریوں کے سُر تھے۔ میری روح سُر کی پیاسی تھی۔ میں گھنٹوں ان کو سامنے بٹھا کر گانے سنتی۔ ان کی آوازوں پر بل بل جاتی اور ان سے مزید پیار کرنے لگتی۔ لاہور ایک پر امن زندگی سے بھرپور روشن خیال شہر تھا۔ ہر سُو انسانی گوشت کے چیتھڑے بکھرنا ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ دھات اور پتھر کے زمانے کے مولویوں نے ابھی ہماری زندگیوں پر دھاوا نہیں بولا تھا۔ لاہور کی خوشگوار شاموں میں ہم شیزان میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ فلموں اور کتابوں اور موسیقی کی بات کرتے اور املتاس کے بوٹے کی طرح ہمارے اردگرد مہکتی زندگی ہمیں جینے نہ دیتی۔ ادب اور ادیبوں سے ہمیں عشق تھا لیکن وہ ہمارے لیے کوئی خدائی مخلوق تھے جنہیں چھو کر دیکھنا ہمارے لیے خواب سے کم نہ تھا۔ ممتاز مفتی، ابن انشا، احمد بشیر کے گہرے دوست تھے۔ پر وہ بھابھی کے چولہے کے پاس بیٹھ کر روٹی کھاتے تھے۔ ان میں بڑے ادیبوں کی چمک دمک نہ تھی۔ ہم ان سے محبت تو کرتی تھیں لیکن ان کی تخلیق کی عظمت ہم پر پوری طرح واضح نہ تھی۔ واضح ہوئی تو ہم نے ان پر شہد کی مکھیوں کی طرح گرنا شروع کر دیا اور مفتی جی نے ہمارے ان کو لکھے ہوئے خطوط دیکھ کر

میری بھابھی، میرے بھائی کی واکی ناکی ڈال تھی۔ وہ اسے پل بھر اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ بھابھی نے ہنستے ہنستے پانچ بچوں کو جنم دیا۔ گھر میں رام لیلا داس رچی تھی۔ نیلم ماں باپ کی رنگ رلیوں میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور باقی چاروں کو گود لے لیا۔ پل بھر میں وہ تیرہ سے 33 کی بن گئی۔ خود سکول جانے سے پہلے سب کو نہلانا، کھلانا تیار کرنا اور سکول لے جانا سب اس کی ذمہ داری تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ آج جب وہ اپنے اپنے گھروں میں ہری بھری شاداب ہیں۔ ہلکا سا کانٹا چبھنے پر بھی وہ نیلم کی طرف بھاگتی ہیں۔ بشریٰ کا فون آتا ہے" باجی میرے نواسے کی داڑھ میں درد ہے۔" سمبل کہتی ہے" ٹی وی پروگرام میں نارڈ نے مجھے ادھیڑ عمر کہا ہے۔" پھر اسماء کا فون آتا ہے" باجی میں کیا کروں کوئی لڑکی میرے بیٹے کی جان نہیں چھوڑتی۔" پھر وہ بھاں بھار کھڑی ہو جاتی ہے اور ان کے بے مایا سے دکھوں کا مداوا کرنے بھاگ نکلتی ہے۔ ایسی مدر ٹریسا کو بھلا کوئی کب چھوڑتا ہے۔ اب جبکہ عمر نے مجھے بھورا بھورا کرنا شروع کر دیا ہے، میں بھی اُسی کی طرف دیکھنے لگتی ہوں۔ میں کہتی ہوں" نیلا مجھے اپنی جسمانی ٹوٹ پھوٹ سے بہت ڈر لگتا ہے۔"" میں ہوں نا" وہ پر اعتماد لہجے میں کہتی ہے اور مجھے تحفظ کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن ممتا سے زیادہ مجھے اپنا سمبل پنا پیارا ہے۔ وہ ذہنی ہم آہنگی جو ہمارے درمیان برسوں پہلے پیدا ہوئی تھی اور جو بعد ازاں ہمیں کبھی کہیں سے نصیب نہ ہوئی۔ پہاڑ کی طرح اٹل بھائی احمد بشیر نے بھی اپنے آخری سانس چھوٹے بچے کی طرح نیلم ہی کی گود میں پورے کیے تھے۔ وہ ان کا آخری سفر آسودہ کرنے کی خاطر انہیں سینے سے لگا کر بیٹھی رہی تھی۔

شادی سے پہلے انتہائی خوش مزاج، دلکش اور رومانوی ہونے کے باوجود نیلم کی زندگی میں کوئی ایسا شہزادہ نہیں آیا تھا جو مشکی گھوڑے پر بیٹھ کر بادلوں سے اترتا اور اس کا ہاتھ تھام کر ہفت آسمانوں میں لے اڑتا۔ احمد بشیر چار بیٹیوں کا باپ تھا۔ اس کے باپ دادا کی کوئی وراثت نہ تھی۔ ایک سچا منہ پھٹ جرنلسٹ ہونے کے ناطے اس کے پاس عزت نفس اور سفید پوشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ دنیاداری کے اس فہم و ادراک کے بھرم کا مکمل فقدان تھا۔ جو بیٹیوں کے ہاتھ مانگنے والے لڑکوں کے سیاق و سباق خیالات جاننے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ بیٹیوں کے بڑے بڑے جہیز بنانا، اس کے بس میں نہ تھا۔ امریکہ سے اچانک ایک انجانا ڈاکٹر ایک ہفتے کے لیے پاکستان اپنے گھر والوں سے ملنے آیا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی پاکستانی بیوی لے جانا چاہتا تھا۔ نیلم یونیورسٹی میں

نفسیات کا ایم اے کر رہی تھی۔ کسی بیچ بچولن نے انہیں احمد بشیر کا پتہ بتا دیا۔ انہیں جہیز یا بڑی شادی کی کوئی خواہش نہ تھی۔ لڑکا دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ نیلم کنفیوژ تھی۔ پھر اس نے جب سنا کہ تین روز کے اندر بیاہ کر وہ امریکہ جانے والی ہے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ہمارے پورے خاندان کی جڑیں پاکستان کی مٹی میں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی خوشبو کے بغیر ہمارے پھیپھڑے بند ہونے لگتے تھے۔ نیلم کو کسی دوسرے دیس جا کر بس جانے کا کوئی شوق نہ تھا لیکن باپ کی سفید پوشی اس کے آڑے آئی اور اسے شادی کے لیے ہاں کہنا پڑی۔ شوہر کے خدوخال اس نے اچھی طرح اس وقت دیکھے جب وہ امریکہ جانے کے لیے جہاز میں کئی گھنٹے ساتھ ساتھ بیٹھے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، بوجوہ ایک طویل عرصہ نیلم سے میرا رابطہ کٹ گیا۔ احساس ذمہ داری تو بچپن کے تجربات نے ہی اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی اپنے ماں باپ کے لیے وہ ایک مددگار بیٹے کا کردار ادا کرے۔ اسی لیے شادی بھی اس نے بغیر کسی حیل وحجت ان کی مرضی کے مطابق کر لی تھی۔ امریکہ جاتے ہی اسے زندگی کا جوا نوکھا یدھ لڑنا پڑا، اس کا ذکر اس نے کسی سے نہ کیا۔ پیچھے وہ سب اچھا کا پیغام بھیجتی رہی۔ اس کے شوہر کو صرف کسی ایسی عورت کی ضرورت تھی جو اس کے بڑے سے گھر میں سبزیاں اگائے۔ اس کی بلیاں پالے، اس کے سرہانے رات بھر دودھ کا گلاس لیے کھڑی رہے اور صبح اس کے جاگنے سے پہلے باہر پھیلی برف بیلچے سے صاف کر کے بلیوں والے کونے میں بیٹھ جائے۔ ان کے ہاں عورت کے مکمل انسان ہونے کا کوئی خاص تصور نہ تھا اور امریکہ کی شخصی آزادی کی حامل فضاؤں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ احمد بشیر نے ڈانٹ ڈانٹ کر ہم سب کو ذہنی طور پر خود مختار ہونے کا سبق سکھایا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کی روح رواں نیلم کو لگا اسے اچانک کسی ایسی سرنگ میں دھکیل دیا گیا ہے جہاں کوئی روشنی موجود نہیں۔ نیلم کی دلکشی اس وقت سر چڑھ کر بولتی تھی۔ آتے جاتے راہی اسے مڑ مڑ کر دیکھتے تھے۔ ڈاکٹر اس کی جاذبیت سے خائف تھا لیکن اس کے ساتھ المیہ ہوا۔ اپنی اینڈی بینڈی شخصیت کے باوجود وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا لیکن اس کی محبت بھی انوکھی تھی۔ اس فلمی کردار کلکٹر جیسی جو اپنی محبوبہ کو زنجیروں سے باندھ کر اندھیرے تہہ خانے میں بند رکھتا تھا تاکہ اس کے سوا کسی اور سے اس کا رابطہ نہ ہو سکے۔ ''بفلو'' کے ایک برفانی گاؤں کے ایک محل نما گھر میں اسے بند کر دیا گیا تھا جہاں ڈاکٹر کے سوا کوئی اس کا ہم زبان تک نہ تھا۔ گھر کے چاروں طرف گھنے جنگلات تھے۔ سنانے کے پرشور ریلے اور حد نگاہ تک برف کی چٹ چٹان۔ گاؤں کے زیادہ تر نوجوان بہتر

مواقعوں کی تلاش میں بڑے شہروں میں جا چکے تھے۔ گاؤں کی اداسی اور تنہائی کے مارے بوڑھوں سے بھرا تھا جنہیں دیکھ کر نیلم کی جبلی ممتا چھلک پڑتی اور وہ بازار جاتے جاتے ان کے پاس کھڑی ہو کر ان کے دکھ سکھ بانٹنے لگتی۔ زندگی میں بہت کچھ پا لینے کے باوجود ڈاکٹر کو ڈپریشن اور منفیت سے پیار تھا۔ نیلم کو پوری طرح اپنے قبضے میں کر لینے کے باوجود اسے زندگی میں کوئی خوبصورتی یا کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ کبھی بہت خوشگوار موڈ میں ہوتا تو نیلم سے کہتا "میرے پاس آؤ، آؤ موت کی باتیں کریں۔" "موت کی کیا بات؟" وہ چونک کر پوچھتی۔ "مثلاً میں اگر مر جاؤں تو تم میرے لیے کس قسم کا تابوت بنوانا چاہو گی۔ میں تو کہتا ہوں ہم دونوں کسی دن چل کے تابوتوں کے ڈیزائن دیکھ لیں۔" "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ گھبرا کر پوچھتی۔

"یوں بھی میری میت اٹھا کر پاکستان لے جانا تمہارے لیے خاصی مصیبت کا کام ہوگا۔" وہ اپنی دھن میں بولتا جاتا۔

کبھی کبھی ایکسائٹ ہوتا تو کہتا "میری کالی بلی دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ چلو آؤ اس کی مدد کریں۔" نیلم آبدیدہ ہو جاتی۔ "مجھے بلیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ آہستہ سے کہتی۔

"تمہیں میری کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اتنی لمبی ہری مرچیں اُگا لیں، تم نے آنکھ بھر کر نہ دیکھیں۔ تمہارے لیے ہیرے کی انگوٹھی خرید کر لایا۔ تمہاری انگلیاں خالی ہیں۔ تم میری ہر بات کو رد کرتی ہو۔ صرف ان لوگوں کو یاد کرتی ہو جنہیں تم پیچھے چھوڑ آئی ہو اور مجھے تم ان لوگوں سے کمتر گردانتی ہو۔" پھر وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرتی لیکن اس کی رگ رگ میں کلبلاتے محبت کے جذبے پھوٹنے سے پہلے منجمد برف بن جاتے اور تنہائی کے یاجوج ماجوج اس کے گرد نئے حصار تعمیر کرنے لگتے۔

یہودی لڑکی این فرینک کی طرح جو نازیوں سے ڈر کر ایک برس ایک بند پرچھتی میں زندگی گزارتی رہی۔ نیلم نے گاؤں کے اس بڑے گھر میں بند رہ کر تین بچے پیدا کر لیے تھے لیکن ڈاکٹر اور اس کے درمیان خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔

شادی کے کئی برس بعد جب وہ ایک بار لاہور آئی تو میں انتہائی شوق سے اسے ملنے گئی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ میں آگے بڑھ کر اسے گلے لگانا چاہتی تھی لیکن وہ مجھے گھبرائی گھبرائی اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس نے مجھے پہلی بار دیکھا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کے سائے تھے اور گفتگو کا انداز سہما سہما تھا۔ "آپ کیسی ہیں؟" اس نے مجھے

پرتکلف لہجے میں پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن تم؟ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

لیکن وہ میری بات کا جواب دیئے بغیر بچہ کندھے سے لگا کر کمرے میں بھاگ گئی کہ ڈاکٹر کمرے میں موجود تھا اور وہ اسے کھلے لفظوں میں کہہ چکا تھا کہ تمہاری پھوپھو تمہاری شخصیت پر منفی اثرات ڈالتی ہے۔ مجھے اداس دیکھ کر بھابھی نے کہا، ہاں نیلم بہت بدل چکی ہے۔ وہ اپنے دل کی بات کسی سے بھی نہیں کرتی۔ اسے اس طرح مٹی کا بت بنے دیکھ کر انگریزی کی وہ فلم یاد آ گئی جس میں کسی قصبے کے مرد اپنی جاگ رتی بیویوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک مشین ایجاد کرتے ہیں جو اس مشین میں ڈھلنے کے بعد موم کی ایسی پتلیاں بن جاتی ہیں جو شوہر کو ''یس باس'' کہنے کے سوا کچھ نہیں جانتیں۔ بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ نیلم موم کی پتلی بن چکی ہے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے اندر کے باغی احمد بشیر کو ختم کر دینا ممکن نہ تھا۔

پھر میٹھے پانی کے چشمے تو ہمیشہ سنگلاخ زمینوں اور تپتے صحراؤں ہی سے پھوٹتے ہیں۔ کتاب کی محبت مجھے اور نیلم کو ہم دونوں کے باپوں سے روایت میں ملی تھی۔ امریکہ کے اس اجنبی گاؤں میں نیلم کو بھی جب اپنے بچوں کے سوا کوئی ساتھی نظر نہ آیا تو اس نے اپنی پرانی دوست کتاب کو آواز دی اور اپنے شوہر کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود لائبریری در لائبریری گھوم کر اپنا وقت گزارنے لگی۔ اس کے دھور اندر پھڑ پھڑاتا تخلیق کا ننھا سا دیا بھڑک کر جل اٹھنے کو تھا۔ اس کے اندر چبھتے درد کے آتش فشاں اسے کندن بنانے میں لگے تھے۔

پھر میں نے پاکستان میں ایک روز ''اخبار جہاں'' کھولا۔ اس میں نیلم کا لکھا ہوا ایک مضمون تھا۔ میں جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ کر بے تابی سے پڑھنے لگی۔ مضمون درد سے بھرا تھا۔ ڈار سے بچھڑی ایک کونج کی کوک تھی۔ اپنی سرزمین، اپنے خاندان سے بچھڑنے کا دکھ تھا۔ دادی کے بل دار پراٹھوں کا ذکر تھا۔ بہن بھائیوں سے مل بیٹھنے کی تڑپ تھی۔ نیلم کے ڈھکے چھپے جذبوں کا اظہار خوبصورت انداز میں پگھل کر صفحۂ قرطاس پر پھیل چکا تھا۔ اس اولین مضمون میں بھی کاٹ کسی بڑے ادیب کی سی تھی۔ میرا جی چاہا، میں آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لوں لیکن ہمارے درمیان کئی دنیاؤں کے فاصلے تھے اور خوش ہونے کے سوا میں کچھ نہ کر سکی۔ وہ گھٹنے ٹیک کر گھرداری کرتی رہی اور اس کا شریک حیات یہی سمجھتا رہا کہ نیلم کا دل جیتنے کا راستہ صرف جبر اور حکمرانی تھی اور نیلم کے خون میں گھلا باغی احمد بشیر جابر کے سامنے وقتی طور پر چپ تو رہ سکتا تھا، فنا فی اللہ نہیں ہو سکتا تھا۔

نیلم کی بھی ایک ہی زندگی تھی۔ اس نے فنافی اللہ ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے باپ سے کہا ''چودہ سال میرا سر ریت میں دبا رہا۔ مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ اب میں جان کنی کے عذاب میں ہوں۔''

احمد بشیر نے زندگی بھر مظلوم اور محکوم کی دادرسی کی خاطر جنگ لڑی۔ وہ اپنی انتہائی ذمہ دار بیٹی کی پکار سن کر تڑپ اٹھا۔ اس نے کہا ''تم جو بھی فیصلہ کرو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' برسوں آگ میں راکھ ہونے کے بعد اس کے اندر ققنس کے پَر نکل رہے تھے۔ نیلم کے اندر کا تخلیق کار اب سر چڑھ کر بولنے کو تھا۔ وہ آزادی کے اس علمبردار ملک امریکہ سے دیوانہ وار بھاگی اور اپنے راکھ ہوتے وطن میں واپس آ کر سکھ کا سانس لیا۔ اس کی زندگی کی گلابوں والی گلی میں انگارے سلگ رہے تھے جو اس نے اپنی قلم کی نوک سناں سے چننے شروع کر دیئے۔ ''لے سانس بھی آہستہ''، ''جگنوؤں کے قافلے''، ''ایک تھی ملکہ'' انسانی دکھوں اور سکھوں کی وہی کہانیاں ہیں جن میں یہاں کا ہر حساس فرد پل پل جیتا ہے اور پل پل مرتا ہے۔ لیکن نیلم جس ماہر سرجن کی طرح ان دکھوں اور سکھوں کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ اسی کا خاصہ ہے۔ امریکہ کی چودہ سال قید بامشقت کے بعد نیلم نے جس طرح اپنے آپ کو ری ڈسکور کیا زندگی کے اڑیل گھوڑے کو سرنگوں کیا، اس کے لیے وہ خراج تحسین کی حق دار ہے۔ نہ صرف اس نے اپنے آپ کو ری ڈسکور کیا بلکہ ادب کے میدان میں اس نے چند ہی برسوں میں اپنے آپ کو رانگلے پیڑھے پر بٹھا لیا۔ اب حال بھی اس کا ہے اور مستقبل بھی۔ چودہ برس امریکہ میں بھی اس کا دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتا رہا۔ اپنے بے گناہ ہم وطنوں کی نعشیں چاروں طرف بکھری دیکھ کر وہ اب بھی بین ڈالتی ہے۔ ''ہمیں وہ لوگ ویت نام بنانا چاہتے ہیں۔'' ''نیلم.....'' میں اسے خوفزدہ آواز میں کہتی ہوں ''تمہارے پاس تو امریکہ کے حقوق ہیں۔'' ''نہیں باجی، میں ان آخری لوگوں میں سے ہوں جو یہاں بیٹھ کر سب کچھ دیکھیں گے اور اپنوں کے درمیان موجود رہیں گے۔'' وہ مجھ سے کہتی ہے اور یہ سچ ہے کہ لاہور شہر کی ادبی زندگی کی رگوں میں نیلم دوڑتا ہوا گرم خون ہے۔ وہ دوستوں کے دکھ سکھ بانٹنے اور محفلیں سجانے کی عادی ہے۔ ادب سے محبت رکھنے والا کہیں سے بھی آنے والا اجنبی اس کا مہمان ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر دوستوں کو کھلانا، اس کی ممتا کو تسکین دیتا ہے۔ رومن کیتھولک پادریوں کی طرح وہ ہر رشتہ دار اور دوست کے دکھ سکھ سننے کے لیے اعتراف کے جھروکے میں بیٹھ جاتی ہے اور تب تک سنتی رہتی ہے جب تک سامنے والے کی تسلی نہ ہو جائے۔ انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ

دل شکستگیاں اسے بہت بری لگتی ہیں۔ اتنی مختصر زندگی میں ہم لوگ پتا نہیں ایک دوسرے کو معاف کرنا کیوں نہیں سیکھتے؟ دو دوستوں یا رشتہ داروں کے درمیان کوئی رنجش ہو تو اسے منانے کے لیے پہاں بھار کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسے تب تک چین نہیں آتا جب تک ان کے درمیان چھائی دھند دور نہ ہو جائے۔ وجوہات فرق تھیں لیکن احمد بشیر سے سنا تھا کہ امرتا پریتم کبھی لاہور شہر کے سینے میں دھڑکتا دل تھی۔ نیلم کے گرد روز بروز بڑھتے دوستوں کے ہجوم دیکھ کر مجھے لگتا ہے وہ بھی اس شہر کی امرتا پریتم ہے اور اگر کبھی حالات نے اسے یہ شہر چھوڑ کر جانے پر مجبور کیا تو یہ شہر ہریاول سے پاک ایک ٹنڈ منڈ پیڑ بن جائے گا۔

عمر کے فرق کے باوجود ہم دونوں کی سوچ میں جڑواں بہنوں سی مماثلت ہے۔ مڈل کلاس کے ہر مخلص پاکستانی کی طرح پاکستان کا ماضی، حال اور مستقبل ہم دونوں کے لیے سوہانِ روح ہے۔ اس ملک کا مسلسل گینگ ریپ کرنے والے لیڈروں سے ہمیں شدید نفرت ہے۔ ہم دونوں انہیں کیفرِ کردار تک پہنچتے دیکھنا چاہتی ہیں۔ طاقت کے بھوکے کٹر ملاؤں کو ہم پاکستان دشمنوں میں شمار کرتی ہیں۔ صدیوں سے رگیدی گئی یہاں کی عورت کے لیے ہم دونوں کا دل خون روتا ہے۔ نیلم کی بہت سی کہانیوں میں ان گونگی، بہری عورتوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ہم دونوں کی زندگی کا نقطۂ اتصال یہ بھی ہے کہ ہم دونوں کو کبھی کسی ایسی محبت کا سہارا نہ مل سکا جو ہماری سوکھی ڈنٹھل زندگیوں کو سیراب کر سکتا۔ نیلم کی صحرا میں پھول کھلانے والی شخصیت کو دیکھ کر اب بھی بہت سی آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔ مجھے ان خواب دنوں میں بھی جب لڑکی اپنے آپ سے بھری ہوتی ہے اور لوگ اسے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں، مرد ذات مجھے دیکھتے ہی اس طرح بدکتی تھی جیسے میں بارہ ہاتھوں والی کالی ہوں اور وہ میرے قریب آئے تو فنا فی اللہ ہو جائیں گے۔

پھر بھی ہم دونوں مطمئن ہیں کہ قہر کے ان وقتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں او یہ سنگت ہمیں جہانِ دیگر تک لے جائے گی۔

پروین عاطف
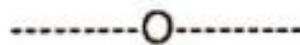
---------O---------

ایورگرین ٹین ایجر

ٹیگور کی ایک خوبصورت نظم ہے

شام کے ڈوبتے ہوئے مغرور سورج نے سوال کیا۔

"کوئی ہے جو میرے بعد میری جگہ لے سکے؟"

مٹی کے ننھے سے دیے نے سر اٹھا کر کہا:

"میں کوشش کروں گا۔"

باجی پروین نے جب مجھ سے مفتی جی کے بارے میں کچھ لکھنے کو کہا تو ایک لحظے کے لیے تو میں چونک کر رہ گئی۔ کانپ گئی۔ تھرتھری چھوٹ گئی۔ کہاں مفتی جی اور کہاں میں ناچیز۔ ادبی لحاظ سے تو وہ یقیناً روشن، چمکدار سورج ہیں مگر مجھے تو مٹی کے ننھے دیے کی بھی حیثیت حاصل نہیں۔

پھر خیال آیا۔ مجھے بھلا اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کون سا ان کی مفتیانے یا دیگر پہاڑ جیسی عظیم ادبی تخلیقات پر قلم اٹھانے جا رہی ہوں۔ اس کے لیے تو مجھ سے کہیں بہتر قابل لوگ، بڑے بڑے ادبی جنات موجود ہیں۔ یہ کام میرا نہیں۔ میں تو صرف ان مفتی جی کے بارے میں ہی بات کر سکتی ہوں جن کو میں اپنے طور پر جانتی پہچانتی اور چاہتی ہوں۔ جن کا مجھ سے ایک ذاتی تعلق ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔

بچپن میں پاکستان ٹیلی ویژن پر ایک کمرشل دیکھا کرتے تھے۔

ایک خاندان کے افراد مل جل کر بیٹھے ہیں۔ کیمرہ باری باری ان کا بیان ریکارڈ کرتا ہے۔ پہلے ابا بولتے ہیں۔ حبیب بینک میرا بینک۔ پھر امی کہتی ہیں میرا بینک۔ آخر میں بچہ توتلی زبان میں فخریہ انداز میں کہتا ہے "میرا بھی تو ہے۔"

مفتی جی ہمارے خاندان کا ہمیشہ سے وہ والا حبیب بینک رہے ہیں جو سب کا ہے، سانجھا ہے۔ اس کو کھولا تو ہمارے ابا احمد بشیر نے تھا لیکن دھیرے دھیرے اس میں خاندان بھر کے دیگر افراد نے حسب ضرورت اکاؤنٹ کھولنے شروع کر دیئے۔ بچوں تک نے چیک کیش کروانے اور اپنی قیمتی چیزیں لا لا کر اس محفوظ ''لاکر'' میں جمع کروانی شروع کر دیں۔ گھر کا اپنا بینک ہونے کا سبھی نے فائدہ اٹھایا۔

میں نے جب سے آنکھ کھولی مفتی جی کو اپنے گردو پیش، اپنے ماحول، اپنی فیملی زندگی میں ایک فعال رکن کے طور پر موجود پایا ہے۔ آفیشلی تو وہ اس فیملی میں ابا کے دوست ہیں لیکن دراصل میری امی، میری پھوپھی، میری بہنوں اور میرے بھی اتنے ہی پکے دوست ہیں جتنے ابا کے۔

آپ شاید یہ سوچیں کہ ہم نے اپنے ابا کے دوست پر ہل مار لیا ہے۔ خواہ مخواہ چیک بیٹھے ہیں، لیس لسوڑھے ہو گئے ہیں تو جناب ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ مفتی جی نے ساری گڑبڑ خود ہی کی ہے۔ محبتیں بانٹ بانٹ کر اس صفائی سے ہم سب کی زندگی میں اہم جگہ بنا ڈالی ہے کہ ہمیں ہتھیار پھینکنے ہی پڑے۔ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا کہ مفتی جی کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں۔ وہ ہم سب کے مشترکہ محبوب قرار پائے۔

ہماری باجی پروین کی کہی ہوئی یہ بات تو آپ نے سن رکھی ہوگی کہ مفتی جی کی دوستی ہمارے خاندان میں نسل در نسل چلنے والی ذیابیطس کی بیماری کی طرح ہے۔ وہ انہیں اس پاپڑ یا پھر سے بھی مشابہ قرار دیتی ہیں جو اپنا بگل بجا کر شہر بھر کے بچوں کو شہر سے باہر کھینچ لے جانے کی طاقت رکھتا ہے۔ میرے خیال میں مفتی جی ایک اور طاقت ابھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہے ہم آہنگ ہو جانے کی طاقت۔

وہ جس کے پاس بیٹھے ہوں اسی کے رنگ میں خود کو یوں رنگ لیتے ہیں کہ اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ ایک مشترکہ ویولنگتھ پر بات کرتے اور سنتے ہیں۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر کبھی کسی جنریشن گیپ کا احساس نہیں ہوتا اور انسان ان کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہونے کو اپنی خوش بختی سمجھنے لگتا ہے۔ اپنے اپنے کٹورے آگے رکھ کر پر امید ہو جاتا ہے کہ شیرینی اسے بھی ضرور ملے گی۔

جب میں اور میری بہنیں مفتی جی کے گھٹنے سے لگے ان کی مزیدار باتیں سن رہے ہوتے ہیں تو وہ یوں رل مل جاتے ہیں جس طرح وہ بھی ہماری چہیتی بہن ہوں۔ پانچویں اس لیے

نہیں کہہ رہی کیونکہ پانچویں تو پروین باجی ہیں اور جب کبھی ہم چھ بہنیں اکٹھی ہو جائیں جو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے تو ایسی مزیدار رنگین دلچسپ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں کہ روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔ چودہ طبق روشن کر دینے والی باتوں کی آبشار کی پھوار میں بھیگتے گھنٹوں گزر جاتے ہیں اور گزرتے وقت کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

سب کی نظروں میں ہو ساقی یہ ضروری ہے مگر
سب پہ ساقی کی نظر ہو یہ ضروری تو نہیں

مفتی جی ہمارے وہ ساقی ہیں جن کی نظر انفرادی طور پر ہم سب پر موجود رہتی ہے۔ وہ کبھی کسی کو نظر انداز نہیں کرتے۔

مجھے کالج کے زمانے کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ میرا ایک افسانہ بنام "لمحوں کا سفر" اخبار جہاں میں شائع ہوا تھا۔ مفتی جی کو شاید یاد بھی نہ ہو لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مفتی جی نے مجھے اسلام آباد سے اپنے مخصوص نیلی گرافک انداز میں لکھا ہوا خط ارسال کیا۔

نیلم "لمحوں کا سفر" مبارکباد۔

میں خوشی سے اچھل پڑی۔ اس لیے نہیں کہ اتنے عظیم پائے کے ادیب نے میری ادنیٰ تحریر کا نوٹس لیا بلکہ اس لیے کہ ساقی نے مجھ پہ انفرادی توجہ کی لیزر بیم پھینکی تھی۔ میں چہکنے لگی۔ ان کے اس ننھے سے خط نے مجھ پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ میں عرصے تک اتراتی اتراتی پھرتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ان کی طرف سے ننھی منی پیار بھری توجہات کے پھولوں کی بارش ہوتی اور میں نہال ہوتی رہتی۔

اسی طرح خاندان کے دیگر افراد کے بھی ذاتی مسائل کے سلجھانے، کرائسس نمٹانے، ہر ایک کی فکر کرنے، ہر ایک کا بھلا کرنے اور ہر معاملہ ٹھیک ٹھاک کرنے میں مفتی جی پیش پیش رہتے۔ کسی کو نا امید نہیں کرتے تھے۔ ان کی شفقتوں کے خزانوں کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے۔

امی، ابا کی شادی کے وقت حق مہر کے جھگڑے پر بارات کو واپس جانے سے روکنے کے کام سے لے کر اگلی نسلوں کے بچوں بچیوں کے نام تک رکھتے وقت ان سے یوں مشورہ مانگا جاتا جیسے وہ ہمارے کوئی قبائلی سردار ہوں۔

کسی کی منگنی ٹوٹ رہی ہو یا کسی کا دل۔ کسی کے بچے ان کا کہنا مان رہے ہوں یا کسی کا دل لیڈری کرنے کو چاہ رہا ہو، کسی کا جسم فربہی کی طرف مائل ہو رہا ہو یا کسی کے چہرے پر دانے

نکل رہے ہوں، کسی کی کتاب چھپنے والی ہو یا کسی تحریر کو حوصلہ افزائی کی ضرورت ہو۔ ہم سب اپنے اپنے دکھڑے، اپنی اپنی خوشیاں اور محرومیاں، اپنی کاوشیں لے جا کر مفتی صاحب کے قدموں میں ڈال دینے کو بے قرار، ان کے تھڑے پر جا بیٹھتے۔ ان سے شیئر کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ ان سے بات کر کے سکون حاصل کر لیتے کیونکہ وہ آپ کی کوئی بھی کسی قسم کی بات سنتے وقت آپ پر اپنا فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے۔ آپ کو سمجھتے، آپ کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ آپ کی پوشیدہ خوبیوں کی نشاندہی کرتے اور آپ حیران ہو کر پوچھتے۔

''اچھا مجھ میں یہ خاصیت بھی ہے، مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔''

وہ آپ کا آپ کی ذات سے مزید تعارف کرواتے چلے جاتے۔ ہاتھ تھامتے، اعتماد دیتے تھے۔

میرے بارے میں جب انہوں نے بہت عرصے پہلے پیشین گوئی کی تھی کہ ''میں قلم چلا سکتی ہوں'' تو میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا تھا:

''نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بھی لکھ سکوں۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔'' اور پھر ایسا ہی ہوا۔

مفتی جی، میرے اور میری بہن سنبل کے Teen Age سالوں سے دوست بھی رہ چکے ہیں۔ کتنی ہی دوپہریں ہم تینوں دوستوں نے رکشے میں شہر کے سینما کھنگالنے میں گزار دیں۔ ان کا اسلام آباد سے آنا، آ کر ٹھہرنا۔ ایک ایسا مزیدار واقعہ ہوتا کہ ہم مہینوں اس کے منتظر رہتے، ان کی راہ تکتے۔ وہ ہمیں سینما کی عیاشی کرواتے اور اس کے بدلے میں ہم سے ایک مطالبہ کرتے۔

''چلو گڈو یو گون سناؤ۔''

انہیں نور جہاں کے پنجابی گانے بہت پسند تھے۔ سنبل اور میں ''ڈاہڈا بھیڑا عشقے دا روگ'' ٹائپ گانے گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتے اور وہ تعریفی کلمات ادا کرتے نہ تھکتے۔ گھڑی گھڑی چائے بنواتے اور پان کھاتے۔ ہم بھی ان سے پان چھینتے اور مزے اڑاتے۔ اسی زمانے میں ''علی پور کا ایلی'' کا پہلا ایڈیشن چھپنا تھا۔ مفتی جی نے ایک کاپی ہم دونوں بہنوں کو عنایت کرتے وقت اس پہ لکھا تھا ''نیلم اور سنبل کے لیے۔ رنگ اور رس کی دو پیاری گاگریں۔''

وہ ہمارے اتنے سہیلے تھے کہ ہم سے سہیلیوں کی طرح روٹھ بھی جایا کرتے مگر ناراض کبھی نہ ہوتے تھے۔ سنبل اور میں انہیں منانے کی فکر میں گھلے چلے جاتے۔ جب وہ من جاتے تو

پھر وہی فلم بنی، گپیں، رنگ بھری باتیں اور موسیقی کی محفلیں سجنا شروع ہو جاتیں۔

بعد میں مفتی جی لاہور کم آنے لگے۔ ملاقاتیں کم ہو گئیں لیکن ہماری آپس کی انڈرسٹینڈنگ اور Sharing پرانی دوستی کی بنیادوں پر ہمیشہ جاری رہی۔ وہ ہمارے لیے اہم اور محبوب تو اتنے ہی رہے مگر قیمتی زیادہ ہو گئے۔ پھر انہوں نے ایک بری عادت اپنالی۔ جب بات کرو بیچ میں "جانے" کی بات چھیڑ دیتے۔ "پلیٹ فارم تے بیٹھے آں" ٹائپ بور جملے ان کے منہ سے سننا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اپنے ایک افسانے "معروف فارانی" میں بھی انہوں نے جانے کی باتیں ہی کی ہیں۔

میں مفتی جی سے کہنا چاہتی تھی، مفتی جی معاف کریں مگر ماشاءاللہ 90 year young آدمی کے منہ سے ایسی باتیں جچتی نہیں۔ ابھی تو ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ نے بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ پلیز بڈھے بننے کی ایکٹنگ نہ شروع کر دیں کیونکہ آپ ایک ایورگرین Teen Ager ہیں۔ Over Grown بڈھے بابے نہیں۔ جانے کی ضد نہ کریں یونہی پہلو میں بیٹھے رہیں کہ۔

دل ابھی بھرا نہیں۔ We Love you..

باتیں کرتے کرتے مفتی جی اچانک بیچ میں رک کر کہتے۔

"تیرے وچ اک خوبی اے!" سننے والا ششدر رہ جاتا۔ سوچ میں پڑ جاتا کہ بائیں، یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا واقعی مجھ میں کوئی خوبی بھی ہے؟ حیرت کی بات ہے، مجھے کبھی کسی اور نے کیوں نہیں بتایا۔ اتنی اہم بات کا علم مجھے بھلا خود کیوں نہ ہو سکا؟ اتنی بڑی حقیقت میری اپنی آنکھ سے اوجھل کیونکر رہی؟

پھر مفتی جی وہ پوشیدہ خوبی، دھو مانجھ، چمکا کر سامنے رکھ دیتے تو بندہ خوشی سے پھول کر کپا ہو جاتا۔ مفتی جی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ انہوں نے کسی کا سیلف امیج بڑھا کر کے اس کی اپنی نظروں میں اس کی وقعت کتنی بڑھا دی ہے۔ اس کے اندر ایک نئی انرجی کے کتنے سر چشمے جاری کر دیے ہیں۔

آج جب مفتی جی ہمارے درمیان میں سے اٹھ کر اُس پار چلے گئے ہیں تو میں سوچ رہی ہوں، آخر اُن میں ایسی کونسی خوبی تھی جس کی وجہ سے ہم لوگ آج بھی اُن کی جدائی میں اتنے دکھی ہو جاتے ہیں؟ اُن میں ایسی کون سی مختلف بات تھی جس کی وجہ سے اُن کے چلے جانے کو اپنا اتنا بڑا ذاتی نقصان سمجھتے ہیں؟

وہ کس نگری سے آئے ہوئے جادوگر تھے؟ جس سے لوگ اتنے والہانہ انداز میں پیار کرتے تھے۔ آخر ان کے پاس ایسا کون سا مقناطیس تھا جس کی وجہ سے لوگ سالہا سال اُن کے گھٹنوں سے چپکے، جڑے بیٹھے رہتے تھے؟

ان سب باتوں کا ایک ہی جواب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ جواب ہے محبت! انہوں نے تمام عمر لوگوں سے محبت کی۔ محبت بانٹی اور جواباً بھی محبت ہی وصول کی۔ محبتیں لٹانا اور محبتوں کے مزے لوٹنا اُن کی تقدیر ٹھہرا۔

ان کی محبت ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھی۔ ایک ایسا سمندر جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔ جو کائنات کی طرح لامحدود اور وسیع تر ہوتی ہے۔ زندگی میں جو بھی ان کے قریب آیا ان کی محبت کی پھوار میں بھیگ بھیگ گیا اور اس نے ان کی محبت سے خوب خوب جھولیاں بھریں۔

میں خوش نصیب ہوں کیونکہ میں نے مفتی جی کو آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنے ماحول پر چھایا ہوا، اثر انداز پایا۔ ان کے اثرات سب گھر والوں نے ہی قبول کیے جن میں میں اور پروین عاطف دونوں شامل ہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی طور پر ممتاز مفتی میں لتھڑ گئے اور ہم پر ہماری شخصیتوں کے ایسے ایسے رنگ آشکار ہونے لگے جن کا ہمیں خود بھی قطعی طور پر علم نہ تھا جن سے ہم واقف بھی نہ تھے۔

مجھے لکھنے کی طرف مائل کرنے والے بھی ممتاز مفتی ہی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ میرے لکھنے کی (جو چھوٹی موٹی صلاحیت مجھ میں تھی) خاص نوٹس لیا۔

مجھے احساس ہوا کہ مفتی جی مجھے اہمیت دیتے ہیں۔ پھر میں اسی زعم میں رہی کہ مفتی جی سب سے زیادہ مجھی سے پیار کرتے ہیں لیکن یہی تو مفتی جی کی چالاکی تھی۔ وہ محبت کے معاملے میں بڑے ہرجائی تھے۔ اپنے قریب آنے والے کتنے ہی مردوں، عورتوں کو انہوں نے اسی دھوکے میں رکھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار انہی سے کرتے ہیں۔ اسی احساس کو اپنے سینے پر تمغے کی طرح سجائے کتنے ہی لوگ زندگی بھر اپنی قسمت پر نازاں رہے مگر ایک بات ہے۔ مفتی جی ہرجائی ضرور تھے لیکن جھوٹے ہرگز نہیں تھے۔ وہ واقعتاً سب سے خلوصِ دل سے پیار کرتے تھے۔ سچ مچ کے تعلق دار تھے۔

آج کئی لوگ سر جوڑے بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ مفتی جی عورتوں کے زیادہ چہیتے تھے۔ وہ ان کی زیادہ دیوانی تھیں تو میں بحیثیت ایک عورت اس پر اظہارِ رائے کرنے کی کوشش کرنا چاہوں گی۔

دراصل مفتی جی عورتوں کے معاملے میں ایک عجیب وغریب فہم وادراک کے مالک تھے۔ جس کی صرف اور صرف یہ وجہ تھی کہ وہ عورت کو بھیتر سے دیکھتے اور جان لیتے تھے۔ وہ ہر عورت کو یہ احساس دلاتے تھے کہ وہ اہم ہے۔ اس کا اپنا ایک تشخص ہے اور وہ تشخص بھی غیر اہم نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں کہ عورت کو ہمیشہ رواج اور روایت کے پیمانوں سے ہی ناپا تولا اور جانچا جاتا ہے۔ مفتی صاحب ایک ایسے انوکھے شخص تھے جو اس کی ایک علیحدہ راستے پر چلنے کی ضرورت پر اسے لعن طعن کرنے کے بجائے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی اجازت بھی دیتے تھے۔ یہ ایک ایسی اجازت ہے جو اسے اور کوئی نہیں دیتا۔ وہ ایسے شخص تھے جو اس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے خشک آنسو دیکھ لیتے تھے اور اس کے دل کی دنیا کا کرب بھی محسوس کر لیتے تھے۔

وہ ہم معمولی عورتوں کو یہ کہہ کر عزت بخشتے تھے کہ تم عورت ہونے کی وجہ سے افضل تر مخلوق ہو کیونکہ تم تخلیق کار ہو۔ محض اسی وجہ سے تم سے حساسیت بھی زیادہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ توجہ کی طلب عورت کے خمیر میں گندھی ہوتی ہے اور اس کے دل کے آبگینے اتنے نازک ہوتے ہیں کہ انہیں ہر وقت ٹھیس لگ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی انگلی میں کانٹا چبھ جائے تو اسے کوئی کہے۔ "ارے تمہارے سینے میں یہ خنجر کیسے کھب گیا۔ تمہیں تو بہت تکلیف ہو رہی ہوگی۔ ادھر لاؤ میں تمہارے زخم پر پھاہا رکھ دوں۔ تمہارا دکھ کچھ کم کردوں کیونکہ تمہارا دکھ بہت اہم ہے۔ معمولی نہیں ہے۔"

مفتی جی عورتوں کی اس ضرورت کو بھی خوب پہچانتے تھے۔ میں اور مجھ جیسی کتنی ہی زخمی انگلیوں والی عورتیں ان کے پاس جاتیں اور اپنے Bleeding Hearts پر پھاہے رکھوا کر واپس لوٹتیں جس کے بعد ہم میں دوبارہ کھڑے ہونے کا، اپنے پیروں کی طاقت کو آزمانے کا اور جینے کی خواہش کا حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا اور ہم نئے سرے سے زندگی کے گمشدہ سرے پکڑنے کے قابل ہو جاتیں۔

عورتیں اس لیے بھی انہیں اپنے سے زیادہ قریب محسوس کرتی تھیں کیونکہ مفتی جی وقت پڑنے پر اُن کے لیے وہ گھنی چھاؤں والا ہرا بھرا جنگل بن جایا کرتے جہاں پہنچ کر وہ سر میں راکھ ڈال، بال کھول کر جی بھر کے رو لیا کرتی تھیں۔ آج اس ہری بھری چھاؤں والے جنگل کا راستہ بھول بھلیاں بن کر میری پہنچ سے دور، آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا ہے تو میں سوچ رہی ہوں، میں اور مجھ جیسی بہت سی گواچی ہوئی عورتیں، اپنے بال کھول کر اب کس جنگل میں جا کر رویا کریں گی؟

---------O---------

سلمیٰ سلامت

یوں تو میرے سبھی دوست دنیا کے انمول اور نادر نمونوں میں سے ہیں مگر میری پکی سہیلی سلمیٰ اعوان بلاشبہ نوادرات اور عجائبات عالم میں شامل کیے جانے کے قابل ہے۔ سنولائی ہوئی گندمی رنگت، مہندی رنگے بالوں کی چوٹی اور متجسس آنکھوں پہ سیاہ دبیز شیشوں کی عینک چڑھائے سلمیٰ کو آپ نے اکثر تقریبات میں میرے ساتھ بیٹھے گپیں لگاتے، ہنستے بولتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ ایک کہنہ مشق منجھی ہوئی افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار ہے۔ حالانکہ شکل وصورت اور حلیے سے کسی سکول کی پرنسپل لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ واقعی پرنسپل ہے اور بہت مہارت سے اپنے سکول چلا رہی ہے۔

سلمیٰ ہر لحاظ سے اعوان ہے۔ شادی کے بعد اسے دوسری خواتین کی طرح اپنے پرانے نام کی قربانی نہیں دینا پڑی کیونکہ صاحب بھی اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے، البذا سب اعوان کے اعوان رہے۔ کسی کا کچھ نہ گیا اور سلمیٰ اعوان، اعوانوں کی شان بن کر اپنی ہی رہی پرائی نہ ہوئی اور اعوان ٹاؤن میں ہی رہائش بھی اختیار کر لی۔

سلمیٰ کی طبیعت درویشانہ، مزاج منکسرانہ ہے۔ انداز ایسا جیسے ابھی ابھی چاٹی کی لسی کو منہ لگا کر پی کر آئی ہو یا سرسوں کے سرگ کے ہرے ہرے ڈنٹھل توڑنے جا رہی ہو۔ پھر اس کی تحریریں پڑھیں تو سادہ سی پینڈو دانہ سلمیٰ ایک مکمل ادیب کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کے چونکا دینے والے فقرے اور مشاہدات قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور وہ اس کی قوتِ تحریر کا معترف ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنے ملبوس سے لے کر مزاج، طور طریقوں اور ان میں حد درجہ سادہ اور بے نیاز سلمیٰ کو آپ نے اکثر براؤن یا اس کے ملتے جلتے مردہ مٹی رنگوں میں دیکھا ہوگا۔ سلمیٰ کا

کہنا ہے کہ اس کی والدہ ماجدہ نے اسے بچپن سے یہ باور کرادیا تھا کہ ''بیٹی تو چونکہ سانولی رنگت کی ہے، لہٰذا تجھے شوخ اور خوبصورت رنگوں والے کپڑے نہیں پہننا چاہیے۔'' سلمٰی نے اچھی بچی کی طرح اپنی امی کی بات مان لی اور پھر جب پیا کے گھر سدھاری تو انہوں نے بھی اسی قسم کا ہدایت نامہ جاری کر دیا۔ مجھے جب سے سلمٰی ملی ہے اور اس بات کو تقریباً پندرہ بیس برس ہونے کو آئے ہیں، میں نے اس کے اس خیال کو بدلنے اور اچھے رنگ نہ پہننے کی قسم کو توڑنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ میں اور سیما بیروز نے چونکہ جی میں ٹھان لی تھی کہ سلمٰی کو اس براؤن رنگ سے نجات دلا کر رہیں گے۔ اس لیے ہم نے ہر طرح سے اسے ورغلانے، بہلانے پھسلانے کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کی برین واشنگ کرتے رہے۔ اسے بتایا کہ اب چونکہ اس کی امی جان اگلے جہان رخصت ہو چکی ہیں تو اس کو اتنی فرمانبردار بیٹی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اکثر اسے کہتے ہیں۔ ''سلمٰی ہماری سنو، خدا کے لیے مردہ رنگوں کے کپڑے پہننا چھوڑ دو اور پنک، سبز، نیلے کسی بھی رنگ کے کپڑے پہن کر ہمیں دکھاؤ تو سہی۔ حوصلہ کرو، مت ڈرو، تم افریقہ کی حبشی خواتین کو دیکھو، کیسے ڈٹ کر نارنجی، تیز گلابی، لال قسم کے رنگ پہنتی ہیں اور دھڑلے سے گھومتی ہیں۔''

ہم نے سلمٰی کو کئی بار سمجھایا ہے مگر وہ کوئی خاص بہکی نہیں۔ امی کی بات کا اثر ہے اور تابعداری کہ سلمٰی بہادر خاتون ہونے کے باوجود رنگ پہننے سے اب بھی کتراتی ہے۔ اسے لال گلابی جوڑے میں دیکھنے کی حسرت میرے دل میں اکثر چٹکیاں لیتی ہے۔ سوچتی ہوں پتہ نہیں اس کے شوہر نے بھی اسے کبھی لال جوڑے میں دیکھا ہوگا یا نہیں۔ خیال اغلب ہے کہ شادی کی رات اس نے اپنے دولہے جی کے حجلۂ عروسی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنا لال جوڑا اتار کر کوئی سادہ سا نائٹ سوٹ پہن لیا ہوگا۔ چہرے پر میک اپ پونچھ کر وہ کوئی ادھ کھلا سفرنامہ بیڈ پر ٹکائے بڑے سکون سے خراٹے لے رہی ہوگی۔

سلمٰی اپنی تحریر میں جتنی پختہ اور مضبوط ہے، گفتگو میں اتنی ہی بے ربط، اکھڑی اکھڑی اور ڈھیلی ہے۔ بات شروع کرتی ہے تو اسے کہیں سے کہیں جا پہنچاتی ہے۔ جملوں کے درمیان اچانک کھو جانا، کسی اور موضوع پر سرک جانا، اچانک بات ختم کر دینا، بار بار یعنی، یعنی کہنا سن کر مخاطب سوچ میں پڑ جاتا کہ آخر اس کا مدعا کیا ہے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ سلمٰی نے آپ کو کوئی دلچسپ، مزیدار سسپنس سے بھرپور واقعہ یا روداد سنانی شروع کی ہے۔ آپ ہمہ تن گوش سننے میں مصروف ہیں۔ آپ کی پوری توجہ سلمٰی کے

بیان پہ مرکوز ہے۔ کلائمکس آنے کو ہے، کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے مگر اچانک سلمیٰ کہہ دیتی ہے ''چل چھڈ پرے، دفع کر مٹی پا۔'' آپ حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ ہیں یہ کیا ہوا؟ آپ کا حال اس پیاسے کا سا ہو جاتا ہے جس کے آگے سے اس کے لبوں پہ پہنچنے والا گلاس یکدم کسی نے ہٹا دیا ہو۔ سلمیٰ بات کو اختتام تک پہنچائے بغیر ہی ختم کر دیتی ہے تو آپ کا جی چاہتا ہے، اپنا سر پیٹ لیں یا کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جائیں۔ جب تک آپ اپنا جذبۂ دیوانگی کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں وہ کسی نئے موضوع پہ گفتگو کا آغاز کر چکی ہوتی ہے اور آپ کو چاروناچار پرانا قصہ بھولنا ہی پڑتا ہے۔

سلمیٰ کو عام عورتوں کے معمولات، مصروفیات اور مشغولیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ روایتی گھریلو بیویوں کی طرح نہ تو سگھڑ ہے نہ سلیقہ شعار۔ گھر داری کے جھنجھٹ سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے گھر میں صبح سویرے صفائی ہو نہ ہو، کھانا پکے نہ پکے، کپڑے دھلیں نہ دھلیں۔ ڈرائنگ روم کے راستے میں رکھی بوریاں پڑی کی پڑی رہیں۔ اسے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ وہ اپنے ذہن کو اس قسم کی خرافات کے بارے میں سوچ سوچ کر ضائع نہیں کرتی۔ وہ جانتی ہے کہ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں گھریلو کام کے سوا تو بھلا ان کے لیے کیا کڑھنا اور جلنا وہ اپنے ذہن کی اعلیٰ وارفع صلاحیتوں کو جھاڑو نا کی جیسے گھمبیر مسائل حل کرنے میں ضائع نہیں کرتی۔ گھریلو کاموں کو آبسیشن بنا لینا اور یوں ان کی تکمیل میں ستی ہو جانا اس کے نصاب میں شامل نہیں تو کیا ہوا۔ یہ تو ہم سبھی خواتین جانتی ہیں کہ گھریلو کام کا سلسلہ بے ثمر ہوتا ہے۔ یہ وہ عظیم آرٹ ورک ہے جو آپ ہر صبح بڑا دل لگا کر کرتی ہیں مگر شام ہونے تک ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور آرٹسٹ کو کبھی ستائش ملتی ہے نہ کوئی صلہ۔ گھریلو کام کا گورکھ دھندا عورتوں کو اس طرح الجھائے اور پھنسائے رکھتا ہے کہ اس کی طرف لگ جاؤ تو یہ آپ کا سو فیصد وقت لے لیتا ہے۔ سلمیٰ نے گھر داری کو جان کا روگ نہیں بنایا اور اپنی مرضی سے کام کر کے سکھی رہی۔ شاید اس لیے کہ اس کی ادبی تخلیقات کے لیے کام کرنے کی خواہش گھریلو کام سے زیادہ تھی۔

وہ رات کو جلدی سو کر صبح سویرے جاگ جاتی ہے۔ ایک نیک مسلمان بی بی کی طرح نماز فجر پڑھنے کے بعد آرام سے ناشتہ کرتی ہے۔ جی چاہے تو سکول چلی جاتی ہے، اخبار پڑھتی ہے یا پھر کمرہ میں بیٹھ کر لکھنے کا کام کرنے لگتی ہے۔ اس قابل رشک طرز زندگی کی ہی وجہ سے وہ بے فکری سے اپنا کام کرتی رہتی ہے اور خوبصورت کتابیں لکھتی ہے تو قابلِ رشک ادب وجود میں

آ تا ہے۔اس کا جنون اس کا اپنا کام اور ذاتی دلچسپیاں ہیں۔ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے سلمیٰ کو چند ہفتوں کے وقفے سے فون کیا۔ پوچھنے لگی کہ میں کہاں غائب تھی۔

''تمہارے بیٹے کی شادی جو ہے پرسوں۔ میں نے سوچا مصروف ہوگی۔بس اسی لیے تمہیں فون نہیں کیا۔''میں نے جواب دیا۔

''بھئی شادی ہے تو کیا ہوا!''وہ بولی۔

''میرا مطلب ہے تم بازاروں میں گوٹا کناری خرید رہی ہوگی۔شاپنگ نے تمہیں پاگل بنایا ہوا ہوگا۔''میں نے جواب دیا''اسی لیے میں نے تمہیں فون نہیں کیا۔''

''بھئی جن کی شادی ہے وہ مصروف ہیں۔ میں کیوں بازاروں میں خجل ہوتی پھروں۔ میں نے تو دلہن کو رقم دے دی تھی کہ اس سے جو تا لے لو، کپڑا، زیور لے لو یا اکاؤنٹ میں جمع کرالو۔ مجھے کوئی سروکار نہیں۔ جو جی چاہے کرو۔''

''اچھا یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔''مجھے اس کا رویہ بہت اچھا لگا۔''کیا انقلابی سوچ ہے اس شیر دی بچی کی۔''میں نے دل ہی دل میں متاثر ہو کر سوچا''تو اب کیا کر رہی ہو۔''میں نے پوچھا۔

''ایک افسانہ مکمل کر رہی ہوں۔''اس نے تحمل سے جواب دیا۔''صبح بارات ہے تو ٹائم نہیں ملے گا۔ میں نے سوچا ابھی اسے پورا کرلوں۔ میں خود بھی اسی قسم کے جائز اور مناسب فلسفوں پہ یقین رکھتی ہوں۔ شادی کسی اور کی اور وقت ہمارا ضائع ہو، یہ ٹھیک بات نہیں۔''لہٰذا سلمیٰ کی بات سن کر جی چاہا اسے اکیس توپوں کی سلامی دوں۔ اس کا منہ چوم لوں، لال جوڑا پہنا کر دلہن کے ساتھ سٹیج پر بٹھا دوں مگر اس وقت اسے صرف دل ہی دل میں سراہ کر رہ گئی اور ان ارادوں کو کسی اور وقت پہ اٹھا رکھا۔

سلمیٰ بستی بستی، قریہ قریہ، نگری نگری گھومنے کی متوالی ہے اور اس شوق کو وہ جب موقع ملے پورا ضرور کرتی ہے۔ وہ تو پڑھنے کے لیے بھی کہیں نزدیک نہیں بلکہ بنگلہ دیش چلی گئی تھی۔ حالانکہ ہماری طرح شریفانہ طور پر لاہور میں بھی تعلیم حاصل کی جا سکتی تھی مگر تو بہ کریں جی۔ اسے تو کچھ نہ کچھ انوکھا کرنا اور کر کے دکھانا ہی ہوتا ہے، لہٰذا اس لاہوری سیاح نے بنگلہ دیش پہنچ کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی موجودگی میں ہی پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگ چھڑ گئی جس کی وجہ سے اسے بہت سے ناخوشگوار واقعات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس تجربے سے

بھی وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹی بلکہ بہت کچھ جان کر محسوس کر کے اس نے ''تنہا'' کے نام سے ایک خوبصورت ناول لکھا اور نقادوں سے داد پائی۔

سفر کرنا سلمیٰ کی زندگی کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنی اہم وہ پانی کی بوتل ہے جسے وہ گود میں لاڈلے بچے کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتی ہے۔ اسے خوف ہے کہ اسے کہیں ڈی ہائیڈریشن یعنی کمیٔ آب کی شکایت نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ ہر وقت پانی پیتی اور اس کے نتیجے میں سوئے غسل خانہ جاتی نظر آتی رہتی ہے۔

اس کے سفر ہی اس کی زندگی کا ارمان اور درمان ہیں۔ وہ ایک طوفانی بگولے کی طرح ہر وقت گردش میں رہتی ہے اور چھلاوے کی طرح ادھر سے اُدھر نظر آتی اور غائب ہوتی رہتی ہے۔ آپ اسے پکڑ نہیں سکتے اور نہ ہی پکڑ کر بٹھا سکتے ہیں۔ اپنے سکولوں کی پرنسپل ہونے کے ناطے اسے ٹک کر بیٹھنا تو پڑتا ہی ہے۔ انتظامی معاملات بھی سنبھالنے پڑتے ہیں مگر جب اس کے سر میں سفر کا سودا سماتا ہے تو پھر وہ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یوں جیسے اس کے سر میں ایک فلمی قسم کا میوزک بجتا ہے، پھر وہ آنا فاناً ماں بیوی سکول پرنسپل والی کینچلی اتار پھینکتی ہے۔ اپنی گٹھڑی لمبی سی ڈانگ پر لٹکا کر نئی اور انجانی راہوں پر چل نکلتی ہے۔ ایسے میں اسے کچھ یاد نہیں ہوتا۔ بس وہ ہوتی ہے، کھلا آسمان اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی آرزو۔

وہ پے در پے سفر کرتی ہے تو مجھ جیسے کئی اعتبار سے مجبور اور محدود وسائل والے دوست دل ہی دل میں جل بھن کر کباب ہو جاتے ہیں۔ جی تو اپنا بھی چاہتا ہے کہ شترِ بے مہار کی طرح صحراؤں کی خاک چھانتے پھریں۔ آزاد پنچھی کی طرح دیس دیس اڈاریاں ماریں مگر ہمت، مواقع اور اخراجات کی عدم فراوانی آڑے آجاتی ہے اور ہم اپنی سلمیٰ کو بس دلی دعائیں دے کر رخصت کرنے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔

پہلے پہل اس نے اپنے سوہنے دیس پاکستان کے دور دراز ناقابل رسائی علاقوں کا سفر کیا اور پھر وہ انٹرنیشنل ہوگئی۔ اس کے پاؤں تلے جستجو کا سکیٹنگ بورڈ بچھا ہے جس پر سوار ہو کر وہ زوں زوں کرتی، دنیا کے حیرت کدے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھمیٹے مارتی اور پھر آکر دلچسپ سفرنامے قلمبند کرتی ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے سلمیٰ میں کسی اور زمانے اور تہذیب کی ایک دوسری روح بھی رہتی ہے جو اندر ہی اندر اس کی طنابیں کھینچتی رہتی ہے۔ وہ پیاسی روح ہی اسے بن میں آوارہ پھرنے والی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے پر مجبور کرتی ہے اور پھر آرزو کی تکمیل

میں سلمیٰ بار بار گھر سے نکلتی ہے اور پھر گھوم گھام کر اپنے نقطۂ آغاز پہ واپس آ جاتی ہے۔ آوا گون کی ممکنات کو سامنے رکھیں تو چشم تصور سے ہم سلمیٰ کو بڑے دلچسپ روپ اور بہروپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ ذرا چشم تصور سے کام لے کر دیکھیے اور سوچیے کہ سلمیٰ اعوان کسی اجنبی زمانے اور تہذیب کی پروردہ ہے۔ ہے۔ وہ چست بر جس میں ملبوس اور پاؤں میں لانبے چرمی بوٹ چڑھائے ہوئے ہے۔ کھلے لمبے ہوا میں لہراتے ہوئے سیاہ بالوں کے گچھوں کے اوپر سائیڈ میں ایک سکارف بندھا ہے۔ کانوں میں پہنے بڑے بڑے بالوں کو جھلاتی ہوئی وہ بحر ظلمات میں اپنے گھوڑے دوڑائے چلی جا رہی ہے۔ پھر دیکھیے تو سلمیٰ کھلے سمندروں میں تیرتے کسی بحری جہاز کے یک چشمی کپتان کا روپ دھارے بحری قزاقوں سے تلوار بازی کرتی بھی نظر آتی ہے۔ اگلے منظر میں آپ اسے مارکو پولو کے ہمرکاب چین کی سرحدیں پار کرتے دیکھتے ہیں جس کے بعد وہ قبلائی خان کے دسترخوان پہ بیٹھی ہنس ہنس کر تلے ہوئے کیڑے مکوڑے تناول کر رہی ہے۔ سلمیٰ کو کہیں بھی کسی بھی منظر میں، دنیا کے کسی بھی حصے میں تصور کیا جا سکتا ہے۔

وہ سیرگاہِ عالم کے مناظر سے مشاہدات و تجربات کی رنگ برنگی ٹھیکریاں اکٹھی کرنے کو اکثر سفر پہ نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ جب ہم دوستوں کو اس کے واپس گھر لوٹنے کی خبر ملتی ہے تو ہم بڑے اشتیاق سے اسے فون کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ پوچھیں گے، سری لنکا کے پہاڑوں میں بنے ہوئے حضرت آدم کے پاؤں میں اپنا پاؤں ملانا کیسا لگا تو پتہ چلتا ہے کہ چند گھنٹوں کے آرام کے بعد سلمیٰ جی پھر اڑنچھو ہو چکی ہیں۔ وہ ابھی تک جوان اور تر و تازہ جسم والے فرعون کے پہلو میں لیٹنے کی آرزو پوری کرنے کو اس وقت مصر کی فلائٹ پہ روانہ ہو چکی ہیں۔ اس کے اور فرعون کے وصال کی خبر سننے کو بے چین ہو کر اس کے ہاں فون کریں تو اطلاع ملتی ہے کہ ہماری ابن بطوطی تونیہ کے درویشوں کے ساتھ ہم رقص ہونے کے لیے بڑا سا سفید فراک سلوانے درزی کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ ہم رشک اور حسد سے نڈھال ہو جاتے ہیں اور سمجھا کر کہتے ہیں کہ نیک بخت بیبیوں کا سا چلن اختیار کر، کبھی چادر اوڑھ کر چار دیواری میں بھی بیٹھنا سیکھ تو وہ کہتی ہے "میں بشریٰ رحمٰن نہیں، جب تک گھٹنے اور ٹانگیں سلامت ہیں، میں پھرنے سے باز نہ آؤں گی، تم دیکھتے رہیو۔"

اس سے اگلے ہی ہفتے وہ چھلانگ مار کے روس جا پہنچتی ہے اور دوستو وسکی کا گھر بار سینٹ پیٹرز برگ کے گلی کوچوں میں جھا نک آتی ہے۔ ہماری نصیحت کا ہرگز کوئی اثر نہیں لیتی۔ معروف سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ صاحب کی طرح سلمیٰ نے بھی بہت سے سفر کیے ہیں لیکن

افسوس ان جیسی قسمت اس نے نہیں پائی۔ تارڑ صاحب کو ان کے بیشتر دوروں میں کوئی نہ کوئی ایسی حسینہ ضرور ملی جو ان کی محبت میں گرفتار ہو گئی مگر ہماری سلمیٰ کو کبھی کوئی بلما نہ ملا۔ زندگی کی اجنبی راہوں پر کبھی کوئی شکیل، جمیل، اسماعیل، صاحب دل اس سے آ کر نہ ٹکرایا اور نہ ہی اس سے جدا ہوتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہے۔

افسوس کہ اس معاملے میں ہماری سہیلی نے ہماری ہی جیسی قسمت پائی ہے۔ ہم نے بھی بہت سفر کیے ہیں لیکن قسم لے لیں جو کبھی کوئی حسین، رنگین، سنگین اور دلچسپ حادثہ پیش آیا ہو جس نے ہمیں اپنی واپسی کی ٹکٹ کو کوڑے کے ڈبے میں پھینکنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہو۔ اپنے اپنے نصیب ہیں اللہ جسے چاہے نوازے جسے چاہے ٹرخائے۔ رب جلیل کی اگر یہی مرضی ہے کہ ہمیں کوئی ایسا حسین تجربہ نہ دے جن کی وجہ سے ہم خواہ مخواہ دھانی چنریا اوڑھ کر باغوں میں اچھلتی پھریں تو پھر اس کی مرضی پہ صابر و شاکر ہونے کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔

ایک بار میں سیما اور سلمیٰ پیروز مرغزار سوات کی سیر کو گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوات ایک امن پسند جنت نظیر شہر تھا۔ اس پر آج کے نام نہاد خونی جہاد کے چھینٹے نہیں پڑے تھے۔ مجھے سرزمین سوات میں مدفن بدھا کی بچی کچی، ٹوٹی پھوٹی خانقاہوں کی باقیات دیکھنے کا شوق تھا۔ اسی لیے سیما اور سلمیٰ میرے ہمراہ چل پڑیں۔ سیما چونکہ پہلے بھی آ چکی تھی اور اس علاقے سے واقف تھی، لہٰذا طے یہی پایا کہ وہ ہماری لیڈر ہوگی اور ہم اس ہی کے مشورے سے سیر و سیاحت کریں گے۔ ہمارا ریسٹ ہاؤس بالکل دریا کنارے تھا، اس لیے ہم تینوں کو نظارہ ہائے دلنشیں سے لطف اندوز ہونے کا خوب موقع مل رہا تھا۔ ایک روز ہم صبح سو کر اٹھے تو سلمیٰ کو بستر سے غائب پایا۔ سوچا کہیں گھومنے چلی گئی ہو مگر کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد جب وہ واپس نہ آئی تو کچھ تشویش ہونا شروع ہوگئی۔ ادھر اُدھر ڈھونڈا، آوازیں دیں، نوکروں سے پوچھ گچھ کی، دریا میں ڈرتے ڈرتے جھانکا اور پھر بالآخر پریشان ہو کر بیٹھ گئے اور سوچا کہ اب کیا کریں۔

کئی گھنٹوں بعد سلمیٰ کہیں سے نمودار ہوگئی۔ ہم نے اس سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ ہم پر بگڑنے لگی ''تم لوگ ہوتے کون ہو مجھے ڈھونڈنے والے۔ میں کوئی پابندی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں جہاں چاہوں جاؤں گی اور جب چاہوں گی واپس آؤں گی۔'' ہم دونوں جھاڑ کھا کر خاموش ہو گئیں اور پھر بڑی دیر بعد جب وہ ٹھنڈی ہوگئی تو پوچھا ''آخر تم گئی کہاں تھیں؟'' جواب ملا ''دریا کے بیچوں بیچ جو ایک بدھا زمانے کا پتھر تھا، اس پر نماز پڑھنے گئی تھی۔'' اس نے پرسکون لہجے

میں جواب دیا اور نارمل طریقے سے اگلے پروگرام کے تحت ہمارے گھومنے پھرنے کو تیار ہوگئی۔ اک عجب آزاد روح کو کسی بھی قسم کی پابندی برداشت نہیں ہوتی۔

آپ سوچیں گے آخر سلمیٰ اتنے سارے سفر کیسے کر لیتی ہے کیونکہ سفر کرنا تو بہت خرچیلا شوق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سلمیٰ کے محنت اور لگن سے لگائے ہوئے پودے اب پھل دینے لگے ہیں اور سلمیٰ آسودہ ہوگئی ہے۔ ویسے بھی وہ طبعاً کوئی فضول خرچ عورت نہیں ہے۔ صبر شکر اور درویشی سے زندگی گزارنے کا ہنر جانتی ہے۔ ایک وقت تھا جب زندگی اس کے لیے اتنی آسان نہ تھی مگر وہ پھر بھی دلی اور ذہنی طور پر مطمئن اور آسودہ تھی۔ پھر جب لکشمی دیوی نے اس کے چرنوں میں سنہرے پھول سجانے شروع کیے تو اسے یقین نہ آیا کہ اب آسان دن آگئے ہیں اور وہ اپنی خواہشات کے لیے بے فکری سے خرچ کر سکتی ہے۔ ایک روز میں نے ایسے ہی بات یاد دلا کر کہا ''سلمیٰ تو اپنا پیسہ اپنے اوپر خرچ کر، اسے انجوائے کر، بچت نہ کر، کھا پی، موج اڑا، سفر کر ورنہ تیرے جانے کے بعد تیری بہویں تیرے پیسوں کا سونا پہن کر اتراتی پھریں گی۔ تیرے گرینڈ چلڈرن مہنگے مہنگے موبائل فون، کاریں خرید کر یورپ اور امریکہ کے دورے کریں گے اور تو کچھ نہ کر سکے گی۔'' یہ سن کر سلمیٰ نے لمحے بھر کا توقف کیا۔ پھر سمجھداری سے میری تائید میں سر ہلا کر کہنے لگی۔

''تو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' پھر ہوا یوں کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سکھی سہیلی نے برانڈ نیو لش کرتی ہونڈا گاڑی خریدی اور پاؤں تلے پہیے باندھ لیے۔ اب وہ آزاد پنچھی کی طرح کبھی کھلی فضا میں اڑتی پھرتی ہے۔ کبھی اپنے سلیمانی غالیچے پہ بیٹھ کر ملکوں ملکوں کی سیر کرتی ہے۔ اپنے دل کی آرزوئیں پوری کرتی ہے اور بڑا اچھا کرتی ہے۔ واپس آ کر ایسے خوبصورت سفرنامے تحریر کرتی ہے کہ پڑھنے والے کو لگتا ہے جیسے وہ بھی ان تمام موقعوں پہ اس کے ساتھ ہی موجود رہا ہے۔

اتنی قابل، لائق، فائق، پراعتماد ہونے کے باوجود کئی معاملوں میں وہ بڑی کوڑھ مغز ہے۔ مجھ سے اکثر ڈانٹ کھاتی ہے اور برا منائے بغیر ڈھٹائی سے ہنستی رہتی ہے۔ اسے پوری دنیا میں میرے نمبر کے سوا کبھی کسی کا فون نمبر زبانی یاد نہیں ہوتا اور جس ڈائری میں مطلوبہ نمبر لکھا ہوتا ہے وہ ہمیشہ کھوئی ہوئی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ اس شمار میں اس کا اپنا ذاتی نمبر بھی شامل ہوتا ہے۔ میرے گھنٹوں کے لیکچرز کے باوجود نہ اسے کبھی انٹرنیٹ استعمال کرنا آیا نہ ایس ایم ایس کرنا۔ ٹی وی کے اکثر چینلز اور پروگراموں سے بھی وہ قطعی طور پر ناواقف ہوتی ہے۔ میں اکثر اسے فون

کر کے کہتی ہوں۔ سلمیٰ جلدی سے ہسٹری چینل لگا وہاں سری لنکا پہ ڈاکومنٹری چل رہی ہے تو وہ حیرت سے کہتی ہے ''ہسٹری چینل؟ وہ کیا بلا ہے؟ کیبل ٹی وی؟ وہ کیا چیز ہوتی ہے۔؟'' پھر کہتی ہوں ''سلمیٰ میں نے دس بار فون کیے ہیں، کیا گھر کا نمبر خراب ہے، تم لوگ فون کیوں نہیں اٹھاتے؟'' جواب ملتا ہے ''گھر کا فون؟ پتہ نہیں خراب ہے یا ٹھیک؟ میرا تو خیال ہے ہمارے گھر فون ہے ہی نہیں۔ اچھا گھر جا کر میاں سے پوچھوں گی؟ لگا بھی ہوا ہے کہ کٹوا دیا ہے، مجھے تو کچھ خبر نہیں۔''

ایسے میں انسان کا یہی جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لے یا سلمیٰ کو دو تھپڑ لگائے مگر وہ اپنی انہی فنی خرابیوں کو کشادہ دلی سے تسلیم کرنے کے بعد ہنسنے لگ جاتی ہے تو آگے سے کوئی کیا کر سکتا ہے؟ اپنے انداز کی اوریجنل پیس سلمیٰ جیسا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ کہہ رہی ہے کہ چونکہ میرے بالوں کو ڈائی سے الرجی ہوتی ہے۔ میں گنجی ہونے جا رہی ہوں۔ سب دوستوں نے یہ سن کر بہت ہاہا کار مچائی اور اسے اس دہشت گردی سے روکنے کی بھرپور کوشش کی ہے مگر تا بہ کے؟ جب سلمیٰ کے ذہن میں ایسی کسی شدت پسند کارروائی کی دھن سمائے گی تو وہ کسی کی نہ سنے گی اور اپنے دل کی مراد پوری کر کے رہے گی۔ مجھے چونکہ اپنی سہیلی ہر حال اور ہر روپ میں قبول ہے، لہٰذا میں اسے تسلی دے کر کہنا چاہتی ہوں کہ ''قدم بڑھاؤ سلمیٰ اعوان، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' وہ چاہے مہندی رنگی زلفِ دراز کی مالک ہو یا کسی گنج گراں مایہ کی میرے لیے تو بس یہی کافی ہے کہ سلمیٰ کا دل پارے کے سونے جیسا خالص ہے۔ اس میں کوئی کھوٹ نہیں اور میرا اور اس کا رشتہ دل کا ہے دماغ کا نہیں ہے۔ سلمیٰ لوبھ دنیا سے پاک ہے اور یہ خصوصیت ہر کسی میں نہیں ہوتی۔

میں اور وہ ایک دوسرے سے حد درجہ مختلف ہونے کے باوجود بہت قریبی دوست ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں عورتیں بالکل بھی بیگم ٹائپ نہیں ہیں۔ ہم روکھی سوکھی کھا کر ٹھنڈا پانی پی سکتی ہیں۔ کار میں سوار ہونے کے علاوہ بس، رکشہ میں بھی سفر کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ ہمیں سونے، کپڑے، ہیرے وغیرہ کے موضوعات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ چونکہ ہمیں کسی نے بطور خواتین کوئی خاص لاڈ پیار، بے جا احساسِ تحفظ نہیں دیا، اس لیے عام عورتوں کی نسبت ہم زیادہ بے خوف ہو کر بے دھڑک کہیں آ جا سکتی ہیں۔ دونوں ہی کی طبیعت میں کھوج اور جستجو کا کیڑا موجود ہے جو ہمیں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

ہم دونوں دن میں تقریباً دو تین بار ایک دوسرے سے بات ضرور کرتی ہیں۔ شکر ہے

کہ سلمٰی کو اب موبائل فون کرنا آ گیا ہے۔ رات کو سلمٰی سے رابطہ کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کیونکہ وہ شرفاء کی طرح رات پونے نو بجے بستر میں جا کر لیٹ جاتی ہیں جبکہ میں الوؤں کی طرح رات گئے تک جاگتی اور نیند کی دیوی کے منت ترلے کرتی رہتی ہوں۔ فون پر بھی ہماری گفتگو عام خواتین کی طرح زیور، کپڑے، میک اپ وغیرہ کے بارے میں کبھی نہیں ہوتی بلکہ ہمارے زیرِ بحث زیادہ تر علمی، ادبی، تاریخ اور حالاتِ حاضرہ کی ستم کاریوں جیسے خشک موضوعات ہی ہوتے ہیں جن پر ہم مغز کھپائی کرنے کے بعد ٹھنڈی سانسیں بھر کر فون بند کر دیتے ہیں۔

سلمٰی اور میں مختلف ہونے کے باوجود گوڑھی سہیلیاں ہیں۔ وہ سیدھی سادی باعقیدہ مسلمان ہے اور میں احمد بشیر جیسے باغی انقلابی کی بیٹی ہونے کے ناطے اکثر موضوعات پر اتفاق کرتے ہوئے بغاوت کا پھریرا لہرانے لگتی ہوں۔ میرا ذہن مذہب، تاریخ، تہذیب اور عقیدوں، روایات سے متعلق خدشات اور سوالات سے انار میں بند دانوں کی طرح بھرا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ہم دونوں کا اتفاق رائے نہیں ہوتا تو ہم الجھ بھی جاتی ہیں مگر پھر آپ ہی آپ بنا کسی ضد اور انا کے سلجھ جاتی ہیں۔

سلمٰی کے لاشعور میں کہیں دور پاتال میں یہ احساس گڑا ہوا ہے کہ وہ خوبصورت نہیں ہے۔ اکثر اس کی زبان سے ایسے جملے سننے کو ملتے ہیں "اگر میں خوبصورت ہوتی۔" "خوبصورت ہونا نہ جانے کیسا ہوتا ہوگا؟" میں حیران ہوتی ہوں کہ سلمٰی کو ایسا خیال کیوں آتا ہے؟ جس کی شخصیت اتنی پُراعتماد اور دل اتنا خالص ہو، تحریر دلنشین اور ذہن حسین ہو، وہ خوبصورت نہیں تو کیا ہوتا ہے۔ سلمٰی ہر لحاظ سے سوہنی ہے۔ اس کی دوستی خوبصورت اور ساتھ مزیدار ہے۔ کبھی کبھی وہ کسی بات پر ضد پکڑ لیتی ہے اور غصے سے جامنی ہو جاتی ہے تو بھی اس کا جلوہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ سلمٰی تو سلامت رہ اور سدا آوارہ گردی کرتی رہ تاکہ ہم بھی سر اٹھا کر فخریہ انداز میں کہہ سکیں کہ ہماری سہیلی بڑی آوارہ ہے۔ یہ اعزاز ہم سے نہ چھیننا۔ اللہ تیری آوارگی میں برکتیں ڈالے اور تجھے ہمیشہ یونہی رکھے کہ تو جیسی ہے، جہاں ہے، ہمیں پسند ہے۔

---------O---------

ٹپر واسنی

افسانہ نگار، سفر نامہ نگار، پروین عاطف کو تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہی جو کبھی محفلوں
کبھی اپنی تحریروں اور کبھی ٹی وی پہ اپنے افکار کا جادو جگاتی ہیں۔ بڑے بڑے دانشوروں کو شرماتی
ہیں اور پھر خاموشی سے کہیں دبک جاتی ہیں۔ مہینوں کے لیے کھو جاتی ہیں اور آپ سوچتے رہ جاتے
ہیں۔ یہ دبلی، پتلی، ذہین، باغیانہ، ماہرانہ سوچ رکھنے والی پروین کہاں سے آئی تھی اور اب کہاں
چلی گئی ہے؟

پروین ہمیشہ یوں لُک چھپ نہیں کھیلا کرتی تھیں۔ ایک زمانے میں وہ اسلام آباد او
لاہور کی ادبی محفل میں گھن گرج کے ساتھ بولتیں، بڑے بڑے اہم ایشوز پر ہاتھ ڈالتیں، ملکی او
غیر ملکی سیاست اور بین الاقوامی صورتحال پر کھل کر اظہار کرتی تھیں اور اپنے بھائی احمد بشیر کا عکس نظ
آتی تھیں مگر پھر انہیں حالات نے مین سٹریم سے باہر لے جا پٹخا۔

ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے لاہور چھوڑ کر فیصل آباد میں رہائش اختیار کرنا پڑی اور یو
وہ ہم سے کچھ کچھ دور ہوتی چلی گئیں۔ ویسے بھی جب سے ان کے بھائی نے اس دنیا سے
رخصت لی ہے، ان کے اندر سدا جلتی رہنے والی جیون جوت دھیرے دھیرے دھیمی پڑنے لگ
ہے۔ کبھی کبھار کسی جن کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کی جان کسی طوطے میں ہے مگر جب طوطے کی
گردن ایک طرف ڈھلک جاتی ہے تو جن کے لیے زندگی کو قائم و دائم رکھنا بہت مشکل ہو جا
ہے۔ بھائی کے جانے کے بعد پروین بھی زندگی سے روٹھ سی گئی ہیں کیونکہ بھائی ان کا ذہن
سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ فادر فگر بھی تھا۔ کچھ بھی پوچھنا ہو۔ احمد بشیر سے پوچھ سکتی تھیں
کچھ بھی جاننا ہو، علم کا کوئی بھی موتی چننا ہو، بھائی جیسا عالم فاضل تاریخ داں موجود تھا جو اکثر الجھے

ہوئے مسائل کے ایسے ایسے نتارے کرتا کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

اب وہ اکثر گم صم بیٹھی خاموشی سے خلاء میں گھورتی رہتی ہیں۔ بات بات پہ حیران اور کچھ پریشان ہو کر لمحہ موجود میں ہونے والی بحث یا واردات میں سے ذہنی طور پہ چپکے سے نکل کر نہ جانے کس دنیا میں چلی جاتی ہیں۔ پاس بیٹھے شخص کو ٹہوکا دے کر واپس اسی لمحے میں لانا پڑتا ہے اور یاد دلانا پڑتا ہے کہ آپ جو بات کر رہی ہیں، وہ اہم ہے اور اس میں آپ کی حصہ داری مطلوب ہے مگر پروین اب پہلے والی پروین نہیں رہی۔ اب والی تو اس پہلے والی کا عکس بھی نہیں کہلائی جا سکتی۔ زندگی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے اور کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ دیکھنا ہے تو پروین سے ملیے، آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔

محبت کرنے کی صلاحیت سے مالا مال یہ عورت آج یوں اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی ہے جیسے اس نے رشتوں ناطوں کی شیرینیوں کے مزے کبھی چکھے ہی نہ ہوں۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ہی صحرا میں اُگا کیکٹس کا ایک تنہا درخت ہو، خوشبودار سرخ گلابوں کی جھاڑی نہ ہو۔ حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ پروین کی زندگی رنگوں، خوشبوؤں، آرزوؤں، کارناموں اور تسخیر سے عبارت رہی ہے۔ پروین کی اور میری بطور پھوپھی بھتیجی نہیں بلکہ بطور دوست، بہت سانجھ رہی ہے، لہٰذا میں اس بھولی کو یوں ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھ کر کرب میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جتنا بھی ممکن ہو اسے گاہے بگاہے یہ احساس دلاتی رہوں کہ وہ ایک عالی دماغ، منفرد صلاحیتوں، بلند عقل و دانش رکھنے والی تخلیقی جواہر سے مالا مال خاص شخصیت ہے۔ عام سی ٹوٹی پھوٹی، خوفزدہ، عدم اعتماد کی شکار عورت نہیں۔ یہ سب میں کیوں کرتی ہوں؟ اس لیے کہ مجھے کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ پروین بچپن سے ہی میری آئیڈیل شخصیت رہی ہیں۔ میں پیڈسٹل پہ سجے اپنے پسندیدہ بت کو زمیں پہ گر کے پاش پاش ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں یہ سب اپنے لیے کرتی ہوں کیونکہ یہ میرے اپنے مفاد میں ہے کہ میں ان کی طرف چہرہ اونچا کر کے دیکھوں، ان سے روشنیاں مستعار لیتی رہوں۔ ان سے سیکھتی رہوں ورنہ پھر میرا کیا ہوگا؟ یہ تو میری اپنی بقا، اور ضرورت کے لیے ہے۔ یہ میرا اپنا لالچ ہے کیونکہ میں ان کو اپنے سر پہ موجود پاتی ہوں تو اک ذرا سا حوصلہ رہتا ہے۔

ان کے تخلیق کردہ ادب میں بہت گہرائی ہے۔ اتنی کہ انسان ڈوب جائے تو سراغ زندگی پالے۔ وہ ممتاز مفتی کے قبیلے کی ایک ایسی بنجارن ہے جو ہمیشہ محبت کے اکتارے کی دھن سن کر جنگلوں میں چھپی پراسرار گھانیوں کی جانب چل دیتی ہے مگر بہت کھوجنے کے باوجود نہ جیتم

ملے نہ پیار، نہ پرندے اور نہ پانی۔ پروین کی کھوج بھی کھوج رہی اور پیاس بڑھتی چلی گئی مگر پھر یہ تو بہت سی ایسی ناریوں کا بھوش ٹھہرتا ہے جو پیار کو ہی اپنے جیون کا مطلوب و مقصود بنا لیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ پیار نہ ملا تو شاید مر ہی جائیں گی اور پھر واقعی مر بھی جاتی ہیں۔ حالانکہ جیتی جاگتی دکھتی ہیں۔ پروین کا المیہ بھی بہت سی عورتوں والا المیہ ہے۔ دنیا کے دشت کو تنہا پار کر جانا اور ان چاہے رہ جانے کا دکھ، کسی چاہت، کسی نرم تھپکی، کسی میٹھی سرگوشی کی آرزو اور پھر سامنے. بچا لق ودق صحرا، یہ سب کسی بھی انسان کو کرچی کرچی کر دیتا ہے تو وہ تو پھر ایک حساس دل اور روشن دماغ والی لیکھک ہے۔ وہ ان عذابوں سے بھلا کیسے بچ سکتی تھیں؟

پروین عاطف سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی، مجھے یاد نہیں کیونکہ دنیا میں آنے کے بعد پہلی بار آنکھ کھولتے ہی نظر آنے والی اپنے کب کسی کو یاد رہتے ہیں؟ ان سے کب شناسائی ہوتی، واقفیت بڑھی، دوستیوں کے ہاتھ بڑھائے گئے یہ بھی واضح نہیں۔ واضح ہے تو بس یہ حقیقت کہ ہم دونوں ہمیشہ سے ہی یوں گلے ملے جڑے بیٹھے ہیں کہ الگ ہونے یا ایک دوسرے سے خود کو الگ سمجھنے کا کبھی جی ہی نہیں چاہا۔ خواہش ہی نہیں پیدا ہوئی۔ خیال بھی نہیں آیا۔ ذہن کے پردۂ سیمیں پر جب ماضی کی فلم چلتی ہے تو فلیش بیک کا یہ سین بھی بار بار فوکس ہو جاتا ہے۔ سالہا سال گزرنے کے باوجود کل ہی کی بات لگتی ہے۔ نو دس برس کی ایک بچی فراک پہنے، کرشن نگر کے ایک خوبصورت مکان Lovely Lodge کے تھڑے پہ بیٹھی، حسب معمول سہ پہر کے وقت کسی کی راہ تک رہی ہے۔ لولی لاج اس گلی کا آخری مکان جس کے آگے خوبصورت سانده روڈ بڑی شان سے گزرتی ہے اور اس پار سبز کھیت لہلہاتے نظر آتے ہیں صاف ستھرے محلے کا پرسکون ماحول، میرے دادا دادی کا گھر آج کے کرشن نگر سے اس دور کا کرشن نگر کوئی مناسبت نہیں رکھتا ہے۔ تب وہ واقعی کرشن کا شہر تھا۔ امن شانتی کا گہوارہ، محبت بھری محلے داریاں، دوستیاں اور تعلقات والا اور آج فسادوں کا گڑھ بن چکا ہے۔

گلی کی نکڑ سے ایک سیاہ دھبہ نمودار ہوتا ہے۔ بچی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ قریب آتے آتے کالا دھبہ جادو کے زور سے ایک سیاہ برقعے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک خوبصورت پر وقار طالبہ ہاتھ میں کتابیں تھامے اس بچی کے پاس پہنچتے ہی اپنا نقاب الٹ دیتی ہے۔ بچی خوشی سے اس کی جانب لپکتی ہے۔ تیکھے نقوش والی دراز قد، زرد گلاب جیسی رنگت والی پھوپھو اپنا پیچھے چھپا ہوا ہاتھ آگے بڑھا دیتی ہے اور اس کی لاڈلی بھتیجی اس کے ہاتھ سے گنڈیریوں کا لفافہ جھپٹ لیتی

ہے۔ دونوں ہم عمر سہیلیوں کی طرح ہنستی مسکراتی اندر چل دیتی ہیں جہاں Lovely دلوں والے زندہ خوش باش لوگ رہتے ہیں۔ یہ وہ دن تھے جب پروین صرف پروین رعنا تھی۔ لاہور کالج میں پڑھ رہی تھی اور کالج میں مدحو بالا کے نام سے جانی جاتی تھی۔ حسین بھی تھی اور ذہین بھی اس لیے دوست، رشتہ دار بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ ماں باپ بہن بھائی عزیز سہیلیاں اس پر بھنوروں کی طرح منڈلاتیں اور اسے بیچ پھلہ رانی کہہ کر بلایا جاتا۔ گھر والوں کا جی چاہتا اسے کانچ کے نازک سینڈل پہنا کر کسی شوکیس میں سجا کر رکھ دیں تاکہ زمانے کی گرم سرد ہوا چھو نہ سکے۔ وہ اسے دور دور سے احتیاط سے سنبھل سنبھل کر ہاتھ لگاتے کہ مبادا کہیں کوئی خراش نہ آ جائے۔ میلے ہاتھ اس پر کوئی دھبہ نہ چھوڑ دیں۔

اتنی محبت، عزت و توقیر نے پروین میں حد درجہ خود اعتمادی پیدا کر دینے کے ساتھ ساتھ اسے تھوڑی سی خوش فہمی میں بھی مبتلا کر دیا وہ خود کو کسی پریوں کے دیس کی شہزادی سمجھ کر اترائی اترائی پھرنے لگی۔ بادشاہ مائیڈاس کی طرح جس چیز کو ہاتھ لگاتی وہ سونا بن جاتی، جس پگڈنڈی پر قدم رکھتی، اس پر رنگین پھولوں کی پھلواری بہار دینے لگ جاتی، جس پھول کو سونگھ لیتی اس میں سے خوشبو پھوٹنے لگتی۔ یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ پریوں کے دیس کی رہنے والی ہر پری کی کہانی میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تہس نہس کر دینے والا جن یا سامری جادوگر تو ضرور ہوتا ہے اور زمانے اور وقت سے بڑا جن اور سامری جادوگر کب اور کہاں ہوا ہے؟ پروین اپنی دھن میں مگن، موم کے پر لگائے سورج کی طرف پرواز کرنے لگی مگر اسے کسی نے یہ نہ بتایا کہ موم پگھل جاتی ہے تو اڑنے والا دھڑام سے نیچے آ گرتا ہے اور دوبارہ پرواز کرنے کی سکت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے پنکھ تڑوا کر پاتال کی اندھی گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتی اس نے اپنی منزل ہی بدل لی۔ اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور اپنے بازوؤں کی پوری طاقت آزمانے کے لیے نئے دیسوں، اجنبی فضاؤں، ان دیکھی وادیوں کی دید کے سفر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ وہ ایک نازک بدن، نازک اندام، نازک مزاج، پری کے بجائے ہمیشہ سے ایک عام عورت رہی ہے اور عام عورت ہونا کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں، ایک بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ عام عورت ہی سروائیور ہوتی ہے اور سروائیور ہی کامیاب ہوتا ہے۔ عام عورت کے ارادے اور اعصاب لوہے کے بنے ہوتے ہیں جو قلعے کی دیوار کی طرح، باہر سے آنے والی ہر آفت کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایسی عورت کو پھر کس بات کا غم اور ناکامی کا کیسا صدمہ؟

جوانی میں پروین سن پچاس کی دہائی کی ہر جوان لڑکی کی طرح رومانویت اور آئیڈیلزم کا شکار تھی۔ دلیپ کمار، نرگس، راج کپور، ایوا گارڈنر کی فلموں میں سانس لیتے لیتے وہ خود کو بھی انہی میں سے ایک سمجھنے لگ گئی تھی۔ اے حمید کے ناولوں نے بھی اسے کافی خراب کیا کیونکہ انہیں پڑھ کر ہی اسے ایسے اجنبی دیسوں میں جا کر انہیں دیکھنے کا شوق ہوا جہاں چائے کے خوشبودار باغ مہکتے ہوں، زرد گلاب کے جنگل کھلے اور سبز بانسوں کے جھنڈ گھنیرے سائے کیے رہتے ہوں۔ جہاں پہروں سفید شفاف برف گرتی ہو اور آبشاروں سے موتی اچھلتے ہوں۔ دراصل قصور اس کا بھی اتنا نہیں تھا۔ اس کے اردگرد کے لوگوں نے ہی اس کے گلے میں عقیدت کی مالائیں پہنا کر اسے ایک قابل پرستش دیوی بنا کر رکھ دیا تھا۔ زمین سے اونچا اٹھا دیا تھا، حالانکہ وہ تو ان مراعات کے بغیر بھی جینے کا سلیقہ رکھتی تھی۔ اس کے جیون ساتھی نے کانچ کی اس گڑیا کو شوکیس سے نکال کر ہتھوڑی سے ایسی کڑی ضربیں لگائیں کہ وہ چور چور ہو کر رہ گئی۔ پھر ققنس نے جنم لیا۔ راکھ کے ڈھیر سے دوبارہ پیدا ہونے والی نے عزم کر لیا کہ واویلا مچانے کی بجائے اسے اب زندگی سے اپنا حصہ طلب کرنا ہے۔ اسی خیال سے اس نے سیاحت کی دنیا میں قدم رکھنے کی ٹھانی اور قلم کو اپنا معاون اور رفیق بنا کر نکل کھڑی ہوئی۔ ویمن ہاکی کی صدر بننے سے اسے سیاحت کے بے شمار مواقع ملے۔ اس نے اپنے دل، اپنے مسافر کو ہمرکاب بنا کر ملک ملک کی سیر شروع کر دی۔ بستی بستی گھومی، نگر نگر دیکھا۔ مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، روایات کا مطالعہ کیا اور انہیں متحیر کر دینے والے سفرناموں کی شکل میں قلم بند کرنے لگی۔

اس کے سفرنامے اس کے سفروں سے زیادہ انوکھے اور نرالے ہیں کیونکہ وہ جگہوں کو اپنی اندر کی آنکھ سے دیکھتی اور روح کی گہرائیوں سے محسوس کرتی ہے۔ دل کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لینے کے بعد اپنے تجربات کے ٹکڑوں کو دھیرے دھیرے کھولتی اور پھر کاغذ پہ اسے خوبصورتی سے اتارتی ہے تو پڑھنے والا سحر زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی تحریر میں سورج کی پہلی کرن جیسی چمک خوش رنگ، تتلی جیسی رنگینی اور بھرپور گرفت میں لے لینے والے بگولے کی شدت ہوتی ہے۔ قریہ قریہ، نگری نگری چلنے والی پٹرواسنی چلتی رہتی ہے۔ چلتی ہی رہتی ہے اور اس کے پاؤں تھکتے بھی نہیں۔ اس کے دل وحشی کو سکوں سے کبھی مطلب نہیں رہا اور اس جوگن نے کسی نگر میں کوئی ٹھکانہ نہیں کیا۔ وہ لکھتی رہی اور ایک نئے روپ میں ڈھلتی رہی۔ پروین کو عشق کرنے کی بیماری ہے۔ نوٹ کیجیے میں نے عشق کہا ہے، محبت نہیں کیونکہ محبت تو ابتدائی منزل کی داستان ہوتی ہے۔ عشق کی

منازل تو بہت بعد میں آتی ہیں۔ وہ عشق میں اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دینے پر ستی ہو جانے پر یقین رکھتی ہے۔ اس کے عشق کی زد میں آنے والے اس کے اپنے، اس کے قریبی لوگ، ایک کے بعد ایک کر کے اس کے وجود پر قدم رکھتے، آرام سے اس کے اوپر سے ڈبل مارچ کرتے گزرتے چلے جاتے ہیں اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی کہ ان کے نیچے ایک ڈورمیٹ نہیں بلکہ ریڈ کارپٹ بچھا ہوا ہے۔ وہ ان کے لمبے چرمی جوتوں کی چرچراہٹ سن کر یوں خوش ہوتی ہے جیسے اس کے کانوں میں میٹھا رس ٹپک رہا ہو۔ سوچتی ہے، چلو کسی کے کام تو آئی۔ کم از کم مجھے روند کر وہ میرے اوپر سے گزر تو رہے ہیں، یہ بھی تو ایک تعلق ہے اور تعلق کسے درکار نہیں ہوتا؟

وہ بت پرست ہے۔ جس سے عشق کرتی ہے اس کا ایک بت بناتی ہے اور پھر اسے ایک اونچے سے پیڈسٹل پہ سجا کر اس کی پوجا شروع کر دیتی ہے۔ یہ اس کی مجبوری ہے۔ اسے زندگی میں ہمیشہ ایک ''آبجیکٹ آف لو'' بت کی ضرورت رہی ہے۔ کبھی وہ بت اس کا خاوند ہوتا ہے۔ کبھی اس کے بیٹے اور بیٹیاں لیکن ہر بت کدے میں ایک نہ ایک دن تو ایسا ضرور آتا ہے جب بت پاش پاش ہو کر زمین پر گر پڑتے ہیں اور ایک ان دیکھے خدا کے وجود کو تسلیم کرنا پڑ جاتا ہے، پروین کے لیے یہ وقت ذرا کٹھن ہوتا ہے۔ وہ اپنے بت کدے کے بتوں کو پیڈسٹل سے گرتے، بھربھرا کر زمین بوس ہوتے، عام انسانوں میں تبدیل ہوتے دیکھ کر مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ مجبورئ عشق کی بنا پر بت کدے میں ہی حیراں حیراں بیٹھی رہ جاتی ہے کیونکہ وہاں سے اٹھ کر جانے کی اس میں ہمت نہیں ہے۔ ان بے حس بتوں میں جان ڈالنے کی تپسیا میں بھلے اس کی صحت جواب دے جائے۔ اس کا دل ٹوٹ جائے۔ اس کے خواب بکھر جائیں، اس کی عمر چلی جائے۔ اس کو کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

سب ماؤں کی طرح وہ بھی اپنے بچوں کی عاشق ہے۔ سردیوں کے موسم میں اگر کوئی بچہ کہہ دے ''امی آج آم کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' تو پاؤں میں کھڑاویں ڈال، دنیا میں کوئی نہ کوئی ایسا خطہ ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوگی جہاں اس وقت آموں کا موسم ہوگا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ جائے گی کہ سارے کا سارا باغ جڑ سے اکھاڑ لینے کی کیا ترکیب لڑائے اور اگر ساتھ میں ایک آدھ سیبوں کا باغ بھی بغل میں داب سکوں تو وارے نیارے ہی ہو جائیں۔ کہیں میرے بچوں کا سیبوں کے لیے ہی نہ جی مچل جائے۔

صحرا میں چلتے چلتے اگر بچے کہہ دیں کہ امی پیاس لگی ہے تو کہیں نہ کہیں سے پورا سمندر

اپنی چھاگل میں بھرلائے گی۔ بچہ اگر بچا ہوا پانی زمین پر پھینک دے تو اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرے بغیر پیار سے پوچھے گی اور سمندر لا دوں؟

ایک چینی ضرب المثل ہے۔ جو ہاتھ تمہیں گلاب کے پھول دیتا ہے، اس میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔ پروین اسی ہاتھوں میں بسی پیچھے رہ جانے والی خوشبو کو سونگھ سونگھ کر جی لیتی ہے۔ ممتاز مفتی کی میلہ گھومنی، کا شوق آوارگی دراصل اس شعور اور آگہی کے طفیل ہے جو اسے پل پل ڈستی، ڈنگ مارتی اور پھر نئے سرے سے حیات بھی بخشتی ہے۔

اس نے زندگی میں بہت سے کام کیے۔ شادی بھی کی۔ پاکستان میں خواتین کی ہاکی کو فروغ دیا۔ انوکھے موضوعات پہ لکھا۔ جھگیوں بستیوں کے لوگوں کے مسائل حل کروائے۔ دور دراز کے دیہی علاقوں میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور مجھے اپنی بھتیجی کو اپنے بچوں کی طرح ساتھ ساتھ رکھا اور میری ذہنی اور سماجی تربیت کی۔ ناہموار فضا اور دشوار گزار راستوں کے باوجود اس نے اپنے اندر جستجو اور تمنا کے دیئے روشن رکھے اور ہمیشہ جگمگاتی رہی۔ یہ کھوج اور تمنا اسے شناخت، معنویت اور سکون دیتی ہے۔ کپل وستو کا شہزادہ سدھارتھ بھی تو اسی کھوج اور تمنا کی وجہ سے گوتم بدھ بن سکا تھا، اس نے کہا تھا۔

''تمنا کا درخت کاٹ دو تو اس کے تنے میں حسرتوں کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔'' ہم سب اپنے اپنے دل کے آنگن میں اُگے ہوئے تمنا کے پوشیدہ ہرے بھرے درخت کی چپکے چپکے پرورش کرتے رہتے ہیں۔ پروین بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ اسی لیے اس کی تمنا کا درخت اونچا لمبا اور تناور بنتا جا رہا ہے۔ وہ پھیل رہا ہے، چھا رہا ہے، چھاؤں دے رہا ہے۔ پروین عاطف کی تخلیقی قوت بڑھ رہی ہے۔ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ایسے میں حسرتوں کی کونپلوں کی کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔ پروین ایک مکمل ادیب ہے اور اس کا لکھا آج کے ادب میں اپنی مستحکم جگہ بنا چکا ہے، اسے اب جنگل جنگل بیلے بیلے خاک چھاننے کی ضرورت نہیں رہی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروین کی طبیعت میں بہت بے قراری آ گئی ہے۔ وہ کہیں بھی جائے۔ کہیں بھی ہو، تھوڑی ہی دیر بعد اٹھ کر چلنے کے لیے بے صبری سے پہلو بدلنے لگتی ہے۔ ایک ہی جگہ پر وہ زیادہ دیر تک کر نہیں بیٹھ سکتی۔ شاید اسی حالت کو ماہرین Restless Syndrome کہتے ہیں۔ کسی فنکشن، دعوت، فلم میں بیٹھی ہوئی ایک آدھ گھنٹے کے بعد ہی وہاں سے نکل بھاگنے کو پر تولنے لگتی ہے۔ چاہے ابھی وقت باقی ہو، فلم انٹرول تک بھی نہ پہنچی ہو۔ ہیروئن

پہاڑ کی چوٹی سے نیچے لٹک رہی ہو اور ہیرو کے آنے میں وقت ہو۔ پروین اپنا پرس اٹھا کر چلنے کو تیار نظر آتی ہے۔ شاید اس لیے کہ صرف وہیں اسے اپنا کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ وہیں سے اسے فرار ممکن نظر آتا ہے جبکہ المیہ تو یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بور، بے رنگ، بے مزا فلم سے اٹھ کر کبھی باہر نہیں جا سکی۔ اس کی فلم چلتی رہی، سین بدلتے گئے اور وہ خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہی، اب تو اس کی فلم کے کئی کردار کہانی سے باہر نکل کر نئی کہانیوں میں سما گئے ہیں۔ بھری ہوئی سیٹوں والا ہال خالی ہو گیا، بے پرنٹ گھس گیا ہے مگر فلم ہے کہ اب تک چلتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس میں کوئی دلچسپ موڑ، کوئی حسین منظر آنے کی امید بھی دم توڑ چکی ہے مگر پروین پردے پہ آنکھیں جمائے صبر سے اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے۔

---------O---------

خوشیا

چند برس اُدھر کی بات ہے۔ ماہر موسیقی حیات احمد خاں صاحب نے امریکہ سے لوٹنے پہ مجھے بتایا کہ شکاگو کے ایک شاعر افتخار نسیم تمہارے افسانوں کے بہت مداح ہیں اور تمہیں سلام بھجواتے ہیں۔ میں بڑی حیران ہوئی کہ یہ کون حضرت ہیں جن کو میں نہیں جانتی مگر وہ مجھے جانتے ہیں اور مجھے یوں سندیسے بھجواتے ہیں۔ بہرحال سوچ کر کہ جو کوئی بھی ہوگا، کوئی ٹھیک آدمی ہی ہوگا۔ میں خوش ہوگئی اور اس بات کو بھول بھال گئی۔

اس سے اگلے برس جب امریکہ گئی تو اتفاقاً شکاگو جانے کا بھی موقع مل گیا۔ دو خالہ زاد بھائی عرصہ دراز سے شکاگو بلاتے تھے، لہٰذا میں نے گٹھڑی اٹھائی اور روانہ ہوگئی۔ شہرنوردی کرتے کرتے ایک روز ایک انڈو پاک گروسری سٹور سے اردو کا فری اخبار اٹھالیا اور مقامی خبریں پڑھنے لگی۔ ایک خبر پڑھی تو دل بے چین ہوگیا۔ لکھا تھا ''انڈین اداکارہ شبانہ اعظمی اس وقت شکاگو میں موجود ہیں۔ کل ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس کی نظامت کے فرائض افتخار نسیم نے ادا کیے۔''

کچھ چیزوں اور لوگوں کے بارے میں میں کافی اوچھی اور شوہدی کہلائی جاسکتی ہوں۔ شبانہ اعظمی بھی ایسے لوگوں میں سے ایک ہیں جن سے ملنے کے لیے میں ایک ٹین ایجر جیسی غیر سنجیدہ حرکتیں بھی کرسکتی ہوں کیونکہ وہ میری محبوب ترین فنکارہ ہیں۔ یہ جان کر کہ وہ اور میں اس وقت ایک ہی شہر میں موجود ہیں، میرا دل ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ کاش میں بھی ان سے مل سکتی۔ یہ سوچ کر میں نے گھر جاتے ہی اخبار میں دیا گیا افتخار نسیم کا فون گھما دیا۔ افتخار نسیم اس وقت پانی پہ رواں کسی کشتی پہ سفر فرمارہے تھے۔ میرا فون انہوں نے وہیں سنا اور یہ سن کر کہ میں

انہیں فون کر رہی ہوں، اتنا خوش ہوئے کہ میرا بھی دل خوش کر دیا۔ انہوں نے میری چند ایک کہانیوں کا بھی حوالہ دیا تو میں اچانک اس اَن دیکھے شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ یہ سن کر البتہ بہت دکھ ہوا کہ شبانہ سے ملنے کی میری خواہش پوری نہ ہو سکے گی کیونکہ وہ اسی رات شکاگو سے واپس جا رہی تھیں۔ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت، بہر حال افتخار نسیم تو مل گئے، یہ خوشی بھی کم نہ تھی۔ جلد ہی ہم دونوں بے تکلفی سے پنجابی میں گفتگو کرنے لگے اور ہم نے اگلے روز ملاقات کا پروگرام بنالیا۔ انہوں نے مجھے میرے خالہ زاد بھائی کے گھر سے پک کر کے شکاگو کے کچھ لوگوں سے بھی ملوانے کا ارادہ ظاہر کیا اور فون بند ہوگیا۔

اگلے روز وقت مقررہ پر بیل بجی اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے سفید سوٹ میں ملبوس ایک کیم شیم، گہرے سانولے رنگ کا مسکراتا ہوا شخص کھڑا تھا۔ اندر آ کر بیٹھے۔ رسمی دعا سلام ہوئی اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا ''چلیے پھر چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کہاں چل رہے ہیں ہم؟''

''پہلے آپ کو گھر لے جائیں گے، چائے کافی پلائیں گے۔ پھر لنچ کروائیں گے۔ دوستوں سے ملوائیں گے۔'' انہوں نے دن بھر کا شیڈول سنا دیا۔

''گھر پہ آپ کی بیگم، بچے وغیرہ؟'' میں نے جنرل سا سوال کیا۔ اس وقت تک میں ان کے بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ شادی شدہ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

''میری کوئی بیگم نہیں۔ البتہ ایک لائف پارٹنر ضرور ہے۔ دراصل میں گے ہوں۔'' افتخار نسیم نے بڑے سرسری انداز میں جواب دیا اور مجھے یوں لگا جیسے دو تین بم اکٹھے میرے سر پہ آن گرے ہیں۔ کمرے میں جیسے زلزلہ سا آ گیا، اندر سے تو میں ہل کر رہ گئی مگر اوپر سے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور منہ پکا کے بڑے آرام سے ''اچھا'' کہہ کر زبردستی مسکرا دی۔ یوں ظاہر کیا جیسے انہوں نے کوئی نئی یا عجیب و غریب بات مجھے نہیں بتائی۔ بس یہی بتایا کہ انہیں کریلے گوشت کے ساتھ مٹر پلاؤ پسند ہے اور بیلجی کے ساتھ زردہ، دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔

افتخار صاحب نے اسی پہ بس نہیں کی اور مزید تفصیلات دینے لگے ''میں Hermophrodite ہوں یعنی آدھا مرد آدھی عورت۔'' میں نے پھر آرام سے یوں سر ہلا دیا جیسے سب کچھ میں آ گیا ہو۔ حالانکہ خدا جانتا ہے میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ آدھا مرد، آدھی

عورت کیا بلا ہوتی ہے۔ اتنا شدید یونانی لفظ سن کر ذہن پہ بڑا زوردار اگر کوئی مطلب یاد نہ آیا۔ اپنی وسیع النظری کا بھرم تو بہرحال رکھنا ہی تھا، لہٰذا بڑی بہادر بن کر بولی "Nothing Shocks me any more."

حالانکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے مجھے پورے چار سو چالیس واٹ کا زوردار جھٹکا لگ چکا تھا اور زمین پیروں تلے سے کھسکتی محسوس ہو رہی تھی۔

1972ء کا سال، امریکہ میں میرا پہلا سال تھا۔ بالی عمریا اور دل نادان تھا۔ زندگی نے ابھی سانپ نے مارنے اور ننگا ناچ نچوانے کا عمل شروع نہیں کیا تھا، لہٰذا کم علمی، بے خبری، لاپرواہی مزاج کا حصہ تھی۔ (جیسے اب نہیں ہے) ایک شام اپنے گھر واقع نیویارک میں بیٹھی ٹی وی پہ خبریں دیکھ رہی تھی کہ ایک خبر نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ شہر سان فرانسیسکو میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا تھا جس کی کوریج کرتے ہوئے رپورٹر بتا رہا تھا کہ "یہ گے لوگوں کا جلوس ہے جو اپنے حقوق منوانے کے لیے سڑک پہ نکل آئے ہیں۔" میں بڑی متاثر ہوئی۔ "ماشاء اللہ کیا زبردست ملک ہے امریکہ بھی، خوش باش لوگ خوشیاں منانے کے حقوق طلب کر رہے ہیں یعنی اس سے زیادہ پیاری اور خوبصورت بات کیا ہو سکتی ہے۔" میں نئی نئی پاکستان سے آئی تھی جہاں میں نے صرف حکومتوں اور غاصبوں کے خلاف نکالے جانے والے جلوس ہی دیکھ رکھے تھے۔ میں نے اس قسم کا انوکھا "خوش جلوس" پہلے نہ کبھی سنا نہ دیکھا تھا، لہٰذا بہت اچھا لگا۔ دل واقعی خوش ہو گیا۔

آج 1972ء کو گزرے صدیاں بیت چکی ہیں، اب میں بڑی چالاک ہو چکی ہوں۔ آج مجھے گے کا دوسرا مطلب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ افتخار نسیم کو ملنے سے پہلے میں قطعاً یہ نہیں جانتی تھی کہ گے لوگ کیا ہوتے ہیں۔ کیسے ہوتے ہیں۔ ان کا طرز زندگی کیا ہے؟ اپنی خوشی کی معراج پہ پہنچنے سے پہلے ناخوشی کی کتنی منزلیں طے کرتے ہیں، کتنے عذابوں کا مزا چکھتے ہیں اور کیسی کیسی زہر بھر نوکیلی سیخوں میں پروئے جاتے ہیں۔ کتنے غم کے بھرے ہوئے ہوتے ہیں یہ لوگ۔

"تو چلیے پھر چلتے ہیں۔" افتخار نسیم اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ عمر کے میچور حصے میں پہنچ جانے کے باوجود میرے اندر کی مشرقی لڑکی کسی اجنبی مرد کے ساتھ ایک انجان شہر میں گھومنے پھرنے کے خیال سے بدکنے لگی۔ نہ جانے کہاں سے اچانک اپنے ابا یاد آ گئے جو چار بیٹیوں کے باپ تھے، جن کی ہدایت تھی کہ شام مغرب سے پہلے پہلے سب لوگ گھر پہنچ جایا کریں۔ آج ابا پاکستان میں اتنی دور بیٹھے تھے اور ان کی ایک بیٹی یوں اکیلی بلا جھجک کسی

کے ساتھ چلنے کو تیار ہو چکی تھی۔ وہم اور اندیشوں کے ننھے ننھے خوفناک بھوتوں نے میرے گرد گھیرا ڈال کر ناچنا شروع کر دیا۔

خیر سارا قصور میرا بھی نہیں تھا۔ افتخار نسیم صاحب بھی تو اتنے الٹے پلٹے تھے کہ میں کنفیوژ ہو گئی۔ فوراً اپنا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا، کوئی لگی لپٹی نہ رکھی، نہ کوئی فسانہ گھڑنے کی ضرورت محسوس کی۔ چھوٹتے ہی بتا دیا کہ میں تو یہ یہ اور یہ ہوں۔ چلیے میرے ساتھ چائے کافی پینے۔ بھلا یوں بھی کوئی کرتا ہے؟ میں اپنے تئیں بڑی میچور، زمانہ ساز افسانہ نگار بنے یوں پھر رہی تھی۔ سمجھتی تھی کہ میرا تعلق عورتوں کی اس خاص پر اعتماد نسل سے ہے جسے کوئی خوف پچھاڑ نہیں سکتا تو کیا یہ سب میری خام خیالی اور اپنے بارے میں خوش فہمی سے بڑھ کر کچھ نہ تھا؟ میں تو اندر سے وہی سہمی ہوئی ڈرپوک سی مشرقی لڑکی نکلی جو کسی اجنبی مرد کے ساتھ اکیلی باہر جاتے ہوئے گھبرا جاتی ہے۔

گھر سے گٹھڑی اٹھائے میلہ گھومنے، دنیا دیکھنے نکل تو پڑی تھی مگر شاید حوصلہ کا زادِ راہ میرے پاس نہ تھا۔ یہ جاننے کا شوق تو بہت تھا کہ دنیا میں ایسا کیا کیا مجھ سے اوجھل اور پنہاں ہے جو مجھ پر ابھی تک آشکار نہیں ہوا اور جسے جاننا بوجھنا اور سیکھنا ہے۔ ایسے لوگ کون سے ہیں جو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کیے جانے کی خواہش میں تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں؟ دنیا کے کون کون سے شہروں میں دوست نام کے بیش بہا خزانے مل سکتے ہیں؟ افتخار نسیم، ایک اجنبی شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں اسے پہلی بار مل رہی تھی مگر نہ جانے اس میں مجھے خلوص کی کون سی پرچھائیں، محبت کی کون سی چمک نظر آئی کہ اس پہ بے اختیار اعتماد کرنے کو جی چاہا اور میں اس کے ساتھ چل دی۔ کچھ ہی دیر میں ہم شہر شکاگو کی وسیع سڑکوں پر قہقہے لگاتے، قصے سناتے ڈرائیو کرتے جا رہے تھے۔ طویل قامت عمارتوں اور خوبصورت شاہراہوں والے پر وقار شہر کے کنارے کنارے بہنے والی، گہرے نیلے پانی کی جھیل مشی گن شکاگو کے حسن کو چار چاند لگاتی ہے۔ ہم کتنی ہی دیر اس کے کنارے بیٹھ کر اڑتے ہوئے سفید بگلوں اور جھلمل کرتے پانی میں نہاتے جوڑوں اور بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔

سب سے پہلی بات جو افتخار نسیم صاحب نے مجھ سے کی، وہ یہ تھی کہ میں انہیں افتی کہہ کر بلاؤں کیونکہ دنیا انہیں اسی نام سے جانتی اور پکارتی ہے۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، میں تو خود ہی تکلفات سے دور بھاگتی ہوں، لہٰذا میں نے انہیں افتی کہنا شروع کر دیا اور ہماری دوستی ہو گئی۔ افتی جی نے ایک بات بتا کر مجھے چونکا دیا اور بے یقینی میں مبتلا کر دیا۔ کہنے لگے ''مجھے زندگی میں تین

شخصیات سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ قرۃ العین حیدر، نور جہاں اور نیلم احمد بشیر۔'' ایسی بات سن کر میرا تو منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آپ ہی بتائیں بھلا یہ بھی کوئی ماننے والی بات ہے۔ کہاں وہ دو عظیم شخصیات اور کہاں میں، میں قطعاً ماننے کو تیار نہ ہوئی۔ ''نہ مانو لیکن حقیقت یہی ہے۔'' افتی اصرار کیے گیا۔ ''من آنم کہ من دانم۔ کہاں وہ دو عظیم تناور درخت اور کہاں مجھ جیسی ٹھگنی جھاڑی۔ آپ مجھے ان کے ساتھ بھلا کیسے ملا سکتے ہیں؟'' میں بے یقینی سے بولے گئی مگر افتی اپنی بات پہ اڑا رہا۔ ''اچھا اگر اس بندے کا دماغ خراب ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟'' میں سوچ کر چپ ہو رہی۔

پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کرنے، لفٹ میں گھسنے اور چالیسویں منزل پہ واقع فلیٹ تک پہنچتے پہنچتے افتی راہ میں جس سے بھی ملا اس نے اس سے ہنس کر پیار سے ہیلو ہائے کی اور حال پوچھا۔ افتی کو سب جانتے اور افتی سب کو پہچانتا تھا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلتے ہی افتی کی پالتو بلیاں اس کی طرف محبت سے لپکیں۔ اس نے خوبصورت سیامی بلیوں کو پکار سے پچکارا اور انہیں کہنے لگا ''آؤ میرے بچو، تمہیں کھانا دوں۔ فکر نہ کرو، امی گھر آ گئی ہے۔'' بلیاں رغبت سے ٹن فوڈ سے نکلا ہوا لذیذ کیٹ فوڈ کھانے لگیں تو افتی اپنے فلیٹ کی بالکنی پہ جا کر کبوتروں کو دانہ ڈالنے لگا اور میں نے اس کے نشیمن پہ نظر دوڑائی۔ عجیب و غریب گھروندا تھا۔ دیواروں پہ اپنی اور اپنے عزیز دوستوں کی تصاویر، نادر پینٹنگز، قرآنی کتبے سجے تھے، شیلفوں پہ پرانے چینی مجسمے، انوکھے نوادرات، ڈیکوریشن پیس ہر آنے جانے والے کو حیرت سے تکتے تھے۔ ایک طرف میوزک کیسٹ کے ریک، تو دوسری طرف اخبار، رسالے اور لٹریچر کا خاص انتخاب۔ علم و ادب، موسیقی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، تری ہی تری، سکون ہی سکون سکون، اضطراب ہی اضطراب۔ افتی کے اپنے ذاتی کمرے میں سجی ہوئی پرانی انڈین اور پاکستانی اداکاراؤں کی بلیک اینڈ وائٹ تصاویر کسی گزرے ہوئے خیال، کسی بیتی ہوئی داستان، کسی فراموش کردہ دور کی یاد دلاتی تھیں۔ یادوں کے جھروکے سے جھانکتی ہوئی ماضی کی پرچھائیاں وہیں کہیں موجود تھیں۔ کہیں گئی نہیں تھیں۔ آس پاس سانس لیتی تھیں۔

فلیٹ کا سب سے پرکشش اور طلسماتی حصہ اس کی چوڑی سی بالکنی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ بالکنی مجھے بلا رہی ہے۔ میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں بھاگ کے اس کے قریب جا کھڑی ہوئی اور نیچے جھانکنے لگی۔ یا اللہ یہ کیا؟ شکاگو کی گود میں لیٹی ہوئی جھیل میرے پیچھے پیچھے وہاں تک چلی آئی تھی اور اب اپنی تمام تر وسعتوں اور رفعتوں سمیت بڑے کروفر سے بالکل نیچے ہی تو بہہ رہی تھی۔ خوبصورت اور بے نیاز دھیمے دھیمے سُروں میں گنگناتی جھیل نے مجھے پل بھر کو سحر زدہ سا کر دیا۔ اس

کے فراخ پھیلاؤ میں مجھے ابد کا آخری کنارہ تک جھلملاتا نظر آ رہا تھا۔ Infinity کے شدید احساس نے مجھے جکڑ سا لیا۔ میں نیچے دیکھ کر اپنے ہی سمندروں ڈوبتے دل دریا میں جھانک رہی تھی اور مجھ پر اپنی ہی ذات کی نئی نئی پرتیں کھل رہی تھیں۔ راز منکشف ہو رہے تھے۔ جی چاہا میں بھی اس جھیل کے گہرے پانی میں تحلیل ہو جاؤں۔ اس کا ہی حصہ بن جاؤں اور پھر جل پری بن کر کسی ساحل پہ بیٹھی کسی کا انتظار کرتی رہ جاؤں۔

''شبانہ بھی میرے گھر آتی ہے تو اسی بالکنی پہ اپنا پڑاؤ ڈال دیتی ہے۔ یہیں بیٹھ کر کافی پیتی اور اخبار پڑھتی ہے۔'' افق کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اب وہ بالکنی مجھے اور بھی پیاری لگنے لگی۔ وہ افق سے میری پہلی ملاقات تھی۔ آج ہماری دوستی کو بہت سے سال گزر چکے ہیں۔ اب افق مجھے عجیب یا اجنبی نہیں لگتا اور نہ ہی مجھے اس سے پہلے کی طرح ڈر لگتا ہے کیونکہ وہ تو ایک محبت کا بھرا ہوا کوزہ ہے، خلوص کی بنی ہوئی بالوشاہی ہے۔ اس کی دنیا گو کہ اب بھی میرے لیے ایک حیرت کدے سے کم نہیں مگر اب میں پھر بھی اس کی دنیا سے کچھ کچھ واقف ہو چکی ہوں۔ اس کے ماحول سے شناسائی حاصل کر چکی ہوں۔ میں نے اس سے بہت کچھ جو ان جانا تھا، سیکھا ہے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

میرے خیال میں ہمیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہونا چاہیے کہ کون کس کے ساتھ زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کس کے ساتھ صبح کو چائے کی پہلی پیالی شیئر کرتا ہے۔ کس کے کاندھے پہ سر رکھ کر رات کے سپنے دیکھتا ہے۔ کس طرح سکون حاصل کرتا ہے۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ دنیا میں انسان ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور مختلف طرز کی زندگیاں گزارتے ہیں۔ کسی کو اس کے مختلف ہونے کی سزا کے طور پر اپنی محبت سے محروم کر دینا تعصب میں تمیز دینا کافی غیر انسانی بات ہے۔ کئی بار ہم جانے بوجھے بغیر دوسروں کو اپنے رویوں سے اتنی زور سے ڈنک مارتے ہیں کہ اس کی روح تک بلبلا اٹھتی ہے اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی، یہ مناسب نہیں۔

افق اپنی حقیقت جان کر بہت سال چپ رہا۔ تنہائی کا زہر اس کے اندر قطرہ قطرہ ٹپکتا رہا، نا قبولیت کے چھرے اسے آ آ کر لگتے رہے اور زبان پہ قفل پڑا رہا۔ پھر ایک روز اس نے اپنی چپ توڑا اور اپنی بات کہنے کو قلم اٹھا لیا۔ ہزار سال کی بجھی ہوئی ٹھنڈی راکھ میں سے ققنس نے جنم لیا اور اپنا مترنم راگ چھیڑ کر ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ افق کہتا ہے، اسے بچپن سے ہی اپنے مختلف ہونے کا احساس ہو چکا تھا مگر وہ معاشرے کے سیاہ خوف کی وجہ سے کوڑھیوں جیسی ڈری، چھپی ہوئی زندگی بتانے پہ مجبور تھا۔ ایک روز اس کا کوزہ سب کو نظر آ گیا اور سب نے ہاتھ میں

سنگ اٹھا لیے۔ لعن طعن کی زہریلی بارشیں برسیں اور وہ ہر طرح سے معتوب ٹھہرایا گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی لاش کو گلیوں میں کھینچا جاتا، اس نے ملک چھوڑ دیا اور امریکہ چلا گیا۔ امریکہ اسے خوب راس آیا کیونکہ امریکہ ایک آزاد ملک ہے۔ وہاں ہر انسان کو اپنی مرضی کی زندگی جینے کا حق حاصل ہوتا ہے اور کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ نہ کسی کی نکتہ چینی برداشت کرنا پڑتی ہے وہاں اسے روز ایک کے بعد ایک اور دریا کا سامنا نہ تھا۔ اس نے مدت ہوئی اس دیارِ غیر میں اپنا گھر بنا لیا ہے اور اپنی تیرہ شبوں کے لیے اپنی وحشتوں کے ساتھی بھی ڈھونڈ لیے ہیں۔ اب اسے بار بار رنگ رنگ کے چولے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ ان ساتھیوں کے درمیان ''وہ جیسا ہے جہاں ہے'' کی بنیاد پر بڑی فراخدلی سے قبولا جاتا ہے۔ افتی اپنے آپ کو تین چہروں والا رقاص کہتا ہے۔ ایسا رقاص جس کے نرت کا ہر بھاؤ سچا اور ہر رنگ نرالا ہوتا ہے جو سرِ بازار بصد سامان رسوائی رقص کرتے ہوئے شرماتا نہیں۔ جو منافقت کی جھوٹی اور محفوظ دنیا میں جینے کے بجائے ایمانداری اور سچائی کی پراز خطرات زندگی جینے کو ترجیح دیتا ہے۔

افتی میں عورت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس لیے ہر عورت کی طرح اس کے دل میں بھی ماں بننے کا ارمان قلقاریاں مارتا رہتا ہے۔ اس کی اکثر تحریریں اس محرومی کا ماتم کرتی ہیں اور نوحے بن کر بن کر قاری کے دل کو چھو لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ایک عورت کی مانند وہ بھی عورتوں اور دوسری دھتکاری ہوئی اقلیتوں کے استحصال پہ اپنی پوری طاقت سے احتجاج کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ''میں مرد کے جسم میں قید ایک عورت ہوں، اس لیے میری روح میرا دل، میری سوچ سبھی ایک عورت کی سی ہے۔ میرے اندر ایک مرد کی حساسیت اور عورت کی طاقت بھری ہے۔'' دھوپ چھاؤں کا یہ انوکھا امتزاج واقعی افتی کے مزاج سے جھلکتا نظر آتا ہے۔

اپنے مختلف ہونے کا احساس اس کے روئیں روئیں میں جاگتا ہے اور کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ پیر تسمہ پا کی طرح ہر وقت اس کی گردن کو دبوچے رکھتا ہے۔ افتی گے یعنی ہم جنس پرست ہے۔ سبھی جانتے ہیں مگر افتی کسی کو یہ بھولنے نہیں دیتا، ہر وقت اس کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ اکثر لوگ اپنی ذاتی زندگی کو اپنے تک ہی محدود رکھنا اور نازک معاملات کے بارے میں خاموش رہنا پسند کرتے ہیں مگر افتی بہانگ دہل اپنی ترجیح جنس کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ شاید یہ اس لیے کہ یہی اس کے ہونے کے اقرار اور تعصب سے فرار کا طریقہ ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ افتی کو ہم جنس پرست ہونے کے ناطے بڑے بڑے کشت کاٹنے پڑے ہوں گے۔ اس نے پیٹھ پر بید سے کوڑے

بھی کھائے ہوں گے لیکن یہ تو اس جہان کا دستور ہے ہی اور اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں، اپنے انگار تو ساتھ لاتے ہیں سبھی کو اپنی اپنی صلیب اپنے کاندھوں پہ اٹھا کر چلنا پڑتا ہے۔ راہ میں اگر کوئی دو گھونٹ پانی پلا دے تو اس کا بھلا ورنہ سفر تو جاری رکھنا ہی پڑتا ہے۔ افق کو اللہ سے شکوہ ہے کہ اس نے اسے ایسا کیوں بنایا۔ اسے اس رات سے گلہ ہے جس رات وہ دنیا میں آیا تھا اور وہ اس کی پیدائش کے غم میں کڑوے لڈو بانٹنے نکل کھڑی ہوئی تھی، ان لڈوؤں نے اس کی زندگی میں دور دور تک تلخی گھول کر رکھ دی اور جینے کا مزا کرکرا کر دیا۔ افق اب امریکہ میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ہم خیال، اس جیسے لوگ اس کے دوست ہیں اور خاندان کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ خوب گزرتی ہے جب یہ دیوانے مل کر زندگی سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل کرتے اور آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ انہوں نے ''سنگت'' کے نام سے اپنی ایک آرگنائزیشن بھی بنا رکھی ہے جس کی ویب سائٹ ہے اور باقاعدہ اجلاس ہوتے ہیں۔ اس ویب سائٹ کے ذریعے تمام گے لوگ ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی خبر معلوم کر لیتے ہیں۔ افق دوسرے ممالک (خاص طور پہ انڈیا یا پاکستان کے) گے لوگوں کو امریکہ بلوا لینے کی کوشش بھی کرتا ہے تا کہ وہ بھی اس آزاد معاشرے میں تعصب کے بغیر زندگی گزار سکیں۔

ان کی تنظیم جون کے مہینے میں امریکہ میں بسنے والی دوسری قومیتوں کے ہمراہ ''دیسی گے پرائڈ'' کا جلوس بھی نکالتی ہے جس میں افق اور اس کے ساتھی زنانہ کپڑے پہن کر شریک ہوتے ہیں اور بڑے اعتماد سے تصویریں بھی کھنچواتے ہیں۔ افق نے مجھے اس جلوس کی تصاویر دکھائیں جس میں اس کچھ سنگی ساتھی ساڑھی، بلاؤز، مختصر زیر جامے پہنے مسکرا رہے تھے اور افق کرتہ شلوار سندھی چادر منہ پہ ڈالے فیصل آباد کی مائی بچاتاں لگ رہا تھا۔

ایک روز میں نے افق سے انڈین پاکستانی گے خواتین کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی کراہت سے کہا ''دفع کرو، ہم انہیں نہیں ملتے۔'' ''کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''بڑی بے شرم ہیں وہ! چمڑے کی موٹی موٹی نیکریں پہن کر بے حیاؤں کی طرح ادھر اُدھر پھرتی ہیں۔'' افق نے گے خواتین کے مخرب اخلاق کردار پہ یوں تبصرہ کر کے مجھے خاموش کر دیا اور میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔

افق مجھے بطور دوست بہت اچھا، معصوم اور پرخلوص محسوس ہوتا ہے مگر میں اس کی ہر بات سے اتفاق نہیں کرتی، جب وہ کہتا ہے کہ مرد ہی مرد کو مکمل کرتا ہے اور عورت عورت کو تو جی چاہتا

ہے اپنے سر میں اینٹ دے ماروں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ مرد عورت اگر ایک دوسرے کے ساتھ واقعی مل جائیں تو اس سے بڑی راحت کوئی نہیں ہوتی۔ مرد اور عورت کے درمیان ایک ازلی کشش اور جنسی کیمسٹری موجود ہے جس کی وجہ سے وہ تمام عمر ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے جاتے ہیں مگر یہ تو میری سوچ ہے اور میری زندگی کے متعین کردہ ضابطے ہیں۔ ظاہر ہے ہم جنس پرست ایسا نہیں سمجھتے تو بھلے نہ سمجھیں۔ ہر ایک کو اپنا نکتہ نظر رکھنے کی آزادی ہونا چاہیے لیکن اتنا میں بھی مانتی ہوں کہ زندگی میں اصل اہمیت رشتہ یاRelationship کی ہوتی ہے۔ انسان کی پوری حیاتی میں اگر اسے ایک بھی جینوئن ریلیشن شپ نصیب ہو جائے تو خارزارِ حیات میں ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھا کر چلنا اتنا کٹھن نہیں لگتا۔ اس آئیڈیل تعلق، رشتہ، محبت، اس کی طلب اور تلاش ہی وہ ڈرائیونگ فورس ہے جو ہمیں تمام عمر دیوانہ وار دوڑاتی رہتی ہے۔ اس کے بغیر جیون ایک بیابان کی طرح سونا اور بے رونق لگتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے ہم محبت کی منزل کو واقعی پالیں تو چین مل جاتا ہے۔ یوں جیسے کوئی پیاسا کسی شجر سایہ دار کی گود میں نکلتے ٹھنڈے میٹھے پانی کی آبشار تلے آن کھڑا ہو اور تن من بھیگ جائے۔

اور یہ محبت بھی آخر کیا چیز ہے؟ ایک اعتماد کا نام ہی تو ہے کہ زندگی میں کوئی تو ایسا ہے جس کے ساتھ آپ کھل کر بات کر سکتے ہیں کیونکہ ہر ایک سے تو بات بھی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی ایسا ہو جسے ہاتھ لگائے بغیر اس کی موجودگی کا یقین آ جائے اور دل اپنے تمام کپڑے اتار پھینکے۔ محبت ہی ہمیں اپنے انسان ہونے اور ذات کے مکمل ہونے کا احساس دلاتی ہے ورنہ ہم تمام عمر اس کے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں دار کی خشک ٹہنی پہ وارے جاتے ہیں اور ہماری ذات کا ادھورا پن ہمیں اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگ جاتا ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ ہم حقیقت میں محبت کس سے کرتے ہیں؟ محبوب سے یا اپنی ذات سے؟ یعنی مقصد اگر اپنی ذات کی تکمیل، اپنے اندر کا ادھورا پن ہی دور کرنا ہے، اچھا محسوس کرنا ہے تو کیا ہم محض اپنی خوشی کے لیے ہی سارا ڈرامہ نہیں رچائے بیٹھے؟ کیا ہمارے لیے صرف اپنی خوشی ہی سب سے مقدم نہیں؟ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہم درحقیقت اپنی اپنی چاہت میں گرفتار رہتے ہیں کیونکہ ہمارا سب سے پکا رشتہ صرف اور صرف اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ ہم زندگی کی تمام محبتیں اسی حوالے اور حساب سے کرتے ہیں۔ اپنے ہی قلب کا سودا خریدتے پھرتے ہیں۔ محبوب کی شکل صورت، مزاج، خیالات، مذہب، کلاس حتیٰ کہ کبھی کبھار جنس (Gender) تک ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

اس محبت، اس رشتے اس تعلق سے ملنے والی خوشی کی ست رنگی پچکاریاں ہمیں نہال کر دیتی ہیں تو زندگی بامقصد نظر آنے لگتی ہے۔

افق ہم جنس پرستی کو ایک نارمل فینامینا ثابت کرنے کے لیے تاریخ سے بہت سی مثالیں دیتا ہے۔ محمود و ایاز، شہنشاہ بابر، ہارون الرشید، بہت سے صوفیاء کرام۔ ملکی غیر ملکی معروف ادبی اور غیر ادبی شخصیات کے نام گنواتا ہے۔ پھر کہتا ہے، افلاطون بھی یہی کہہ گیا ہے کہ" مثالی تعلق صرف مرد اور مرد کے بیچ ہی ممکن ہے۔ خدا کا شکر ہے اس نے مجھے مرد بنایا، عورت نہیں۔" ارسطو صاحب اس خیال کو یوں آگے بڑھاتے ہیں کہ" قدرت جب کسی کو مرد بنانے میں ناکام ہو جاتی ہے تو عورت بنا دیتی ہے۔" ان سب عقلمند لوگوں کی ایسی باتیں سن کر مجھ جیسی کم عقل عورت قائل نہیں ہوتی کیونکہ میرا تعلق دوسرے قبیلے سے ہے اور میری سوچ بھی اس سوچ سے قطعی علیحدہ ہے۔ اگر ان دونوں فلاسفروں کو عورت مرد کے نازک تعلق کے ریشمی، رنگین پہلوؤں کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تو پھر وہ عقل کل نہیں کہلائے جا سکتے۔ ان کی باتیں ایک مخصوص پس منظر کی وجہ سے منطقی ٹھہرائی جا سکتی ہیں مگر اس سے علیحدہ کر کے دیکھیں تو تصویر کے بغیر کا فریم لگتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اس زمانے میں یونان علم و ادب، فلسفہ و فکر کا گہوارہ مانا جاتا تھا۔ یونانی فلسفی دنیا بھر میں اپنی دانشوری اور اعلیٰ فہم کی وجہ سے قابل احترام سمجھے جاتے تھے جبکہ ان کی عورتیں غیر تعلیم یافتہ، ذہنی اور جسمانی نشوونما کے مواقع نہ ملنے کے باعث پسماندہ تھیں۔ ان کے مرد انہیں علمی تہذیبی، روایتی اعتبار سے کم تر مخلوق سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے Intellect کے حوالے سے ہمیشہ اپنی ہی جنس کو ہم پلہ، بہتر اور برتر سمجھا، اپنی ہی جنس کی محبت میں گرفتار رہے اور اسی سے تعلق قائم کرنے میں راحت محسوس کی۔ جو لوگ اللہ کی مہربانی کی وجہ سے پورے مرد یا پوری عورت ہوتے ہیں، شاید آدھے ہونے کے آزار کا مکمل طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے مگر اتنا احساس ضرور کر سکتے ہیں کہ" تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے" یہ بیچ میں معلق لوگ برس ہا برس تک دکھ کا تکلیف دہ دوزخ پار کرنے کی سعی میں کبھی گرتے، کبھی اٹھتے اور پھر دوبارہ چلنے کی کوشش میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی پہچان، اپنی آگہی کو کتنا فار گرانٹڈ لیتے ہیں اور اپنے اس اطمینان پہ شکر گزار بھی نہیں ہوتے۔ اس سے محروم لوگ آگ کے دائرے میں محصور ہو کر اپنی تمام زندگی خوف اور کرب میں گزار دیتے ہیں۔ یہ اپنے نام کی چٹ اپنے ہاتھوں میں تھامے در در پہ دستک دے کر اپنا پتہ پوچھتے ہیں اور راہ میں ملنے والے ہر آئینے سے سوال

کرتے ہیں کہ "بتا میرا اصلی چہرہ کہاں اور کونسا ہے؟"

اس سے چند سال بعد پھر امریکہ گئی تو افتی سے ملاقات ہوئی۔ گو ہم کئی سالوں بعد مل رہے تھے مگر افتی مجھے اسی اپنائیت اور گرم جوشی سے ملا جیسے پہلی بار ملا تھا۔ میں نے اسے باتوں باتوں میں بتا دیا کہ میں پہلی بار اس کے ساتھ باہر جانے پر جھجک رہی تھی تو وہ یہ سن کر بہت محظوظ ہوا۔ زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "میں بھی تو لڑکی ہوں۔ میں تو تم سے بالکل نہیں ڈرا۔" یہ سن کر میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور وہ میری گوڑھی سہیلی بن گیا۔ ایسی سہیلی جس سے آپ ہر بات بلا جھجک کہہ سکتے ہیں جو آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہے۔ آپ کو آپ کے محبوب سے چوری چوری ملانے بھی لے جاتی ہے۔ آپ کو جانچتی پرکھتی نہیں، وہ مجھ سے مل کر یوں خوش ہو رہا تھا جیسے میں اس کی وہ چھوٹی بہنا ہوں جو ساون کے جھولے پڑنے پر میکے گھر لوٹ آئی ہو، افتی جب مجھے گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے جا رہا تھا تو میں نے دیکھا، ہم جس گلی محلے، سے گزرے کانوں میں حسب معمولی ہیلو افتی، ہائے افتی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا سارا شہر ہی اس کا واقف کار اور دوست ہے۔ وہ بھی ان کے جواب میں ہاتھ ہلاتا، مسکراتا فلائنگ کس اچھالتا نظر آتا تھا۔ افتی شکاگو میں رچ بس گیا ہے، شکاگو افتی میں۔

ہم گھر پہنچے تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی سمائی ہوئی ہے۔ اس کے زوردار قہقہے بلند ہو کر ایک دم سے پھسپھسے ہو جاتے۔ وہ دوبارہ نئے سرے سے ہنسنا شروع کر دیتا۔ اس نے ایک سگھڑ عورت کی طرح میرے لیے دال چاول پکائے۔ اپنی بلیوں کو کھانا کھلایا اور پھر نہ جانے کون سا بھاگتا ہوا لمحہ تھا جس نے افتی کو اپنی مٹھی میں ایک دم قید کر لیا اور افتی پھٹ پڑا "آج صبح فیصل آباد میں میرے بڑے بھائی جان کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"ہائیں! یہ کیا...... اتنی بڑی بات اور آپ نے مجھ سے ذکر تک نہ کیا۔ آئی ایم سو سوری!" میں افسوس کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگی۔ "پھر تو آج آپ کو مجھے لینے کے لیے نہیں آنا چاہیے تھا۔ شاید آپ اکیلا رہنا پسند کرتے۔" میں شرمندہ سی ہونے لگی۔ آج اتنا بڑا سانحہ ہو گیا تھا اور وہ مجھے پھر بھی لینے اتنی لمبی ڈرائیو کر کے آ گیا تھا۔

"لو بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ شام تک رہو گی، شام کو پارٹی کریں گے۔ خوب ہلا گلا ہو گا، مزا رہے گا۔ دل بہل جائے گا۔" وہ شوخی سے بولا۔

کیسی باتیں کر رہا تھا وہ؟ میں حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ سمجھ گیا اور آہستہ آہستہ

کہنے لگا''تم سمجھ رہی ہوگی شاید میں بے حس ہوں۔ اپنے بھائی کی موت والے دن پارٹی کر رہا ہوں۔''اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔''دراصل اب میرا بھائی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بیس برس سے اس کے اور میرے درمیان سوائے نفرت کے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنی زندگی سے نفی کر دیا تھا۔ میں نے بار بار ہاتھ بڑھایا، معاملات ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ہر بار میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ مجھے کبھی سمجھنے اور قبول لنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بچپن میں جسمانی اور اب ذہنی مار مار کے مجھے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ مجھے کیا فرق پڑا۔ چلے گئے تو چلے گئے۔ انہوں نے تو وقت سے پہلے ہی نفرت کا کفن پہن لیا تھا۔ چونکہ میں ان کی مرضی کی زندگی نہیں گزار سکا تھا اس لیے میرا وجود ان کے لیے نہ ہونے کے برابر تھا۔ اب تو وہ میرے لیے بھی Exist نہیں کرتے تھے۔ سو حساب برابر۔''افق ظاہری لاتعلقی سے بولتا چلا گیا مگر میں دیکھ رہی تھی، اس کے دل پر لگے ہوئے بڑے سے پھٹ کیسا سرخ سرخ خون رس رہا ہے اور اس کا تن من کتنا لیر و لیر ہے۔ لہولہان روح والے لوگوں نے کیسے کیسے روگ پال رکھے ہیں۔

اس روز میرا افق کی پارٹی اٹینڈ کرنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا مگر اس نے محبت سے اتنا اصرار کیا کہ میں مجبور ہوگئی۔ سوچا گھر سے میلہ دیکھنے ہی تو نکلی تھی۔ اب میلہ خود قریب آ رہا ہے تو بھاگ کر کہاں جاؤں گی، ویسے بھی افق کی محبت انسان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ شام ہوتے ہی سب سے پہلے ایک پیارا سا، صاف ستھرا اُجلا نوجوان مختار آیا۔ اسے دیکھتے ہی یوں لگا جیسے ابھی ابھی کسی بڑھیا واشنگ پاؤڈر سے دھل دھلا کر مشین سے باہر نکلا ہو۔ وہ گھر سے پارٹی کے لیے کچھ کباب لایا تھا جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائے تھے۔ اتنا سگھڑ لڑکا مجھے وہ بہت سویٹ لگا اور میں نے اس سے بات چیت شروع کر دی۔ اس نے بتایا کہ وہ کراچی کا رہنے والا ہے اور اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ شکاگو میں ہی رہتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر خاندان کو سپورٹ کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اس سعادت مند جوان رعنا، صالح کردار کو مل کر میں نے دل ہی دل میں سوچا، یہ داماد منیر یل ہے۔ بیٹیوں کے لیے ایسے وضع دار شریک حیات مل جائیں تو ماؤں کے لیے کتنی آسانی ہو جائے۔

کچھ ہی دیر میں پارٹی میں شریک ہونے والے مہمانوں نے آنا شروع کر دیا۔ افق کی خاص سہیلی انڈین لڑکی سیلی بھی آئی جس سے میں پہلے بھی مل چکی تھی۔ بمبئی کا رہنے والا ویرو آیا تو سب لڑکے بالے ماں ماں پکار کر اس کے سینے سے جا چمٹے۔ ماں نے بھی بچوں سے باری باری ان

کا حال پوچھا اور پھر سنجیدگی سے ایک طرف بیٹھ کر پارٹی کا جائزہ لینے لگی، کچھ گورے امریکن گے مہمان بھی آ چکے تھے جس سے محفل میں ایک تنوع سا پیدا ہو گیا۔ میرے اور سیلی کے سوا وہاں کوئی (پیدائشی طور پہ) عورت موجود نہیں تھی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے اچھے بھلے مناسب طور پر مرد لگنے والے چند حضرات کا مینامورفوسس ہونے لگا اور ان کی ' جون بدلنے لگی، دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کئی عورتیں نمودار ہو گئیں۔ نیک طینت، آئیڈیل داماد ٹائپ لڑکے نے ایک دوسرے سے بے باکانہ اظہار محبت کرنا شروع کر دیا اور ساری محفل ایک دوسرے سے گھلنے ملنے لگی۔ میری حالت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ میرے اندر کی مشرقی ملانی بیگم کھٹ سے باہر نکل آئی اور سارا ماڈرن ازم پھر سے اڑ کر کہیں چلا گیا "یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟" دل سے آواز آئی اور میں نے ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ کہاں آ گئی تھی میں۔

"لڑکی جا کر اپنے فرینڈ کو اٹینڈ کرو۔ دیکھو وہ کہیں اگنور نہ محسوس کرے۔" افتخار نے مختار کو ٹھوکا دیا اور مختار کبابوں بھری پلیٹ لے کر اپنے گورے امریکن محبوب کے قریب جا کھڑا ہوا اور لاڈ سے اسے کباب پیش کیے۔

"اگر مختار کے گھر والوں نے اس کی کسی لڑکی کے ساتھ شادی کر دی تو!" میں نے کچھ تشویش سے افی سے پوچھا۔

"وہ نہیں کریں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔" افی نے تحمل سے جواب دیا۔

"لیکن نیلم جی میری ماں مجھے شادی پہ بہت مجبور کر رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ کبھی لاہور کے آوارگی میں آپ کو میرے ولیمے پہ آنا ہی پڑ جائے۔" حامد عرف نیناں نے پوری سچائی کے ساتھ مجھے بتایا "نیناں زنانہ کپڑے پہن کر بالکل لڑکی لگتا ہے اور اس قدر خوبصورت ڈانس کرتا ہے کہ دیکھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔" "اور تمہارا ساتھی؟" میں نے حامد سے پوچھا۔ "یہ پورا مرد ہے اور شادی بھی کرے گا۔" حامد نے اپنے سلونے سے جوان پاکستانی ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا کریں ہمارے معاشرے کی مجبوریاں ہیں نا۔ شادی تو پھر کرنی ہی پڑتی ہے۔"

حامد نے کہہ کر دکھ سے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور مجھے اس پورے مرد پہ شدید غصہ آنے لگا جو پاکستان جا کر کسی معصوم لڑکی سے بڑی دھوم دھام سے شادی کرے گا اور اسے برباد کرے گا کیونکہ اپنی سابقہ زندگی بھی برقرار رکھے گا۔ ایسے لوگوں کی بیویاں تمام عمر دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روتی ہیں اور ان کی زندگی ضائع ہو جاتی ہے۔ افی کہتا ہے اسی لیے میں نے کسی سے

شادی کا ڈھکوسلا نہیں کیا کیونکہ میں کسی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اس پہ ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

پارٹی کے مہمان ایک دوسرے سے البیلی چنچل لڑکیوں کے سے انداز میں چھیڑ چھاڑ کرنے لگے اور زنانہ موضوعات مثلاً میک اپ، جیولری، کپڑے، سٹوروں کی سیلز، خاوندوں بوائے فرینڈز کی شکایات، چغلیاں سنائی دینے لگیں۔ میرے چودہ طبق روشن ہوئے جا رہے تھے۔ آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ کراچی کے ہی ایک دوسرے نوجوان فہیم سے مل کر مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی کھوئے ہوئے بچے سے بات کر رہی ہوں۔ وہ امریکہ میں اپنی مرضی کی گے لائف گزار رہا تھا اور اس پہ مطمئن نظر آتا تھا۔ بات بات پہ کندھے اُچکا کر بے نیازی سے جواب دینے والے سے جب میں نے اس کی فیملی کے بارے میں پوچھا تو یکا یک اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا'' کراچی میں ماں ہے۔ کئی سال سے میں گیا نہیں۔ شاید وہ مجھے یاد کرتی ہوں گی۔'' اس کی آنکھوں میں تیرتی سرمئی اداسی اور بجھی ہوئی شمعوں کا نم دھواں میری آنکھوں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ اس تیسری جنس کے لوگوں نے اپنی فیملیاں چھوڑ کر اب نئی فیملیاں بنالی ہیں۔ پرانے چراغوں کی جگہ نئے چراغ لے لیے ہیں۔ کولمبس نے نئی دنیا دریافت کر لی ہے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاکان چمن آن ملے اور ایک ہو گئے ہیں۔

کچھ ہی دیر میں افق کا شریک حیات پریم بھی آ گیا۔ ''میرے ہزبینڈ سے ملو'' افق نے اس کا مجھ سے تعارف کرایا۔ میں نے ہیلو کہا اور پریم نے بھی مسکرا کر مجھے جواب دیا۔ شام ڈھلے پیا کے گھر سے آنے افق کے چہرے پہ انتظار کی جگہ اطمینان کی روشنی پھیلنے لگی۔

'' کی حال اے گڈو؟'' پریم نے اپنی بیوی افق کو لاڈ سے بلایا تو گڈو جھوم جھوم گئی۔ افق کی نسبت ہر لحاظ سے مختلف دکھنے والا پریم مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ دبلا پتلا مختصر جسامت رکھنے والا ہے۔ افق کا جثہ بھرا بھرا ہے۔ شخصیت کے اعتبار سے بھی دونوں میں زمین آسمان کا فرق لگتا ہے۔

افق ایک رونقی، مجلسی، اوپر سے رولا مگر اندر سے خالص انٹلیکچوئل سنجیدہ تخلیق کار ہے۔ ٹھیٹ پنجابی بول رہا ہو تو بھی شیکسپیئر کی کوئی خوبصورت لائن اس کے لبوں سے پھولوں کے شگوفوں کی مانند باہر آ گرتی ہے۔ شاعری، نثر، اسلام، فلسفہ حیات دنیا کے حالات و واقعات، تاریخ سبھی موضوع اس کی گرفت میں ہیں۔ آج اس کی شاعری نے اسے نہ صرف یہ کہ امریکہ کی مین سٹریم ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام دلوایا ہے بلکہ'' ہال آف فیم'' میں بھی شامل کروا دیا ہے۔ افق ایک اور ہی عہد اور دنیا کا باسی ہے مگر اس کے شریک حیات پریم سے ملو تو انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا

ہے کیونکہ پریم کا علم و ادب کی دنیا سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔

وہ سیدھا سادھا پنجابی جاٹ آدمی ہے۔ ایسا جاٹ جو سر شام جلدی سے روٹی کھا کر سو جاتا ہے۔ صبح تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو کر کھیتوں کو پانی لگاتا ہے۔ پھر منڈی جا کر مویشیوں کے لیے پٹھے لاتا اور رات کو ٹرینکولائزر لیے بغیر سو جاتا ہے۔ انہیں اس طرح پیار سے رہتے دیکھ کر میں سوچتی رہی۔ آخر ان دونوں میں ایسی کون سی سانجھ ہے جس کی وجہ سے یہ ایک ڈور میں بندھے ہوئے ہیں یا شاید سانجھ بغیر بھی ایک دوسرے کو قبولنا ممکن ہوتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہر محبت میں کوئی نہ کوئی لاجک بھی ہو۔ میں کیا جانوں؟ صحرا کو کیا پتہ کہ آسمان سے نیچے گرتے بارش کے دو بھرپور قطرے آپس میں کیا مکالمہ کرتے ہیں؟ کیا سانجھ ہوتی ہے ان دونوں میں؟ کیا لگتے ہیں وہ ایک دوسرے کے؟

پارٹی کافی رنگین ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی کرسی اٹھائی اور بالکنی کے بالکل کونے پہ سیٹ کر لی۔ سیلی ہنستے ہوئے میرے قریب آئی اور پوچھنے لگی "کیا تم نے کبھی کوئی گے پارٹی اٹینڈ نہیں کی جو یوں بوکھلائی ہوئی نظر آ رہی ہو۔" میں اسے کیا جواب دیتی کہ اللہ کی بندی میں پاکستان میں رہتی ہوں۔ وہاں چھپ چھپا کر شاید کہیں ہوتی ہو تو ہو مگر سرعام یوں کھلم کھلا گے پارٹی ہونے کا بھلا کہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔

"تمہیں یہ گے لوگ کیسے لگے؟ اچھے ہیں نا۔" اس نے مجھ سے صاف سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دے دیا۔

پل بھر کو میں سوچ میں پڑ گئی۔ یہ لوگ کیسے تھے۔ عجیب تھے۔ مختلف تھے مگر برے تو واقعی نہیں تھے۔ بہت محبت بھرے تھے۔

"کیا پیو گی؟" سیلی نے رنگ برنگے مشروب بھری بوتلوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"سیلی یہ نہیں پیئے گی۔ یہ پینڈو لڑکی ہے۔ نہ جانے کس امریکہ میں اتنے سال گزار کے گئی ہے۔" افتی ہنس کر بولا۔ "اسے دیکھ کر تو لگتا ہے، یہ کبھی کاموکی سے آگے بھی نہیں گئی ہے۔ البتہ کہانیاں بہت بولڈ لکھتی ہے۔"

میں نے سیون اپ کی پارسا بوتل اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ اور نیچے بہنے والی جھیل لیک مشی گن کو غور سے تکنے لگی۔ رات کے سمے پانی کتنا سیاہ ہو گیا تھا۔ میرے بالکل نیچے ہی تو بہہ رہی تھی وہ ساحرہ جھیل، میں یکدم اداس ہو گئی۔ میں گھر سے کتنی دور آ گئی تھی۔ جاد جیسے راوی نہ کوئی

آ وی نہ جاوی۔ شاید راوی بھی اس جھیل میں کہیں گھل گیا تھا۔ میں کہاں تھی؟ میرا ملک کہاں تھا؟ کون سا تھا؟ شاید اس جھیل کے دوسرے پار تھا، پتہ نہیں ایسا لگا جیسے میرے اور میرے ملک پاکستان کے بیچ جدائی کا وسیع قلزم حائل ہے جسے میں کبھی پاٹ نہ سکوں گی۔ میں راوی پار اترنا چاہتی تھی۔ اپنے اپنوں سے ملنا چاہتی تھی۔ میں بھی عجیب ہوں۔ جب پاکستان میں ہوتی ہوں تو امریکہ میں اپنوں کو مس کرنے لگتی ہوں اور جب امریکہ میں ہوتی ہوں تو پاکستان بے طرح یاد آنے لگتا ہے۔ تاحدِ نظر کالے پانی کو دیکھ کر میں نے افق سے کہا ''مجھے اس پانی سے ڈر لگ رہا ہے۔''

''اچھا میں تو اس جھیل کے ساتھ ہی ہر وقت رہتا ہوں۔ مجھے تو اس سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ میں تو وصیت کر کے جاؤں گا کہ مجھے مرنے کے بعد اسی جھیل میں پھینک دیا جائے تاکہ میں مچھلیوں کا پیٹ بھرنے کے کام آؤں۔ اگر ایسا نہیں کیا جا سکتا تو مجھے مرنے کے بعد ایک کھڑی قبر میں دفن کیا جائے تاکہ جب میرے دشمن میرے قریب آئیں تو میں انہیں ہاؤ کہہ کر ڈرا دوں۔''

''اللہ خیر کرے۔ ابھی آپ کے مرنے کی عمر ہی کہاں ہے؟'' میں نے اسے ٹوک دیا۔

''میں جلدی مر جاؤں گا کیونکہ گے لوگ فاسٹ لائف گزارتے ہیں اور تمہیں پتہ ہے نا Speed kills۔ بہرحال مجھے کوئی پچھتاوا نہیں کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو بھرپور انداز میں انجوائے کیا ہے۔ سو میں تیار ہوں۔''

اسی لمحے افق کے بیڈروم میں رکھی پلاسٹک کی سبز اور سنہری مسجد کے ماڈل سے ٹیپ شدہ اذان کی آواز بلند ہوئی ''اللہ اکبر'' افق سنجیدگی سے کہنے لگا ''اذان کی آواز مجھے اپنے فیصل آباد کی مسجد کی یاد دلاتی ہے۔ جہاں میں اس طرح کی سوچ رکھنے پہ احساس جرم میں گرفتار ساری ساری رات چلے کاٹتا، وظیفے پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے خدا سے کتنی دعا مانگی تھی کہ مجھے بھی اوروں کی طرح کا بنا دے مگر..... خیر اس کی مرضی۔'' افق خیالوں ہی خیالوں میں کسی پرانی صدی اور کسی پرانے بھولے بسرے نگر جا پہنچا تھا جو شاید اب اس کے لیے ایک خواب سے زیادہ کچھ نہیں تھا مگر خواب بھی آسانی سے کہاں بھلائے جاتے ہیں۔ ناسٹلجیا کا ظالم جن اسے پٹخنیاں دے رہا تھا، فون کی گھنٹی بجنے پہ افق اٹھا اور اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا کسی سے جھگڑا ہو رہا تھا۔

"Leave my husband alone." افق نے جھنجھلا کر کہا اور فون بند کر دیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''فلاں فلاں میرا گھر اجاڑ نا چاہتا (چاہتی) ہے۔ میرے میاں کے پیچھے پڑا (پڑی) ہوا ہے۔ میں نے اسے دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے میری بسی بسائی زندگی خراب کی تو میں بھی اس کی بیوی کو فون کر کے سب کچھ بتادوں گا۔'' میرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ناچنے لگی۔

''عورتوں کو بھی کیا کیا مصیبتیں ہوتی ہیں۔ اپنے مرد کو کسی ولر یا سوتنیا، ہیرنیا سے بچانے کے لیے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے ہیں۔''

افق کا گھر شکاگو میں آج ایک دیسی ادبی ثقافتی گڑھ، ایک کھلے دروازے والے گیسٹ ہاؤس کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ پاک و ہند سے آنے والے بیشتر شاعر، ادیب، گلوکار، موسیقار اور تخلیقی مزاج رکھنے والے لوگ افق کے گھر پہ دستک ضرور دیتے ہیں۔ پھر کوئی شعر و ادب کی محفل سجتی ہے، رقص و موسیقی کی بیٹھک جمتی ہے اور افق شوقین میلے دی، بن کر خوب محفل سجاتا ہے۔ ہنستا ہنساتا کھلاتا پلاتا ہے۔ اس کی زندگی میں ہر وقت ایک ہنگامہ سا بپا رہتا ہے کیونکہ وہ خود متحرک ہے۔ اس کی زندگی تحرکی ہے اور اس حرکت سے ہی اس کی تخلیق کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔

نیو یارک سٹی کے مقبول عام، مشہور زمانہ گرین وچ ولیج کے علاقے میں جہاں زیادہ تر فنکار، ادیب برادری رہتی ہے۔ افق میک اپ کیے، جیولری پہنے، شوخ کپڑوں میں ملبوس جب چھم چھم کر کے چلتا ہے تو نیو یارکرائے مڑ مڑ کر دیکھتے اور مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہیں۔ اس کی پھبن دیکھ کر چلنے والے رک جاتے ہیں تو افق خوش ہو جاتا ہے اور آج افق واقعی خوش ہے کیونکہ اس نے اپنے آزار سے کافی حد تک آزادی حاصل کر لی ہے۔ احساسِ جرم کا کوئی سیاہ بادل اب اس کے سر پہ نہیں منڈلاتا۔ وہ شکاگو میں اپنی مرضی کی زندگی گزار رہا ہے اور گے موومنٹ کا بہت بڑا Activist بن چکا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں مگر اسے اب کسی کے اپروول کی حاجت نہیں۔ کوئی اسے گنہگار سمجھتا ہے تو کوئی دیوانہ۔ میں اسے ذاتی طور پر ایک بہادر اور جرأت مند انسان سمجھتی ہوں جو اپنے سچ کے ساتھ اپنے بل بوتے پہ جی رہا ہے اور منافق نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا منافقوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک پولش کہاوت ہے کہ دنیا اس شخص کو کبھی معاف نہیں کر سکتی جس نے کبھی کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اسی لیے دنیا نے بھی افق کو کبھی معاف نہیں کیا اور نہ ہی کرے گی کیونکہ اپنی اصلیت اور حقیقت کا پردہ چاک کر کے زندگی کرنا اور محض انسان ہونے کی کوشش کرنا بھی تو ایک جرم ہے۔

---------O---------

ابا پیا

26 دسمبر 2004ء کو ملک کے نامور ادیب، صحافی، دانشور احمد بشیر انتقال کر گئے۔ وہ میرے ابا تھے مگر ابا اور اماں بھلا کہاں مرا کرتے ہیں؟ وہ تو اپنی اولاد میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ انہیں مرنا چاہیے بھی نہیں کہ ان کی ضرورت زندگی کی ہر منزل پر پڑ سکتی ہے اور پڑتی رہتی ہے۔ میرا بس چلے تو دنیا بھر کے والدین کو مرنے کے حق سے سراسر محروم کر دوں اور ہمیشہ زندہ رکھوں تا کہ اپنے بچوں کے آس پاس رہیں اور کاروبار حیات باسہولت چلتا رہے۔

میں، احمد بشیر کے نام سے جڑی ان کی بیٹی اور ایک معمولی قلم کار، جب اپنی پہلی کتاب "گلابوں والی گلی" کا انتساب لکھنے بیٹھی تو حرف میرے قلم سے خود بخود یوں پھوٹنے لگے۔

میرے ابا اکثر یہ گنگنایا کرتے ہیں:

آس پاس کوئی گاؤں نہ دریا

اور بدریا چھائی ہے

اپنے گاؤں اور دریا..... اپنے ابا اور امی کے نام!

اس وقت میں ایک طویل مدت گزار کے، نئی نئی ایک ٹھنڈے پردیس سے اڑ کر آئی تھی۔ جلدی جلدی پروں پہ جمی برف جھاڑی اور یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی کہ اماں، ابا کی محبت کا ہرا بھرا جہان میرے لیے بازو کھولے، زندگی سے دھڑکتا تھا۔ ابا میرا وہ گاؤں تھے جہاں ایک بار لوٹ کے ضرور آنا ہوتا ہے۔

ان کے گھٹنے سے لگ کر میں نے آنے والی زندگی کے بہت سے برس بتا دیے اور وقت گزارنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ اُس گاؤں کی چوپال میں بیٹھ کر جب علم و ہنر کے موتی چنتی، عقل

ودانش پہ سرد ختی تو احساس ہوتا میں کتنی تہی دامن اور ضرورت مند تھی اور ابا کتنے مالا مال۔ ان کے پاس ہر سوال کا جواب اور ہر آنسو کے لیے مرہم تھا۔ وہ کتنے سمجھدار، شفیق اور نرم دل باپ تھے۔ یہ ان کی اولاد ہی جانتی ہے۔

آج ابا ہم سے بچھڑ گئے ہیں تو لگتا ہے جیسے زمین قدموں تلے سے کھسک گئی ہے۔ ان کے بچے ہوا میں معلق ہو کر ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں کہ ابا پیا کا گاؤں دور ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اب ان کی مسافتیں لمبی، سانس کمزور اور لمحے گنے چنے ہیں۔ ابا کی نئی خوابگاہ شہر کے بیچوں بیچ ایک لائبریری کے بالکل سامنے ہے جہاں وہ سوتے میں بھی کتابوں کا قرب پا کر مسکراتے رہیں گے کہ کتابیں انہیں اولاد سے بھی زیادہ عزیز تھیں۔ ان کا اثاثہ تھیں، ایسا اثاثہ جس پر انہیں بہت ناز تھا۔

وہ کئی برسوں سے کینسر جیسے مرض میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس بیماری میں عام طور پر انسان اٹھارہ ماہ سے زیادہ جی نہیں پاتا مگر ابا ضعیف العمر ہونے کے باوجود برسوں اس اذیت ناک بیماری سے نبرد آزما رہے۔ مقابلہ ان کے جسم ناتواں نے خوب کیا مگر پھر ایک شام ایسی آئی کہ ان کی جسمانی تکالیف کو دیکھتے ہوئے گھر والوں نے انہیں ہسپتال داخل کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب ہم انہیں کرسی پہ بٹھا کر گاڑی تک لے جا رہے تھے تو وہ گھر کے درودیوار کو عجیب وغریب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں پتہ تھا کہ وہ دوبارہ اس گھر میں کھلی آنکھوں اور قائم حواس سے واپس نہیں آئیں گے۔ ان کے لبوں پہ ایک پھیکی، بے یقین سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ انہوں نے جب نوکروں اور بچوں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا تو سب گھر والے اداس ہو گئے اور ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اچانک اسی لمحے وہ گھر کے مکین نہیں بلکہ مہمان سے محسوس ہونے لگے تھے۔

ابا سروسز ہسپتال کے ایک بالائی وارڈ کے کمرہ نمبر 3 میں داخل کر دیے گئے تو اہل خانہ نے وہیں خیمے گاڑ دیے۔ شمعیں جل اٹھیں اور ان کے گرد طواف محبت شروع ہو گیا۔ گوپیاں اپنے کرشن کے اردگرد عقیدت کے پھول سجانے لگیں اور کمرہ ایک مقدس مندر کی طرح محبت سے مہکنے لگا۔ ان کے گرد طواف کرنے والوں میں ابا کا چھوٹا داماد عباس ہاتھ میں علم تھامے "Knight in shining armour" کی طرح سب سے آگے چکر لگاتا تھا کہ ابا اور وہ ایک گھر میں رہتے رہتے سسر داماد سے زیادہ ہم خیال دوست بن چکے تھے۔ ان کا تعلق دل کا تھا، مجبوریوں کا نہیں۔

عباس نے اپنے انوکھے سسر کو ہمیشہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھا۔ اس لیے اس سے زیادہ ابا

کی صحت اور خیریت کی فکر کیسے ہو سکتی تھی؟ اس نے ابا کی ہمیشہ ایسی ہی خدمت اور کیئر کی جیسے کوئی مرشد اپنے پیر اور عاشق اپنے محبوب کی کرتا ہے۔ ابا لاڈلے، ضدی، منہ پھٹ، خود سر اور من مانی کرنے والے آدمی تھے مگر عباس بڑا گنی آدمی ہے۔ اس نے ان کو ان کی طبیعت کے مطابق سمجھا اور پنپنے دیا تا کہ احمد بشیر سانس لیتا رہے اور کسی قسم کی گھٹن محسوس نہ کرے۔ وہ ابا کی ڈانٹ بھی کھا لیتا تھا اور ان کے سینے پہ سر رکھ کر اپنی بات بھی منوا لیا کرتا تھا۔ ابا خوش نصیب تھے کہ انہیں وہ مل گیا کہ اس جیسا بیٹا نما داماد کسی کو بھی بڑھاپے میں نصیب ہو جائے تو اس کا گور میں اترنا آسان ہو جاتا ہے۔ عباس انڈین فلموں کا ''میں ہوں نا'' کہنے والا وہ کردار ہے جس کے ہونے سے ہر ایک کو تسلی رہتی ہے۔ اس نے ابا کے افکار و عقائد کو چوم چاٹ کر سینے سے لگایا اور ان کی تعظیم کی۔ ان پر اپنے اصول، اپنے قانون لاگو نہیں کیے اور اسی لیے عباس کی محبت ابا کے دل کے تالاب میں ہمیشہ کنول کی طرح کھلی رہی۔

کہنے کو ابا اسی برس جیے لیکن اتنے سارے برس کیسے گزر گئے؟ پتا بھی نہیں چلا۔ ہم نے تو انہیں بڑے آرام سے سائبان کی طرح اوڑھ رکھا تھا اور یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ ایسی کوئی آندھی نہیں آ سکتی جو ہمیں احساسِ تحفظ سے محروم کر دے۔ موسموں کی سختی پر چھوڑ دے مگر ہوا کے ایک ہی جھونکے سے دیا بجھ گیا اور اندھیرا ہمارے چاروں طرف اترنا شروع ہو گیا۔ اُن جیسے غیر معمولی طور پر ذہین، فطین، قابل، عالم، بے خوف، زندگی کے بارے میں منفرد اپروچ رکھنے والے آدمی کے لیے اسی برس کیا ہوتے ہیں؟ مگر جب وقت کا گھڑیال بجا تو اوروں کی طرح انہیں بھی اٹھ کر جانا ہی پڑا اور ہم لاوارث رہ گئے۔

احمد بشیر کے بچوں نے جس گھر میں پرورش پائی، اس میں سونے چاندی اور دولت کی ریل پیل تھی۔ ابا ادیب تھے، فنونِ لطیفہ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اس لیے گھر میں ادب کے سنہرے چمکیلے پہاڑ کھڑے تھے۔ موسیقی کی چاندی کی چکاچوند تھی۔ آرٹ، ثقافت، ٹیلنٹ کے دریا گھر میں ہی بہہ رہے تھے۔ اس حوالے سے ہم نے ایک انتہائی رچ اور مزیدار بچپن گزارا۔

ابا بچپن میں ہم پر بہت ظلم ڈھایا کرتے تھے۔ اپنی بیٹیوں کو ہر وقت پیار محبت میں لتھیڑے رکھنا، لبرل ماحول میں تربیت کرنا، خود اعتمادی بخشنا، ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ جب ہم ابا کے گھر سے دوسرے گھروں کو گئیں تو پیار محبت اور قبولیت کی توقعات نے بھی ہمارے ساتھ سفر کیا۔ ہم سمجھ بیٹھی تھیں کہ ہم شاید ہیں ہی اتنے پیار اور اعتماد کے قابل مگر آگے جا کر جب خواب ٹوٹے،

شخصیتیں پھور پھور ہوئیں، تنقید کا سامنا کرنا پڑا تو بہت حیرت ہوئی۔

ابا کو کیا بتاتے؟ ہمارے ظالم باپ نے اپنی بہن، بیٹیوں کو نہ پتھریلی راہوں پہ چلنے کی تدبیر سکھائی نہ پر پیچ گھاٹیوں میں اترنے کا گر بتایا۔ جب ہم اپنی قسمت کے نئے مالکوں کے حوالے کی گئیں تو انہوں نے ہماری توقعات کا تخمہ اڑایا۔ ابا کو ہمیں خبردار کر دینا چاہیے تھا کہ عورتو! زندگی میں آگے جا کر بلاشرط قبولیت، پیار پانے اور اس میں جینے مرنے کی خُو نہ ڈالنا ورنہ پتھر کی بنا دی جاؤ گی۔ اس دہلیز کو پار کرو گی تو پیار کا گاؤں سپنا بن کر کہیں پیچھے رہ جائے گا۔ سامنے صحرا ہو گا اور آبلہ پائی سے بچنے کا سلیقہ بھی تمہیں خود ہی سیکھنا ہو گا۔

ابا کی اپنی زندگی ایک ولولہ، ایک زلزلہ، ایک ایڈونچر تھی۔ وہ جو چاہتے کر گزرتے اور دلیری سے کرتے۔ مصلحتوں کے برعکس چلنا، زندگی کی آخری سانس تک اپنے عقائد پہ ڈٹے رہنا کون نارمل آدمی افورڈ کر سکتا ہے مگر ابا نے کیا اور ڈنکے کی چوٹ پہ کیا۔ کبھی اس پر معذرتانہ رویہ اختیار نہ کیا۔ مجھ جیسے چھوٹے لوگ زندگی بھر منافقتوں، مصلحتوں اور اغراض کی بندشوں میں جکڑے کسی قیدی کی مانند، ڈرے سہمے، محتاط قدم رکھتے چلتے ہیں۔ یہی خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے مگر ابا نڈر آدمی تھے۔ انہیں ممتاز مفتی کی طرف سے سو واٹ؟ (so what) کی گڑھتی ملی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے زندگی کرتے اور خوب بولتے کہ لب آزاد تھے ان کے اور ایسی جرأت آمیز آزادی تو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

ابا ہم سب بیٹیوں اور دیگر اہل خانہ کی شخصیات میں پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت ہم میں یوں گھل کر اتر چکی ہے جیسے چائے میں چینی۔ کئی بار جب میں عینک لگا کر سنجیدگی سے کچھ پڑھ رہی ہوتی ہوں تو میرے بچے کہہ دیتے ہیں: ''بالکل بڑے ابا لگ رہی ہیں۔'' بشریٰ جب کسی کو قائل کرنے کے لیے پرجوش انداز میں دلیلیں دینے لگتی ہے تو سنبل یہ کہہ کر ہنسا دیتی ہے کہ ''بس کریں، بشیر صاحب۔'' عباس جب ٹی وی پہ مستقلاً خبریں ہی دیکھتا چلا جاتا ہے تو مانو کہہ دیتی ہے: ''بالکل ابا ہی بنتا جا رہا ہے۔''

ابا ہماری زندگیوں کے مرکز اور ہماری فیملی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ہم سب میں اگر کسی ٹیلنٹ کی کوئی بھی پر جمال رنگین پچکاری نظر آتی ہے تو وہ انہی کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے فنون لطیفہ کی قدر کی اور ہمیں زندگی میں برتنے کا ذوق بخشا جو زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ امی کو ایک سیدھی سادی گھریلو بیوی ہونے کے باوجود کلاسیکی موسیقی کی تعلیم

دلوانا، بہن پروین کی تحریروں کو سراہنا اور مزید لکھنے کی تلقین کرنا، بشریٰ کے فن کی پذیرائی کرنا، بیٹیوں کو محاذِ زندگی پہ بہادری سے ڈٹے رہنے کی تربیت کرنا انہی کا کام تھا۔ ابا نے ہمیں عورتیں سمجھ کر کمتر سمجھا نہ محکوم ورنہ جس معاشرے میں ہم سانس لیتی ہیں اس میں کوئی مائی کا لال عورت کو اس کی ہستی اور ٹیلنٹ کے اظہار کی اتنے آرام سے اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے ابا نے ہمیں غلطیاں کرنے اور پھر ان سے سیکھ کر زندگی کو بہتر بنانے کا شعور دیا۔ انہوں نے ہمارے اچھے برے فیصلوں میں ہمیں تنہا نہ چھوڑا۔ ہم اپنے اپنے دکھوں کی پوٹلیاں اٹھاتیں اور ان کے پیروں میں جا پھینکتیں۔ ان کے گھٹنے سے لگ کر آنسو بہاتیں کہ وہ دکھ آشنا تھے۔ بچ مثل باپ نہیں تھے۔

ہمارے گھر میں وہی سہاگن تھی جسے ابا چاہتے تھے۔ امی ان کے دل کی رانی مادرِ ملکہ تھیں۔ ان کی خدمتگار ماں اور محبوبہ جس کی زندگی میں ہر طرف ابا ہی ابا چھائے ہوئے تھے۔ بچوں کا نمبر کہیں بعد میں جا کر آتا تھا۔ ہماری ماں کے اندر سب سے زیادہ ممتا اپنے شوہر کے لیے تھی۔ پھوپھو پروین عاطف ابا کی پیاری بچ پھلہ۔ بہن ان کا پہلا پیار تھیں۔ پروین اور ہم سب اتنے جڑے رہے کہ ہم نے انہیں ہمیشہ اپنی پانچویں بہن کی طرح سمجھا اور محسوس کیا۔ ہماری سنگت اور پرلطف رفاقت نے زندگی میں رنگ اور رس بھر دیا اور دنوں کے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ پروین اور ابا دونوں کبھی لڑتے کبھی مننتے اور کبھی چڑتے رہے مگر آپس کے تعلق کو کبھی کمزور نہیں پڑنے دیا۔

ہم، ابا کی بیٹیاں، ایک جیسی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت مختلف بھی ہیں۔ کوئی پہیلی ہے تو کوئی سہیلی ہے۔ اک اکیلی ہے تو اک بجلی ہے اور سب سُریلی ہیں۔ سنبل مسائلِ زیست میں گھری بے بس شہزادی ہمیشہ ابا کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ ابا اپنی اس بچی کو رہائی دلوانے کی خواہش میں دن رات تڑپتے مگر حالات کا دیوا سے پچھاڑ دیتا تو بے بس ہو کر ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ آخری سانس تک انہیں سنبل کے حالات کی یکسانیت نے پریشان رکھا اور اسی فکر میں وہ دوسری دنیا کو روانہ ہو گئے۔

دنیا جہان کی طرح وہ بھی اپنی باصلاحیت ہونہار بیٹی بشریٰ انصاری کے عاشق اور مداح تھے۔ ان دونوں کا ریلیشن شپ آپس میں بہت فرینک اور فری تھا، اس میں کوئی سلوٹیں نہیں تھیں۔ وہ دونوں گھنٹوں گپ لگاتے، ہنستے بولتے، مزے اڑاتے تھے۔ بشریٰ ان کے لیے پام فریٹ مچھلی اور کراچی کی دیگر سوغاتیں لاتی، انہیں اپنے ساتھ واپس لے جاتی، گھر میں رکھتی تو اماں ابا دونوں نہال لوٹتے۔ بشریٰ چونکہ ذرا روحی طبیعت والی ہے، باتیں بھی خوب کرتی ہے۔ اس لیے

ابا اسے پیار سے ''میری طوطی'' کہا کرتے تھے۔ ہمیں ابا سے اپنی کوئی بھی بات کہلوانا ہو، منوانا ہو، کام نکلوانا ہو، ہم بشریٰ کا سہارا لیتے کیونکہ ابا اسے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ کئی بار ہم سب جل کر مذاق میں کہہ دیتے: ''بابا ایکٹریس دیکھ کر پاگل ہو جاتا ہے۔'' تو بشریٰ خوب قہقہے لگاتی کہ اسے پتہ تھا وہ ابا کی دلربا تھی۔ اس طوطے میں ابا جیسے مہادیو کی جان تھی۔

سب سے چھوٹی مانو ساری فیملی کے ساتھ ساتھ ابا کی بھی ماؤں بلی تھی۔ وہ خوبصورت کپڑے، زیور پہن، سج بن کر ابا کے کمرے میں پائل چھنکاتی داخل ہوتی تو ابا مسکرانے لگتے۔ وہ دروازے کے پیچھے سے جھا کر کے انہیں اپنی چھب دکھا کر دیوانہ بنا دیتی۔ وہ اس سوتی جاگتی گڑیا جیسی بیٹی پر بری طرح فریفتہ تھے اور مانو کو بھی ان سے اتنا پیار تھا کہ اس نے شادی کے بعد بھی ان سے علیحدہ ہونا گوارا نہ کیا اور عباس کی رضامندی سے اپنے ماں باپ کو گھر میں ہی رکھ لیا۔ امی ابا اور بنی مانو، داماد عباس ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن چکے تھے۔ ان کے روابط گہرے اور تعلقات خوشگوار رہتے جو سب کے بہت اطمینان کی بات تھی۔

میری حیثیت ابا کے لیے ایک ورکر الا و یا منشی جیسی تھی۔ کوئی دفتری کام پھنسا ہو، بل نکلوانا ہو، کتاب کی اشاعت کے لیے چکر لگانا ہوں، پبلشروں سے مغز ماری کرنا ہوا، فنکشن پہ لے جانا ہو، یہ بندی حاضر رہتی تھی۔ دراصل میں تن تنہا مردانہ وار زندگی گزار لینے کے تجربے کی وجہ سے اس قسم کے کاموں کی اہل سمجھی جاتی ہوں اور میں بخوشی اپنا یہ رول نبھانے کو تیار رہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ They also serve who just stand and wait (خدمت وہ بھی کر رہے ہوتے ہیں جو صرف کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں) میرا درجہ اپنی فیملی میں اب یہی تھا۔

ابا کہتے تھے: ''تم میں خرابی یہ ہے کہ تم اصولی بہت ہو، اصولوں پہ کمپرومائز نہیں کرتیں۔ اس لیے تکلیف میں رہتی ہو۔'' اور میں ان کی اس بات سے اختلاف نہیں کرتی۔ مجھ میں یقیناً اور بھی بہت نقص ہوں گے مگر ابا نے ان کی طرف کبھی توجہ نہیں دلائی۔ بچپن سے لے کر اب تک ایک بری عادت تو یہ ہے کہ میرے ہاتھ سے اکثر برتن گر کے ٹوٹ جاتے ہیں۔ چھوٹی تھی تو گلاس یا پلیٹ چھوٹ جانے پر ابا مجھے شرمندہ کرنے کے بجائے زور زور سے تالی بجانے لگتے۔ یوں جیسے میں نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ گھر میں ہر آنے جانے والے کو بتاتے کہ میری یہ بٹی برتن بہت توڑتی ہے اور پھر ہنسنے لگتے۔ سارا خاندان میری اس نالائقی سے واقف ہے۔

نئی زندگی کے شروع شروع میں جب شریکِ حیات نے مجھے گھر کے بیشتر برتن توڑ

دینے پر سرزنش کی تو میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ وہاں ابا نہیں کوئی اور ہی مرد میری قسمت کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ اسے میری نالائقیوں اور غلطیوں سے قطعاً محبت نہ تھی۔

چار بیٹیوں کے علاوہ ابا کا ایک بیٹا ہمایوں بھی ہے جو ٹھنڈے دیس امریکہ میں رہتا ہے۔ وہ ان کے دل کے آنگن میں چمکنے والا، دور دراز بسنے والا وہ چاند تھا جس کی محبت میں ابا چکور بن کر چپکے چپکے آنسو بہایا کرتے تھے۔ ابا کے گھر چار بیٹیاں پیدا ہوئیں تو لوگوں نے کہا: "ہائے چار بیٹیاں۔" ابا بولے: "خبردار، جو کسی نے کچھ کہا کہا ان کے آنے سے میری گرہستی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔" بیٹا آیا تو لوگوں نے کہا "شکر ہے، لڑکا پیدا ہوا ہے۔" ابا بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ بھاگ بھاگ کر ہمسایوں، رشتہ داروں کو خبر دی کہ میرے ہاں بیٹا آیا ہے۔ خوش تھے کہ لشکارے مارتا ایک اُجلا ستارہ ان کا آسمان منور کرنے چلا آیا ہے۔

ہمایوں کو تمام عمر یہ شکایت رہی کہ اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہ کوئی خصوصی مراعات دیں نہ مقام۔ اس کا خیال تھا اس جیسے راجکمار کو تاج پہنا کر ایک منقش کرسی پر بٹھا دیا جائے گا اور سارا خاندان اس کے آگے مورچھل کرے گا مگر وہاں تو گھر کے حالات ہی کچھ عجیب وغریب تھے۔ مساوات کا دور دورہ تھا۔ تخلیقی سرگرمیوں کی مصروفیت تھی۔ خواتین کی اکثریت واہمیت تھی۔ اماں ابا نے اسے بھی بیٹیوں کے ریوڑ میں ایک اور بچہ سمجھ کر ہانک دیا۔

میں نے زندگی سے ناراض ہونے کے بجائے اپنے طور پر اس سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قلم کو جینے کا بہانہ بنا لیا اور کاغذوں کی دنیا میں، حرفوں کی سنگت میں نئی مسرتیں تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئی۔ کاغذ میرا ساتھ دیتے ہیں، میرے اکیلا ہونے کا احساس مٹا دیتے ہیں۔

ابا کی زندگی کا ڈراما اپنے آخری ایکٹ میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کی یرقان زدہ پیلی اور سرمئی آنکھیں دھندلی سی نظر آتی تھیں۔ یہ وہ آنکھیں تھیں جن سے وہ ہماری طرف بطور باپ رعب سے دیکھتے تو ہم منجمد ہو کر رہ جایا کرتے۔ خون میں زہر پھیل جانے کی وجہ سے کھجلی انہیں بے حال کیے ہوئی تھی۔ منہ میں زخم تھے، اس لیے کھانے پینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ روح جسم کے تکلیف دہ جہنم سے پھڑ پھڑا کر نکلنے کے لیے زور آزمائی کر رہی تھی اور ابا کے گرد چاہتوں اور محبتوں کا میلہ شاید اس کا رستہ روکے کھڑا تھا۔

بیٹے کو اچانک قریب دیکھ کر ابا کی بے جان، زندگی سے عاری آنکھوں سے محبت کے

سوتے پھوٹ نکلے اور انہوں نے اسے خوشی سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ محض چار دن کی مہلت لے کر آئے ہوئے بیٹے کو امریکہ واپس جانا تھا اور ابا کی روانگی کی نہ جانے کون سی گھڑی متعین تھی؟ پیچھے اس کا بال بچہ آسودہ نگر میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سو اسے جانا ہی تھا۔

سوتی جاگتی آنکھوں، ڈوبتی ابھرتی نبضوں، جلتے بجھتے قائم و غائب حواس کے دوران باپ نے بیٹے کا ہاتھ تھام کر کئی بار التجا کی: ''چار دن سے کچھ اوپر رک جاؤ۔'' ان کی آنکھیں کہہ رہی تھی۔ دل ابھی بھرا نہیں۔ ادھوری آس، ادھوری پیاس چھوڑ کر نہ جاؤ۔ رک جاؤ۔ بالآخر ابا کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ان کی آنکھوں سے پیلا پیلا گدلا گدلا جھرنا بہنے لگا۔

جاہ و جلال والے اکبر بادشاہ کو بیٹے کی محبت نے کمزور بنا دیا تھا۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے زندگی تو ہار سکتا تھا مگر اسے کوئی پریشانی نہیں دینا چاہتا تھا۔ ابا بھی جان دینے کو تیار تھے اور اسی میں خوش تھے کہ انہوں نے آنکھیں بند کر لینے سے پہلے ایک آخری بار اس کے سوہنے مکھڑے کو تک لیا ہے۔

ایک رات سب بہنوں کے گھر لوٹ جانے کے بعد ہمایوں نے ابا سے اکیلے میں سوال کیا: ''آپ کو، اپنی اولاد میں سے، سب سے زیادہ کس سے پیار ہے؟''

''تم سے، میرے بیٹے!'' احساسِ جرم سے کپکپاتی آواز سے اسے جواب دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ ایک خود متعین کردہ مقابلے کی میراتھن ریس میں اس نے اپنی بہنوں کو مات دے دی تھی۔ اب وہ اس اطمینان اور اعتماد کو آرام سے اپنے بکسے میں ڈال واپس یو ایس اے جا سکتا تھا کہ کچھ بھی ہو اس کا باپ مرتے دم تک سب سے زیادہ صرف اسی سے عشق کرتا رہا ہے۔ ابا کے ابرو وں کی کہیں نہ کہیں اسے بھی طلب تھی۔ حالانکہ وہ تمام عمر اس طلب کی نفی کرتا رہا۔

ہمایوں کی روانگی کے روز ہم سب نے یہی بہتر سمجھا کہ انہیں اس کے جانے کے بارے میں بتایا نہ جائے۔ ان کی ذہنی حالت تھی بھی ایسی کہ انہیں یہ بتا کر دھوکا دیا جا سکتا تھا کہ وہ ذرا باہر گیا ہے، ابھی آ جائے گا مگر نہ جانے کون سی کالی چڑیا نے ابا کے کان میں یہ سرگوشی کر دی کہ آج آپ کا محبوب بیٹا آپ کو چھوڑ کر امریکہ واپس جا رہا ہے۔ ابا نے صبح دل کڑا کر کے اس سے سوال کیا: ''آج تم کس روٹ سے واپس جا رہے ہو؟'' ہم سب نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''ابا، میں یہیں ہوں۔ کہیں نہیں جا رہا۔'' ہمایوں نے ٹالنا چاہا۔ ابا پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔ سبھی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نیم بے ہوشی اور اذیت کے اس عالم میں بھی ابا حقیقت

جان گئے تھے کہ بے چہرہ موت کالا چوغہ پہنے، ہاتھ میں دس کا پیالہ تھامے سرہانے کھڑی ان کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتی ہے اور انتظار کرتی ہے اور وقت گزرتا جاتا ہے۔

''دنیا نے مجھے مانا مگر میرے اپنے باپ اور بیٹے نے مجھے کبھی Accept نہیں کیا۔''

ان کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ ابا نے ہمایوں کے لیے یہ آخری جملہ اپنے لبوں سے ادا کیا تھا۔ وہ بھی ان کے سینے پہ سر رکھ کے رو دیا اور پھر بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا کہ امریکہ کا جہاز، اس کا کاروبار، بیوی بچے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اسے آگے پہنچنا تھا کہ اجل کا انتظار تو لمبا بھی ہو سکتا تھا۔

ہمایوں کو گئے ہوئے تقریباً دس روز ہو چکے تھے۔ اس کی روانگی کے دن سے ان کی حالت تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی۔ اب ابا نے ہوش و خرد کی دنیا سے ناطہ تقریباً توڑ لیا تھا۔ ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور وہ مستقل بڑبڑاتے چلے جا رہے تھے۔ شاید وہ اب ہر بات کہہ ڈالنا چاہتے تھے، کہی اَن کہی کے راز کھول دینا چاہتے تھے مگر ان کی شکستہ زخمی زبان ان کا مطلب زبان پہ نہیں لا سکتی تھی۔ بشریٰ نے آگے بڑھ کے جلدی سے ہاتھ میں قلم تھما دینا چاہا۔ چیختے چنگھاڑتے فقرے لکھنے والا دبنگ صحافی ایک لفظ نہ لکھ سکا اور قلم اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ شاید یہی اس کی موت کا لمحہ تھا۔

رات کو ہم لوگ دو افراد کی ٹیم بنا کر ابا کے پاس ٹھہرا کرتے تھے تاکہ دوسرے اگلے دن تازہ دم ہو کر گھر سے آ سکیں۔ ہوش میں ہوتے تو کہتے: ''تم سب لوگ میری وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہو۔'' ہم کہتے ''ابا آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' مگر اب تو ابا کو یہ ہوش بھی نہیں رہتا تھا کہ کون رات ٹھہرا، کون گھر گیا، کب رات ہوئی، کب صبح ہوئی۔

چوبیس دسمبر کی رات سنبل اپنے بیٹے ثیری کے ساتھ ابا کے پاس رک گئی تھی کیونکہ اس دن اس کی ہی باری تھی۔ وہ کئی راتوں سے جاگ رہے تھے، نیند انہیں زچ کر رہی تھی۔ جاگ جاگ کر ان کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور جسمانی اذیت کے مارے وہ کوئلوں پہ لوٹ رہے تھے۔ اس تمام رات ابا کچھ بڑبڑاتے رہے تھے۔ نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے وہ۔ زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سنبل نے فجر کی نماز پڑھ کر پیار سے انہیں ہاتھ لگایا اور بتایا کہ آج آپ کی نیند کے لیے ایک سپیشل دوائی آ رہی ہے جس کے بعد آپ سکون سے سو جائیں گے۔ یکایک ابا نے اپنی سمجھ میں نہ آنے والی بڑبڑاہٹ کے درمیان واضح طور پر سنبل سے پوچھا:

''موت کدوں آئے گی؟''

یہ ان کی زبان سے نکلا ہوا آخری جملہ تھا۔ اس کے بعد ابا خاموش ہو گئے۔ صبح کا اجالا کمرے میں پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔

ہماری آنکھوں کے سامنے ایک مضبوط قلعہ ڈھے رہا تھا۔ ایک کھلتا کنول کملا رہا تھا۔ کوئی قدیم سُریلا گیت اپنے اختتامی سُروں کو چھو رہا تھا اور Edgar Allan Poe کا Raven، کا کالا کاگا، کھڑکی پر اپنی چونچ سے دستک دے کر سرگوشی میں کہے جا رہا تھا:

Never more, never more.

رات دس بجے کے قریب ابا نے اپنی چاروں بیٹیوں کی موجودگی میں کھنچے کھنچے چار سانس لیے۔ ان کی ہر سانس سے لگتا تھا، ہمارا دم بھی نکل رہا ہے۔ آخری سانس کے وقت انہوں نے تکلیف سے ناک سکوڑی اور پھر چین سکون کی وادی میں اتر گئے جہاں کوئی تکلیف، کوئی اذیت اب انہیں بے حال نہیں کرے گی اور ایک نیا تجربہ ان کا منتظر ہوگا کہ موت وحیات کے درمیان ایک نئے تجربے، ایک نئی منزل کا ہی تو فرق ہوتا ہے۔

ابا کی بیماری کی وجہ سے ہم ماں بہنوں، عباس اور پروین پھوپھو نے ایک کمرے میں اتنے سارے ہفتے اکٹھے گزارے تو ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر ہونے کا مزید موقع ملا۔ ہم سب کی آپس میں تعلق داری اور گہری ہوگئی۔ ابا کو ہم نے مل کر جانے والی کشتی میں سوار کروایا۔ ان کی طرف فلائنگ بوسے پھینکے اور ہاتھ ہلا کر دور تک الوداع کیا۔ کشتی دھیری دھیرے سرمئی دھندلکوں میں کھو کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو ہم ابا کو بالآخر گھر لے آئے جہاں سے جاتے وقت وہ بے یقینی سے چاروں طرف آخری بار دیکھ رہے تھے۔ ہم رات بھر ان کو تکتے رہے اور ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ کتنے خوبصورت آدمی تھے۔ چھوٹی مانو نے ان کے سرہانے سورۃ بقرہ پڑھنی شروع کر دی اور چاروں بیٹیاں بھنوروں کی طرح اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کے گرد منڈلانے لگیں۔ امی اور باجی پروین اندر کمرے میں چھپی رہیں کہ ان میں ابا کو اس طرح زندگی سے خالی، بے جان دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

صبح اٹھتے ہی سارے اخبار منگوا کر دیکھے۔ سبھی نے ایک بڑے صحافی کی رخصتی کی خبر نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ ابا اس روز کی خاص خبر تھے اور انہیں پتا بھی نہ تھا۔ ان کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلا۔ ملک کے نمائندہ ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں نے اس میں شرکت کی اور انہیں ان کی

آخری آرام گاہ تک پہنچانے گئے۔ ہجوم چل رہا تھا اور سڑک پہ لگے درختوں کے پتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ''موت ہے تیری برات۔''

ابا کے جانے کے بعد ہم سب خالی برتنوں کی طرح کھنک رہے ہیں، لڑھک رہے ہیں اور اپنی اپنی غرض اور محبت کی حصہ داری کے لیے انہیں کھوج رہے ہیں کہ ہمارا مقدس باپ نہ جانے کن اجنبی دنیاؤں کو کوچ کر گیا ہے اور آج کن بیلیوں کی سنگت میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔

سنبل کی آنکھوں سے موتی گرتے ہیں کہ اب اس کی اس طرح سے فکر کون کرے گا جیسے ابا کرتے تھے؟ بشریٰ ہوکے بھرتی ہے کہ لاہور آ کر وہ اپنے دیوانے عاشق باپ کو بانہیں پھیلائے منتظر نہیں دیکھے گی تو لاہور میں اس کا دل کیسے لگے گا؟ مانو گڑیا روتی ہے کہ اس کے گھر کی فضا ابا سے خالی ہو کر بے رنگ اور بے مزا ہو گئی ہے۔ صبح سویرے اخباروں کا ایک بھی صفحہ ادھر سے ادھر ہو جانے پہ ابا کی غصیلی آواز سنائی نہیں دے گی تو ان کے گھر میں دن کا آغاز کیسے ہوگا؟

باجی پروین بولائی بولائی پھرتی ہیں کہ اب وہ شام ڈھلتے ہی کس گرو کے پاس بیٹھ کر سیاسی بحثیں چھیڑیں گی، تاریخی موضوعات پہ مغز ماری کریں گی؟

ابا کی بک شیلفوں پہ ان کی لاڈلی کتابیں اب اداسی میں بال کھولے سوتی نظر آتی ہے۔

ابا کو احمد بشیر بنے رہنے دینے میں ہماری امی کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے روایتی بیویوں کی طرح اپنے من موجی شوہر سے کبھی سونے ہیرے کپڑے لتے کوٹھی بنگلہ گاڑی، بینک بیلنس کا مطالبہ نہ کیا۔ ہر حال میں خوش رہیں اور صحیح معنوں میں ان کا ساتھ دیا۔ ابا نے کمایا، لٹایا، ضائع کیا، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے یا ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سے چھلانگ مارنے نکل کھڑے ہوئے، امی کو کبھی اعتراض نہ ہوا۔ انہوں نے ابا کی ججمنٹ پہ اعتماد کیا اور زندگی کے ایڈونچر میں ان کے ہمرکاب رہیں۔ انہوں نے اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو ہمیشہ ایک نیا تجربہ سمجھ کر خوش آمدید کہا اور کبھی واویلا نہ مچایا۔ امی ایک عظیم بیوی تھیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ابا کے جانے کے بعد وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بھٹکتی، کچھ کھوجتی ہمیشہ دور نکل جاتی ہیں۔ انہیں پتا نہیں چلا وہ کب رانجھا رانجھا کرتے آپ احمد بشیر بن چکی ہیں کہ وہ دونوں میاں بیوی سے زیادہ گوڑھی سہیلیاں ہوا کرتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کو کون سے نئے معنی پہنائیں؟ ان کے گھر میں اب صبح اخبار آتا ہے تو کئی بار اس کی تہہ تک نہیں کھلتی اور وہ ردی میں چلا جاتا ہے۔

دیوار پہ لٹکے ہوئے چوڑے فریم میں پرانی، پکے، کٹز اور نامور قسم کے کمیونسٹ لیڈروں سٹالن، ماؤزے تنگ، مارکس کی تصویریں دیکھ کر میں بھی سوچتی ہوں کہ اب ان کا اس طرح سے پرستار کون ہوگا؟ ابا کمیونزم کے معاشی اور معاشرتی نظام کو آئیڈیل سمجھتے تھے۔ ان لیڈروں کے حامی اور مداح تھے مگر اب دنیا میں کمیونزم کے بارے میں ایک مختلف تاثر نے جگہ لے لی ہے۔ اب ان جیسے die-hard کمیونسٹ کہیں نظر نہیں آتے۔

ابا کا کمرہ ویسے کا ویسا ہی ہے مگر اس میں بستر پہ لیٹے ابا نظر نہیں آتے۔ ابا کہاں ہیں؟ پتا نہیں مگر یہی احساس رہتا ہے کہ وہ دور نہیں کہیں آس پاس ہی موجود ہیں۔ لگتا ہے انہوں نے آج بھی مجھے اسی طرح اپنے کاندھے پہ بٹھایا ہوا ہے جیسے بچپن میں بٹھا کر کلفٹن سمندر کی سیر کو لے جایا کرتے تھے۔ سچ پتا نہیں کیا ہے؟ انسان کہاں شروع اور کہاں ختم ہوتا ہے؟ یہ سینۂ کائنات میں مخفی ایسا سربستہ راز ہے جسے فاش کر دینا عقل کی ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ ابا شاید خدا میں ہی سما گئے ہیں کہ خدا اور اس کی تخلیق کا تعلق تو گہرا، یقینی اور جینوئن ہوتا ہے۔ خدا خود انسان میں ہے اور انسان خدائی صفات کا مظہر و حامل۔ دونوں ایک ہی سکے کی دو اطراف ہیں۔ سارا کائناتی نظام مربوط و مضبوط کڑیوں میں بندھا اور گندھا ہوا ہے۔ موت و حیات کے سلسلے چلتے رہتے ہیں۔ خاک میں پنہاں صورتیں کسی نہ کسی لالہ و گل میں نمایاں ہوتی رہتی ہیں کہ زندگی انرجی ہے اور انرجی کبھی مرتی نہیں صرف جگہ تبدیل کر لیتی ہے۔

ابا کبھی ہوا کے شوخ جھونکے کی صورت میرے کاندھے پہ نرم تھپکی دے کر مجھے حوصلہ دلاتے ہیں تو کبھی ندی کے شفاف پانی کا گھونٹ بن کر میری پیاس بجھاتے ہیں۔ وہ اس قطب ستارے میں بھی چمکتے ہیں جو اندھیری رات میں مجھے راہ دکھاتا ہے اور گم نہیں ہونے دیتا۔ میں انہیں پھولوں کی مہکار میں سونگھتی ہوں، چڑیوں کی چہکار میں سنتی ہوں اور کبھی بہتی آبشار میں ڈھونڈ لیتی ہوں۔ کبھی وہ چندا کی باولی روشنی بن جاتے ہیں جس میں من بے اختیار ہو کر ناچنے کو بے تاب ہو جاتا ہے۔ ابا کرشن اپنی گوپیوں کے خمیر میں گندھے ہوئے ہیں کہ وہ ان کا کردار اور ان کی سوچ ہیں۔ انہیں کبھی موت نہیں آئے گی کیونکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے دلوں میں رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ ان کے لفظ ان کے ہونے کی گواہی دیں گے اور انہیں آنے والی نسلوں سے متعارف کرواتے رہیں گے۔ احمد بشیر ایسا ادیب ہے جس نے ''مرنا نا ہیں تے گور پیا کوئی ہور۔''

---------O---------

چار چاند

انوکھے احمد بشیر اور ان کی خوبصورت، سیدھی سادی، سو فیصد ان کی مرضی پر چلنے والی بیوی محمودہ نے بڑی کامیاب شادی شدہ زندگی گزاری۔ ان کے گھر کے آنگن میں چار چاند چمکے اور ایک سورج اترا۔ میاں بیوی خوشی سے پھولے نہ سمائے کہ ان کی محبت کی مالا میں نئے منکوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کے بچے ان کے لیے مالا کے منکے ہی تو تھے کیونکہ مالا تو وہ خود تھے۔ اپنی محبت میں گم، ایک دوسرے کی چاہت میں سرشار، عشق کے بیمار، سودائی، من موجی۔ انہیں تمام عمر سب سے زیادہ عزیز ایک دوسرے کی سنگت ہی رہی۔ اس میں زیادہ کمال بہر حال احمد بشیر کا ہی تھا کیونکہ وہ بنیادی طور پر ایک محبت کرنے والے انسان تھے۔ بیوی سے محبت، وفاداری ان کا ایمان، دھرم اور Passion تھا۔ انہوں نے تمام عمر اپنی بیوی کی ہی خواہش کی اور اس کی ضرورت کو اپنے لیے اہم جانا۔ اس کے بغیر وہ ایک پل بھی سروائیو نہ کر سکتے تھے جبکہ وہ دیگر گھریلو خواتین کی طرح ہانڈی روٹی، چولہا چوکی، سلائی کڑھائی اور اپنے بال بچوں میں بھی وقت گزارنا پسند کرتی تھیں۔ احمد بشیر کو موسیقی سننے کا شوق بلکہ جنون تھا۔ وہ راگداری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ کلاسیکی موسیقی کے عالم اور جانکار تھے۔ بیوی کی آواز بھی تو سُریلی تھی۔ اس میں سُروں کا سجیلا سجاؤ تھا، بس خواہش تھی کہ محمودہ خانم گانا سیکھیں اور اس میں کمال حاصل کریں۔ بیوی نے بھی شوہر کی خواہش پر خوشی خوشی سر تسلیم خم کیا اور ایک استاد سے موسیقی سیکھنے لگیں۔ اسی دوران بچے بھی ہوتے گئے مگر احمد بشیر اور محمودہ کے آپس کے لگاؤ اور ایک دوسرے کے چاؤ میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ احمد بشیر کا دھیان تھوڑا سا تب جا کر ذرا بٹا جب ان کی بیٹیاں بڑی بڑی، میچور عورتیں بن گئیں۔ پھر وہ اپنی بیٹیوں کی کمپنی میں خوش رہنے لگے۔ حالانکہ اس وقت ان کی بیٹیاں خود اپنے

اپنے بال بچوں اور بکھیڑوں میں الجھی ہوئی تھیں مگر انہوں نے باپ اور ماں کو ہمیشہ وقت اور توجہ کا تحفہ دیا۔ ان کو نظر انداز نہیں کیا۔ احمد بشیر نے اپنی بیٹیوں کو معشوقائیں بنالیا اور ہر وقت نین بچھائے بانہیں پسارے ان کا انتظار کرتے نظر آنے لگے۔ دو بیٹیوں سے ذرا زیادہ پیار ہو گیا اور دوسے کچھ کم۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت کے بھی طالب رہے مگر وہ چونکہ دور جا بسا تھا، لہٰذا ملن کے مواقع کم کم ہی نصیب ہوئے۔

جب بھی گھر میں بیٹی پیدا ہوتی وہ خوشی خوشی اعلان کرتے۔ اچھل اچھل کر سب کو بتاتے کہ میرے ہاں ایک اور بیٹی پیدا ہو گئی ہے۔ محمودہ کو دل ہی دل میں مسلسل بیٹیاں پیدا کرنے پر کچھ مایوسی ضرور ہوتی مگر احمد بشیر کبھی ایسی کوئی منفی بات سننے کو تیار نہ ہوتے جس سے ان کی بیٹیوں کی قدر و قیمت کو ٹھیس پہنچتی۔ انہوں نے کبھی کسی کو ان کی تعدادِ دختران پر انگلی اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ اس لیے لڑکیاں چاہت اور اعتماد کے ماحول میں پروان چڑھیں۔ پھلی پھولیں اور سارے خاندان میں یگانگت اور محبت کسی تبرک کی مانند تقسیم ہوتی رہی۔ سلسلے جڑتے رہے۔ رشتے مضبوط ہوتے رہے اور وقت بیتتا چلا گیا۔

کاغذوں میں لپٹی ہوئی کتھا کار لڑکی

شادی کے ایک سال بعد ان کے آنگن میں پہلا چاند چمکا۔ نیلم پیدا ہوئی۔ پیاری سی گول مٹول، گیلی گیلی صحت مندی بچی پا کر سب ہی اس کے دیوانے ہو گئے۔ پھوپھی پروین نے لاڈ میں اس کا نام نور جہاں رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نیلم کی ننھی ننھی کلائیوں میں کالی چوڑیاں پہنا کر اسے سجاتی، بناتی، سنوارتی، پیار کرتی نہ تھکتی۔ دادی دادا، نانی نانا، صدقے واری جاتے۔ چاچا اختر نکسی اس سے خوب کھیلتے۔ اس کے سر میں راکھ ڈال کر گریباں چاک کر دیتے اور کہتے ''بولو میں پنجابی شیر'' نیلم دہراتی تو خوشی سے نہال ہو جاتے۔ ایسی ہی پریم پذیرائی میں وہ بڑی ہوئی اور خوب محبتیں سمیٹیں۔

نیلم کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے میں بہت دلچسپی تھی۔ پڑھائی میں اس کا بہت جی لگتا۔ جس دن اسے سکول نہ جانا ہوتا وہ اداس رہتی۔ اکثر اچھے نمبر لے کر پاس ہوتی تھی۔ اپنے گھر میں آنے والے ابا کے ادیب دوستوں، ابنِ انشاء، ظہور نظر، ممتاز مفتی وغیرہ میں بیٹھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ تبھی سے شاید اسے انٹلیکچوئلزم کی چاٹ پڑی اور پھر زندگی بھر دوسرے قسم کے لوگوں میں کبھی کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ دوسرے قسم کے لوگوں سے ہی تو یہ دنیا بھری

پڑی ہے اور ابا کے دوستوں جیسے دیوانے فرزانے تو نصیبوں سے ہی کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔ پھر نیلم نے آٹھ دس برس کی عمر سے ہی اخباروں، رسالوں میں چھوٹی چھوٹی نظمیں، مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ احمد بشیر نے اپنی بیٹی کو یہ سب کرتے دیکھا تو ایک بار اپنی بہن پروین کے خط میں لکھا "یہ لڑکی خوفناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ذہانت سے خوف آتا ہے۔" سالہا سال پرانا یہ خط نیلم کے ہاتھ آیا تو وہ حیران رہ گئی۔ کیا وہ بچپن سے ہی ایسی تھی؟ اسے تو خبر نہ تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دور بیٹھا اس کا مستقبل دانت نکوسے وقت کے قریب آنے کا کتنی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ پنجرہ پرندے کی تلاش میں تھا اور پرندے نے ابھی اڑان بھی نہ لی تھی۔

ایم اے نفسیات کے فائنل امتحانوں کے بالکل قریب اس کی شادی ہو گئی اور وہ امریکہ چلی گئی۔ ایم اے نامکمل رہ گیا جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اسے محض بی اے پاس کہہ کر کئی بار اس کا ٹھٹھہ اڑایا۔ ابا نے ایک کماؤ اور مناسب سادا ماد ڈھونڈا تھا۔ اب ذہنی مطابقت اور مزاج کی ہم آہنگی جیسی عیاشی تو قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔ بچپن میں بیٹیوں کی پیدائش پر مطمئن رہنے اور خوشیاں منانے والے باپ ان کے جوان ہوتے ہی گھبرا گئے۔ کہیں کسی سے کوئی لغزش نہ ہو جائے، کہیں کوئی باپ کی دہلیز پہ ہی نہ بیٹھی رہ جائے۔ ایک دلیر، سچا، کھرا صحافی اپنی حلال کی قلیل آمدنی اور جہیز نہ دے سکنے کی مجبوری کی وجہ سے خود کو بے بس محسوس کرنے لگا۔ بیٹیاں خوبصورت، ذہین، قابل اور ٹیلنٹڈ تھیں۔ آرٹسٹک گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تنگ نظر، متعصب معاشرے میں ان کے عین مطابق لڑکے ملنا مشکل تو تھا۔

نیلم اور اس کا شوہر ہر لحاظ سے بے جوڑ تھے۔ شخصیتوں اور ذہنی کیفیتوں کا بہت زیادہ تضاد تھا۔ نیلم کو اس کا شوہر Mindless اور اسے نیلم بالکل Hope less لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی بے لطف رفاقت میں اجنبیت، حیرت اور ناواقفیت کا زہر سرایت کرتا چلا گیا۔ دونوں کی آپس میں کوئی کیمسٹری نہ بن سکی۔ ایک نے دھونس اور دوسرے نے لاجک سے رشتہ چلانے کی کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ الجھنیں بڑھتی چلی گئیں۔ عذابوں کی دھونکنی چلتی رہی۔ کیمیاگری کے نسخے بنتے اور بگڑتے رہے مگر بالآخر الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔ گھریلو مسرتوں کا سونا بنانے کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ تجربہ ختم ہونے پر فریقین ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ نتیجے میں صرف سیاہ، زنگ آلود، سخت، ٹھنڈا لوہا ہی برآمد ہوتا چلا آ رہا تھا۔ بربادی کے طوفانی جھکڑ چلے تو دکھ دونوں کے حصے میں آیا۔ اتنے شدید کیمیکل ری ایکشن کی شاید ان

دونوں کو بھی توقع نہ تھی مگر اکٹھے رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔

ایک بار کسی نجومی نے نیلم کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا ''تم ایک منگلیک عورت ہو اور منگلیک عورتوں کو شادی یا محبت کی خوشیاں کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔'' اور کبھی کوئی بات سچ ثابت ہوئی ہو یا نہیں، اس کی زندگی کے بارے میں نجومی کی یہ بات بالکل صحیح ثابت ہوئی۔

نیلم بھی کبھی وہ نیلی تھی جس کے سو رنگ ہوتے ہیں مگر پے در پے واقعات و حادثات نے اس کی شخصیت کے کئی رنگ دھندلا کر رکھ دیے۔ اس کے پردیس میں پیدا ہونے والے بچے وہیں جا بسے اور زندگی کا تنہائی سے ٹھٹھرا ہوا طویل دور شروع ہو گیا۔ آج وہ اپنے آپ کو ہر دم بہت مصروف رکھتی ہے کیونکہ اسے وقت کے ضیاع کا بہت احساس رہتا ہے۔ دن میں نارمل اور ٹھیک رہتی ہے۔ کسی زندگی سے بھرپور چنچل چڑیا کی طرح چہکتی، پھدکتی اور رنگین تیتری کی طرح اڑتی پھرتی ہے مگر پھر رات آ جاتی ہے تو اس کا قلب ماہیئت شروع ہو جاتا ہے۔ وہ تتلی سے کبڑی مکڑی بن جاتی ہے۔ اس کی شب غم بری بلا کی طرح اس سے چمٹ جاتی ہے اور اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کی آنکھوں سے نیند کھرچ لیتی ہے۔ نیلم رات کے آگے خود کو ناتواں پاتی ہے اور ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ بیرن رات بھی اس پر خوب ہی ستم ڈھاتی ہے۔ اسے نیند کے لیے جگا جگا کر تڑپاتی ہے۔ اسے لگتا ہے وہ کسی سائیں سائیں کرتے جنگل کے گھنے درخت کی شاخ پہ لٹکی ہوئی ایک چمگادڑ ہے جسے رات کا دشتِ وحشت اپنے اندر سمو سمو کر زور سے اس کی ہڈیاں بھنبھنیج ڈالنا چاہتا ہے۔ جگ راتے اسے نڈھال اور مضمحل کر دیتے ہیں تو وہ ایک مرے ہوئے کاکروچ کی طرح اوندھی گر جاتی ہے۔ پراگندہ خیالات کی چیونٹیوں کا ہجوم اسے ریزہ ریزہ کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے وہ کسی ماورائی دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ نیند کی آرزو سے تھک ہار کر وہ اپنے بستر کے لق و دق صحرا سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

زندگی کی تکان سے شکستہ کمر کے چورا چور مہروں کو سنبھالتی کچن کی طرف چل دیتی ہے کہ اندر کا خالی پن بھوک کے ہونے کا احساس دلانے لگ جاتا ہے۔ کچھ کھانے کے بعد وہ نیند کی گولیاں پھانک لیتی ہے کیونکہ اسے سونے کی شدید خواہش رہتی ہے مگر گولیاں سہیلیاں تھوڑا ہی ہوتی ہیں جو اسے پیار سے تھپکا کر سلا دیں۔ وہ تو بیرنیں ہوتی ہیں جنہوں نے مہربانی کا چولا پہن رکھا ہوتا ہے۔ گولیوں کی آوردہ نیند نقلی سکون تو دے ہی دیتی ہے مگر ان کا اثر طبیعت پر باقی رہتا ہے۔ نیلم صبح سویرے جاگ کر سب سے پہلے آنسو بہانے بیٹھ جاتی ہے۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالا

دیتی ہے، ناشتہ کرتی ہے اور خود میں ہمت پیدا کرتی ہے کہ آنے والے دن کا سامنا تو بہر حال کرنا ہی ہوتا ہے۔ زرد چھپکلی کی طرح رینگ رینگ کر صبح سے شام تک کا سفر یوں طے کرتی ہے جیسے جاگ کر بھی ہو" ہنوز خواب میں" دیکھنے والوں کو لگتا ہے وہ بڑی خوش باش ہے، ہنسی گاتی، قہقہے لگاتی، گانے گاتی، اڑتی پھرتی ہے۔ اس کی زندگی نے ایک نرم ملائم سرخ مخملیں لبادہ اوڑھ رکھا ہے مگر اس بات کی وہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتی کہ اس آرام دہ لباس کے نیچے وہ پیوندوں والی پرانی گدڑی میں سکڑی بیٹھی سلگتی اور ہر دم بے رحم سردی سے کپکپاتی ہے۔ اس کے جوان بیٹے کی لا علاج بیماری کا دکھ۔ اب اس کی روح کا روگ بن گیا ہے۔ یہ اس کی زیست کا تازہ تازہ آزار ہے جس سے نجات اسے کبھی نہیں مل سکے گی۔ اپنے کو کھ جنوں سے دور ہونے کا اسے خیال آتا ہے تو وہ اس کینچوے کی طرح تڑپ تڑپ اٹھتی ہے جس پر تیزاب ڈال دیا گیا ہو۔ لگتا یہی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بھلا بیٹھی ہے۔ وہ انہیں یاد نہیں کرتی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کا ذکر کر کے ان کے دکھ کو منانا نہیں چاہتی۔ وہ اس سچ کا سامنا نہیں کرنا چاہتی کہ اس کے پیارے بچے رنگین پتنگوں کی طرح آسماں میں کہیں بہت دور جا کر گم اور نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ نیلم نے پوری کوشش سے اس کمزوری ڈور کو البتہ اب بھی مضبوطی سے تھام رکھا ہے جس کا دوسرا سرا اب اسے نظر تک نہیں آتا۔

نیلم بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح کئی معاملوں میں سادہ اور بے وقوف ہے۔ اسے زندگی میں کئی لوگوں نے خلوص کا دھوکہ دے کر الو بنایا ہے اور وہ بن بھی گئی ہے۔ اسے پتہ بھی چل جاتا ہے مگر وہ خاموش رہتی ہے۔ حالانکہ اس کے اندر احتجاج کا طوفان شور مچاتا رہتا ہے۔ سنا ہے بچپن میں ایک بار اس کی امی نے اسے کسی شرارت پر مارا تو اسے لگا اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ امی بتاتی ہیں کہ ننھی سی نیلم ہاتھ میں ڈنڈا لے کر امی کے پاس آئی اور مکمل سنجیدگی سے انہیں کہنے لگی" یہ لیں ڈنڈا اور مجھے اور ماریں۔" سب ہنسنے لگے مگر آج بھی نیلم کو ظلم اور زیادتی ہضم نہیں ہوتی۔ سڑک پہ جا رہی ہو اور اگر پاس سے گزرنے والا گدھا گاڑی بان اپنے گدھے کو ڈنڈا مار دے تو نیلم ہارن بجا بجا کر اسے مخاطب کر کے ڈانٹنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتی۔ گاڑی بان اور راہگیر اسے کوئی خبطی مائی سمجھ کر پاس سے طنزیہ فقرے کستے گزر جاتے ہیں مگر نیلم گدھے پہ ہوتا ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔

اس کی رحمدلی کی کئی وجوہات اتنی بے وقوفانہ ہوتی ہیں کہ وہ دل ہی دل میں خود ہی اپنے

اوپر جھنے لگ جاتی ہے۔ پانی بھرنے کی موٹر ذرا زیادہ کو چل جائے تو اسے موٹر پر رحم آنے لگتا ہے بھاگ کر یہ سوچ کر اسے بند کر دیتی ہے کہ بیچاری موٹر تھک گئی ہوگی۔ مکھی مارتے مکھی کو مارتے وقت ہاتھ ہلکا رکھتی ہے کہ کہیں بیچاری کو چوٹ ہی نہ لگ جائے۔ نوکرانی گھر میں کام کر رہی ہوتی ہے، تو اس کے ساتھ گرم جوشی سے کام میں شامل ہو جاتی ہے کہ اگر میں آرام سے بیٹھی رہی تو وہ غریب کیا سوچے گی؟

حقیقت تو یہ ہے کہ نیلم نے بڑی نوکرانہ طبیعت پائی ہے۔ منکسر المزاجی اور عاجزی خون میں رچی بسی ہوئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ احمد بشیر اور محمودہ کے گھر میں نوکروں کو گھر کے افراد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ نوکرانی اماں بندو اور مہترانی راج کو مکمل اجازت تھی کہ وہ بے بی نیلم کو بھوک لگنے پر اپنی چھاتیوں سے بھی دودھ پلا سکتی ہیں۔ نیلم نے ماں کے ساتھ ساتھ ان دو رضاعی ماؤں کے دودھ سے بھی زندگی حاصل کی۔ ابا امی کا خیال تھا مقصد تو بچے کا پیٹ بھرنا ہے۔ ایسے میں طبقاتی تضاد کو تو اہمیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسے دوسروں کے کام بڑھ چڑھ کر کرنے کی عادت ہے اور خدمت میں بڑی راحت ملتی ہے۔ شاید خدمت گاروں کے دودھ کی برکت ہے کہ وہ ہمیشہ کسی کے کام آنا ہی پسند کرتی ہے۔ اپنے لیے کسی سے کوئی فیور نہیں لیتی۔

بچپن میں چھوٹے بھائی بہنوں کی امی اور آیا بن گئی۔ سب کو اپنے پروں تلے لے لیا۔ ہمیشہ تعلق رکھا اور بھلائی کا سوچا مگر اب زندگی کی سینئر سٹیج پر پہنچ کر اس کا زاویہ نظر اور زندگی کو برتنے، سمجھنے کا طریقہ بہت مختلف ہو چکا ہے۔ اب ہر ایک کو اپنی مرضی کے فیصلے کرنے کی مکمل اجازت دیتی ہے۔

نہ کسی کو روکتی ہے نہ ٹوکتی ہے اور نہ ہی اپنا کوئی قیمتی مشورہ دیتی ہے۔ اس کا کسی سے نہ کوئی مطالبہ ہوتا نہ توقع۔ کوئی اپنے گھر میں اورنج پردے لگائے یا جامنی، چست پتلون پہنے یا پگڑ باندھے۔ اپنے بچوں کی جلد شادی کرے یا کنوارہ بٹھائے رکھے۔ وہ کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتی مگر کسی کو اس کی مدد چاہیے ہو تو ضرور آگے بڑھتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اپنی فیملی کو ہر حال میں سپورٹ ضرور کرنا چاہیے۔ ہر ایک کو اپنے ڈھب سے زندگی گزارنے کا حق دینا چاہیے، خودمختاری کے مزے لوٹنا چاہیے اور کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی بہنیں بھی اس کی اس سوچ کا احترام کرتی ہیں اور اسے کسی قسم کے مطالب سے زیر بار نہیں کرتیں۔

نہ اس پر تنقید کرتی ہیں اور نہ ہی اس کا مقدر سنوارنے کا بہانہ بنا کر اسے کوئی ہدایت نامہ جاری کرتی ہیں۔ یہی ان کے آپس کے ریلیشن شپ کی کامیابی کا راز ہے۔

اس کی سوچ آزاد مگر عمل وہی ہے جو ایک روایتی مشرقی عورت کے ہوتے ہیں۔ دوسروں کے حقوق کے لیے لڑنے میں پیش پیش ہوتی ہے مگر اپنے حقوق کی بات ہو تو دم دبا کر کونے میں دبک جاتی ہے۔ وہ پورے زمانے میں اور خاص طور پر پاکستانی عورت کے مقدر میں کوئی انقلاب لانا چاہتی ہے مگر نہ تو اس میں اتنی قابلیت ہے نہ سکت، نہ جرأت نہ حوصلہ۔ ماں باپ کے کہنے پر آرام سے شادی کر لی۔ شوہر کے کہنے پہ چپکے سے گھر چھوڑ دیا۔ بچوں کی خواہش پر انہیں اپنی مرضی اور حصے کی غلطیاں کرنے کی سہولت اور اجازت دی اور خود کنارے پہ بیٹھی سب کچھ ہوتا یوں دیکھتی رہی جیسے وہ کوئی آؤٹ سائیڈر ہو۔

احمد بشیر کوئی عام سے روایتی باپ نہیں تھے۔ ان کی سوچ نرالی اور مختلف تھی۔ نیلم گھر کی سب سے بڑی اور ذمہ دار سمجھی جانے والی بیٹی تھی۔ ایک روز انہوں نے اسے پاس بلایا اور کہا ''ٹولنٹن مارکیٹ جاؤ اور مرغی خرید کر لاؤ۔'' اس وقت نیلم بارہ تیرہ برس کی تھی۔ وہ گھبرا گئی اور گھگھیا کر بولی'' کیسے؟'' ''لو بھلا اس میں کیا مشکل ہے۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔ ''ایک نمبر بس میں چڑھو، ٹولنٹن مارکیٹ جا اترو۔ اندر جا کر مرغی خریدو اور واپس اسی طرح آ جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ دوسری طرف منہ کر کے بیگم سے نیلم کو پیسے دینے کے لیے کہنے لگے۔ ابا کا حکم ٹالا تو نہ جا سکتا تھا۔ پر نیلم کی خوف سے بری حالت ہو گئی۔ اسے لگا جیسے اسے ٹولنٹن مارکیٹ نہیں سوئے دار بھیجا جا رہا ہے۔ وہ اٹھی اور حسب ہدایات بس میں جا بیٹھی مگر سارے راستے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے رہے۔ اسے اس وقت اپنا باپ ایک ظالم جابر حکمران لگا مگر پھر وہ زندگی میں پہلی بار خود مرغی خرید کر لے ہی آئی۔ اسے کیا خبر تھی، ابا نے اسے خود اعتمادی کا اہم سبق پڑھانے کو ہی یہ سب کیا تھا۔ اس وقت انہیں بھی پتہ نہ تھا کہ نیلم کو آگے جا کر زندگی بھر اپنے سارے کام خود ہی کرنا ہوں گی۔ مرغی، آلو، پیاز، کپڑے سے لے کر بیٹری، گاڑی تک ہر چیز کی خریداری خود ہی کرنا ہو گی۔ وہ ہمیشہ بس میں اکیلی ہی ہوا کرے گی۔ اس کے ہمراہ کوئی نہ ہو گا۔ وہ کہاں جانتے تھے کہ وہ اسے آئندہ زندگی میں تنہا ہونے کے لیے تیار کروا رہے ہیں۔

بعد میں نیلم ان کی سرکاری بیٹی کے فرائض انجام دینے لگی تھی۔ دفتری معاملات کا خیال رکھنا، بل کلیئر کروانا، ڈرائیونگ کر کے والدین کو ادھر اُدھر لے جانا، آرٹیکل چھپوانا، کتابیں پبلشر

تک پہنچانا، انہیں ڈاکٹروں کو دکھانا، یہ کام وہ بڑی خوشی خوشی سرانجام دیتی رہی کیونکہ اسے اپنے والدین، اپنی فیملی سے ہمیشہ بہت محبت رہی۔ احمد بشیر بڑے چالاک اور فلرٹ باپ تھے۔ ہر بیٹی کو اکیلے میں کہتے ''اگر صرف تو ہی پیدا ہوتی تو اور بیٹیوں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' نیلم کو بھی اکثر یہی کہتے اور وہ مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ اسے پتہ تھا کہ ان کا یہ رومانوی جملہ ان کی ہر بیٹی کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور سب کو ہی اس کا پتہ ہے اور وہ اس کا مزا بھی لیتی ہیں۔

ہر انسان کی طرح نیلم بھی پرفیکٹ نہیں ہے۔ اس میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ ایک خرابی تو یہ ہے کہ وہ کوئی ظلم، ناانصافی، منافقت، استحصال، دوہرا معیار دیکھ لے تو چپ نہیں رہ سکتی۔ اس کے اندر کا غصیلا، اصولی احمد بشیر چھلانگ مار کر باہر نکل آتا ہے اور شور مچا دیتا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ نیلم کو ٹریفک میں ون وے کی خلاف ورزی کرنے، سڑک پر گندریوں کے چھلکے پھینکنے والے، جانوروں پر ظلم ڈھانے والے، دودھ میں پانی ملانے والے، سرعام بچوں کو مار مار کر قتل کرنے والے، محبت کر کے بھول جانے والے لوگ بہت تکلیف پہنچاتے ہیں۔ وہ غصے سے بے قابو ہو جاتی ہے مگر پھر اپنی بے بسی پر صرف کڑھ کر رہ جاتی ہے۔ کچھ کرتی ورتی نہیں۔

اپنی اصول پسندی کی وجہ سے اکثر اسے سخت مزاج تصور کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں بڑی نرم ہے۔ غصہ بھی آئے تو اسے دبا لیتی ہے۔ مقدر نے اسے بہت سی باتوں پر صبر کرنا سکھا دیا ہے۔ اس میں دو بڑی خراب عادتیں بھی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پہ رو دیتی ہے اور گھر میں کام کرتے وقت برتن سلامت نہیں رہنے دیتی۔ بچپن میں گھر والوں نے اس کی چھیڑ بنائی ہوئی تھی۔'' کہتے چل بھئی نیلم رو کر دکھا۔'' تو وہ مظاہرے کے لیے سچ مچ رونے لگ جاتی۔ رونا اسے اس فرمائش پہ نہیں بلکہ اس بات پر آتا تھا کہ آخر وہ اتنی کمزور کیوں ہے کہ کسی کے کہنے پہ یوں جھٹ رونے بیٹھ جائے۔ اسے خبر نہ تھی کہ یہ بے قیمت پانی اس کی دیالو آنکھوں سے ہمیشہ ہی موتی بن کر چھلکتا رہے گا۔ سنا ہے بچپن میں وہ ابا امی کی ڈانٹ سے دلبرداشتہ ہو کر بہت دیر تک مسلسل روئے چلی جاتی اور بار بار منع کرنے پر بھی چپ نہ ہوتی تو وہ اسے سزا دینے کے لیے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیتے مگر وہ باز نہ آتی۔ بیچ بیچ میں کنکھیوں سے دیکھتی جاتی کہ لوگ کب میری طرف متوجہ ہوں گے۔ اس کا رونا کئی گھنٹوں تک جاری رہتا۔ پھر گھنٹے دن بن گئے، دن ماہ اور ماہ سال۔ اب اس کے آنسو خشک ہو چکے ہیں اور اسے کسی سے کوئی گلہ بھی نہیں ہے۔ اب اس کا رونا کسی کو دکھائی بھی نہیں دیتا۔

برتن توڑنے کی بد عادت نے بھی کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ چھوٹی تھی تو ابا فخریہ اپنے

دوستوں، ملنے جلنے والوں کو بتایا کرتے کہ میری یہ بیٹی برتن بہت توڑتی ہے۔ نیلم صاحبہ اکثر مہمانوں کے لیے چائے کے برتن اندر لاتے ہوئے بڑے بڑے آرام سے ٹرے زمین پر گرادیتی تھیں۔ ابا عجیب باپ تھے۔ اپنی بیٹی کی اس نالائقی پر انہوں نے نہ اسے کبھی ڈانٹا، شرمندہ یا ذلیل کیا اور نہ ہی اسے کوئی سنگین جرم گردانا۔

لہٰذا اسے کبھی اپنی اس خرابی کی سنجیدگی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ نیلم کے ہاتھ سے چھٹتے ہوئے برتنوں کا چھناکا سنتے ہی تالیاں بجاتے، ہنسنے لگ جاتے کہ بیٹی احساسِ جرم کا شکار نہ ہوجائے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ واقعی ایک معمولی سی بات تھی، کوئی گناہِ کبیرہ نہ تھا مگر جب شوہر کے گھر آئی تو اسے پتہ چلا ایسی کسی بات کا کوئی دوسرا مطلب بھی لیا جاسکتا ہے۔ برتن ٹوٹ جانے پر شریکِ حیات کی ناراضگی دیکھی تو وہ رونے بیٹھ گئی۔ وہ چڑ گیا۔ وہ اور روئی۔ پھر ایک روز نیلم کے ابا کو پتہ چلا کہ اس کا شوہر ان کی بیٹی کی اس نالائقی سے نالاں ہے۔ وہ اسے سمجھانے کے لیے اسے ایک خط لکھنے بیٹھ گئے جس میں کہا کہ ''بیٹا مجھے پتہ ہے کہ وہ برتن توڑتی ہے مگر یقین کرو کہ وہ کسی کا دل نہیں توڑتی۔'' یہ جملہ جس کے لیے تھا اس کے پلے ہی نہیں پڑا۔

اب وہ اکیلی رہتی ہے۔ گھر کی دیواروں پہ اس کے پردیس سدھارے بچوں کی تصویریں بجی ہیں جو اسے دیکھتے ہی امی امی پکارنے لگتی ہیں۔ اس کے قیمتی اثاثوں میں کچھ ٹوٹی ہوئی بے وزن نظمیں، نامکمل کہانیاں، ادھورے افسانے اور ایسے ڈرامے ہیں جن کے مناظر پہ مستقلاً پردہ پڑا رہتا ہے۔ ایک کونے میں ماضی کی یادوں کی بھربھری ڈھیریاں، بھولی بسری خواہشیں، پڑیوں میں بندھی درد کی ٹیسیں اور سوکھے ہوئے گلاب بھی پڑے ملتے ہیں جن سے ہمیشہ بھینی بھینی خوشبوئیں اٹھتی رہتی ہیں۔ ایک جانب خاموشی کی صلیب پر پھانسی لیتا ٹیلی فون، نغموں سے عاری سی ڈی پلیئر اور کاغذوں کا بے انبار، یہ ہے اس کا گھر بار۔

آج نیلم سوچتی ہے۔ یہ کیسی زندگی ہے جس میں کبھی کوئی محبت نصیب نہیں ہوئی۔ محبت تو لعلِ شب چراغ ہوتا ہے جس سے زندگی کی اندھیری راہوں میں روشنی ملتی ہے۔ دل کا کنول نہ کھلا تو کیا ملا؟ اس کی آرزو کا صحرا تو ویران ہی رہا۔ اندھیری راتوں میں چمکنے والا یہ پہلا چاند اپنی ہی ٹھنڈی نیلی چاندنی میں بھسم ہوتا رہا مگر بجھا نہیں۔

احمد بشیر کے اپنے اصول اور آدرش تھے۔ وہ چاہتے تھے ان کی پہلی اولاد ایک سخت جان انسان بنے۔ نرم و نازک، چھوئی موئی لڑکی بن کر نہ جیے۔ امی بتاتی ہیں کہ ایک روز یہ میاں

بیوی نیلم سمیت کلفٹن کی سیر کو گئے۔ سب جانتے ہیں کہ ساحلِ سمندر تک پہنچنے سے پہلے کلفٹن کی چبوترہ نما سرخ عمارت سے نیچے اتر کر لاتعداد سیڑھیاں اترنا چڑھنا ہوتی ہیں۔ احمد بشیر نے بیوی سے کہا "نیلم کو چھوڑ دو، اسے خود ہی ساری سیڑھیاں اترنا چڑھنا ہوں گی۔" اس وقت نیلم کی عمر محض ڈیڑھ سال تھی۔ امی کے دل کو تکلیف ہو رہی تھی مگر بچی کے والد اپنے خیالات کو ہی درست سمجھتے تھے، لہٰذا بیوی کی ایک نہ چلنے دی اور نیلم کو خود ہی یہ سفر طے کرنے دیا۔ بچی بار بار گرتی مگر پھر اٹھ جاتی اور چلنے لگتی۔ ماں باپ نے اسے سنبھالا نہیں دیا۔ گھر آنے پہ رات اسے بخار ہو گیا۔ احمد بشیر کے ذہن میں بچیوں کو سخت جان بنانے کے خیال کی منطق آج سمجھ میں آتی ہے۔ آج دیکھا جاتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتے ہیں۔ ان کی ایسی کوئی تربیت نہیں کرتے جس سے آگے جا کر ان کی شخصیت میں حوصلہ، برداشت، صبر اور دلیری پیدا ہو سکے۔ شاید بچپن کے اسی واقعے نے نیلم کے اندر لاشعوری طور پر کوئی اثر کر ڈالا ہو اور اسے سخت جان بنا دیا ہو۔ شاید اسی لیے وہ بار بار گرتی ہے تو پھر اٹھ بھی جاتی ہے اور نئے سرے سے سفر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ رکتی نہیں۔ کبھی کبھی تو وہ یہ سوچ کر ہنس بھی دیتی ہے کہ بچپن میں ابا نے اتنا پیدل چلایا کہ اس کے گھٹنے ابھی تک ٹھیک ہی کام کر رہے ہیں۔ کون جانے۔

وہ جتنا جی سکتی ہے، جی لیتی ہے اور جی رہی ہے اور جینے کا ہنر اس نے بالآخر سیکھ لیا ہے۔ سوچ کا دیا اس کے اندر جھلمل روشنی پیدا کرتا ہے تو وہ کتھاؤں کی نگری میں اتر جاتی ہے اور انہیں مالا بنا کر گلے میں پہن لیتی ہے۔ وہ اپنی کتھاؤں کے ساتھ کسی اور ہی ایک اور نگر میں چلی جاتی ہے تو اسے ڈھیر ساری خوشیاں اور قبولیت ملتی ہے۔ کتھائیں اسے گم نہیں ہونے دیتیں اور وہ اپنے آپ کو پا لیتی ہے۔ یہی اب اس کا جیون ہے۔

سر ساگر میں بہتی ہوئی سُریلی لڑکی

احمد بشیر اور محمودہ کے گھر آنگن میں اترنے والا دوسرا چاند سنبل ہے جسے سب پیارے سے پپو پکارتے ہیں۔ حالانکہ یہ کبھی بھی پپو نما نہیں تھی۔ خوبصورت، نازک اندام، لاابالی، چنچل اور شوخ لڑکی تھی۔ طبیعت میں حسِ مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے سارا گھر اس کی باتوں اور حرکتوں پہ ہنستا رہتا اور یوں ایک بے فکری اور رونق کا ماحول رہتا۔ حالانکہ والد کے گھر میں قائم و دائم رہنے والی بے کاری اور بیروزگاری کے پڑاؤ بھی مستقل تھے مگر بیٹیاں آپس میں لگی

رہتیں، خوش طبعی سے ہنستی کھیلتیں تو سلسلۂ روز و شب رواں رہتا۔ اکثر جب یہ خوش شکل لڑکیاں تیار ہو کر کہیں باہر جانے کے لیے بس یا رکشہ میں سوار ہوتیں تو پپو کہتی "ہم رکشے میں جا رہے ہیں حالانکہ شکلیں ہماری گاڑیوں میں بیٹھنے والیوں جیسی ہیں۔" اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑتا اور سب ہنس پڑتے۔

بچپن سے ہی پپو اور نیلم بڑی باجیاں ہونے کی وجہ سے گھر میں اہم پوزیشن رکھتی تھیں۔ دونوں کے سب کام مثلاً سونا، جاگنا، کھانا پینا، دوپہر تک سکول میں بھوکے رہنا، کپڑے مل بانٹ کر پہننا، گھریلو پریشانیوں سے سہم جانے میں ایک گہری سانجھ رہتی تھی۔ گھر میں کچن کے ایک کونے میں تین ٹانگوں والی کالی میز ہوا کرتی تھی۔ سکول کالج سے آنے کے بعد شام کی چائے کے بعد کچن میں ایک شاندار محفل موسیقی کا انعقاد کیا جاتا۔ پپو میز کو اپنی نازک انگلیوں سے بجاتی اور ماں سمیت سب لڑکیاں کہ جن کے گلوں میں قمریوں کی کوکو جیسی خوبصورت آواز تھی، گانے لگتیں۔ سبھی سُریلی تھیں، لہٰذا خوب محفل جمتی۔ اپنی اس دل لگی اور تفریح سے وہ سرشار اٹھتیں اور یہ پروگرام اگلے روز بھی اسی طرح باقاعدگی سے جاری رہتا۔

ممتاز مفتی اسلام آباد سے آتے تو کہتے "چلو لڑکیو سناؤ ڈاڈھا بھیڑا عشقے دا روگ" موسیقی کے شوق سے چور یہ بہنیں لہک لہک اور جھوم جھوم کر تانیں لگاتیں تو وہ خوش ہو جاتے۔ بانو قدسیہ انہیں بنسریوں کے نام سے پکارتیں۔ اس وقت لگتا کہ تمام زندگی یونہی موسیقی کی دھنوں پر روح کو سرشار کرتے گزر جائے گی مگر وقت کروٹیں بدلتا رہا۔ موسیقی کی لہروں کو کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو تھمنا ہی ہوتا ہے۔ سو وہ تھم گئیں اور زندگی اور راستوں پہ چل نکلی۔

پپو کو سکول جانے، پڑھائی کرنے سے کوئی خاص شغف نہ تھا۔ وہ سکول جاتے رونے لگتی تو امی اور ابا لاڈ میں آ کر اسے سکول سے اٹھا لیتے۔ اسی وجہ سے اس نے آرام آرام سے ہی پڑھائی کی مگر پاس ضرور ہوئی، فیل ہو کر نہیں دکھایا۔ گھر میں گھریلو ذمہ داریاں کچھ اس طرح سے بانٹ دی گئی تھیں کہ نیلم کھانا پکاتی اور سنبل صفائی کرتی تھی مگر سنبل کی صفائی صرف بظاہر تھی۔ وہ اکثر صفائی کرتے کوڑا بستر کے نیچے چھپا دیا کرتی جسے نیلم جیسی استانی صفت اصولی باجی ہمیشہ ڈھونڈ لیا کرتی اور اس پر اس سے سوال جواب کرنے لگتی تھی۔ پپو کو کپڑے دھونے سے بھی بہت چڑ تھی۔ حالانکہ سب کے حصے اپنے اور چھوٹوں کے ہی کپڑے آتے تھے مگر وہ اکثر نلکے کے پاس بیٹھی آنسو بہاتی نظر آتی۔ وہ کہتی "مجھے لگتا ہے میں غسل خانے میں قید ہوں اور باہر دنیا ہنس کھیل

اور موج اڑا رہی ہے۔''

اس کی اور نیلم کی آپس میں لڑائی بھی اکثر ہوتی۔ پپو ذرا مضبوط دل کی تھی۔ وہ بڑے تحمل اور بے نیازی سے لڑائی کے بعد کے دن گزار لیتی جبکہ نیلم آپس میں بول چال بند ہو جانے پر رونے دھونے بیٹھ جاتی۔ پپو بڑی مشکل سے ہی صلح پر آمادہ ہوتی جبکہ نیلم کا دل اس سے بات کرنے کو للچاتا رہتا۔ ایک بار اس نے نیلم کو اپنے پیچھے پیچھے آتے دیکھ کر جھنجلا کر کہا'' یہ چمگادڑ کی طرح میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔'' تو نیلم کے دل پہ گھونسا لگا اور وہ خوب روئی۔ یہ فقرہ وہ کبھی بھلا نہ سکی مگر نیلم بھی کچھ کم نہ تھی اس سے اپنا بدلہ لے ہی لیا کرتی تھی۔

رات کو دونوں کو سونے کے لیے ایک ہی تنگ چارپائی ملتی تھی۔ پپو جلد ہی بے خبر گہری نیند سو جاتی تھی جبکہ نیلم جاگ رہی ہوتی۔ پپو اپنے گھٹنے گول کر کے پیٹ کی طرف موڑ لیتی تو وہ مصیبت بن کر نیلم کے پیٹ میں چبھنے لگ جاتے۔ نیلم بار بار اس کی ٹانگیں زور سے نیچے کرتی رہتی اور پپو کو پتہ بھی نہ چلتا کہ اس کے ساتھ کیسی انتقامی کارروائی کی جا رہی ہے۔

پپو بہت گوری چٹی، خوبصورت، نازک اندام تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا اس کے ملکوتی حسن کی تعریف کرتا اور پھر کہتا'' نری ماں پہ گئی ہے مگر بڑی کمزور ہے بیچاری۔'' یہ جملے سن سن کر نیلم کے کان پک جاتے اور حسد سے اس کا برا حال ہو جاتا۔ نیلم چونکہ خود بھرے بھرے گول مٹول جسم کی تھی اس لیے اسے کوئی توجہ نہ دیتا۔ نہ اس کے حسن کی کبھی تعریف ہوتی۔ اس کا جی چاہتا کاش وہ بھی پپو کی طرح دبلی پتلی ہو جائے۔ حسن کے معاملے میں اسے کتنے ہی برس پپو سے احساسِ کمتری رہا۔ وہ چھپ چھپ کر آنسو بہا لیتی مگر منہ سے کچھ نہ کہتی۔ امی ابا، پپو کے لیے بہت سے رنگین، مزیدار وٹامن کے شربت، کاڈلور آئل اور نہ جانے کیا کیا لا کر اسے پلاتے کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی ہڈیاں کمزور ہیں۔ نیلم کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیا جاتا تو اسے اپنی صحت مندی اور متناسب جسم زہر لگتا۔ زیادہ تر نئے اور خوبصورت کپڑے بھی پپو کو ہی پہنائے جاتے۔ نیلم کو کبھی کبھی خیال آتا۔ شاید وہ اپنے امی ابا کی سگی اولاد نہیں ہے مگر بچپن سے جوانی تک آتے آتے بہت سے معاملات صاف اور شفاف ہوتے چلے گئے۔ دونوں میں دوستی ہو گئی۔ پھر نیلم کی شادی ہو گئی اور وہ بیرون ملک چلی گئی تو دونوں بہنیں کئی سال کے لیے اجنبی بن گئیں۔ تعطل ختم ہوا تو دونوں پھر سے بہنیں بن گئیں اور آج دونوں میں بہت ربط، دوستی اور یگانگت ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا بہت سہارا رہتا ہے۔

پیو بھی اپنے دیگر گھر والوں کی طرح بڑی رحمدل اور نیک مزاج ہے۔ سکول کے زمانے سے اکثر ہی غریب، مستحق، ہم جماعت لڑکیوں کو چھوڑ کر گھر لے آتی تھی۔ انہیں کھلانے پلانے، کپڑے دینے کے بعد، ان کے اہل خانہ کو سفارشوں سے نوکریاں دلوانا ان کے دیگر گھریلو معاملات کے مسائل سلجھانا، اس کے معمولات میں شامل تھا اور اب تک ہے۔ بچپن میں گھر کی بوڑھی ملازمہ کو روٹیاں پکاتے وقت پاس بیٹھ کر پیار سے پنکھا جھلا کرتی تھی۔ امی سے ڈانٹ بھی پڑتی مگر پھر بھی نوکروں کے گاؤں سے آنے والے میلے کچیلے رشتے داروں کو گندے پیروں سمیت صوفوں پر بٹھا کر شربت پلانے سے باز نہ آتی تھی۔ ایک بار گھر کے سامنے کے خالی میدان میں ایک بوڑھا چرواہا بکریاں چراتا دیکھا تو دکھی ہو گئی۔ اسے اشارہ کر کے پاس بلایا۔ بابا آ گیا۔ کہنے لگی "بابا تم صبح سے دھوپ میں بکریاں چرا رہے ہو۔ تمہیں بھوک لگ گئی ہوگی۔ کھانا دوں؟" بابا نے ایک نظر اس بچی کو دیکھا۔ پھر تنک کر جواب دیا "تیرا کھانا کیوں کھاؤں، میں کوئی فقیر ہوں۔" سنبل اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور یہ واقعہ برسوں اس کی چھیڑ بنا رہا۔

احمد بشیر نے گھر میں نیکی اور رحمدلی کے کئی پراجیکٹ شروع کر رکھے تھے۔ یہ پراجیکٹ کسی ماڈرن زمانے کی این جی او کے بغیر بھی ٹھیک ٹھاک ہی چلتے رہتے تھے۔ ان کا آرڈر تھا کہ اگر کسی نوکر کو کتا کاٹ جائے تو نوکر کے پیٹ میں چودہ روز تک چودہ ٹیکے لگوانا نیلم کی ذمہ داری ہے۔ تین چار نوکروں کی یہ ڈیوٹی نیلم نے ان نوکروں کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے ضرور دی۔ وہ صبح ہوتے ہی نوکر صاحب کے ساتھ بس میں چڑھ کر ہسپتال جاتی اور یہ نیک کام سرانجام دے کر واپس لوٹتی تھی۔ ابا کا یہ بھی حکم تھا کہ گھر کے نوکروں کو پڑھایا ضرور جائے۔

سنبل کے ذمے ایک اندھے لڑکے محمد حسین کو پڑھانا تھا جو تپتی دوپہر کو عین اس وقت اپنی ماں کے ساتھ آتا جب سنبل کو سونا ہوتا تھا مگر آفرین ہے اس نوجوان ٹین ایجر لڑکی پر کہ وہ اپنی محبوب نیند کی قربانی دے کر یہ کام خوشدلی اور لگن سے کرتی تھی۔ کبھی کبھار بشریٰ اور نیلم بھی مدد کے لیے میدان میں کود پڑتیں مگر زیادہ تر پیو ہی یہ کارِ ثواب سرانجام دیتی۔ اسے خود پڑھائی کا قطعاً شوق نہیں تھا مگر محمد حسین کو بیٹھ کر باقاعدگی سے رٹے لگواتی۔ بالآخر اس کی محنت رنگ لائی اور محمد حسین نے ماسٹرز کر لیا۔ اس کی ماں مٹھائی لے کر آئی اور پھر اسے کالج میں پروفیسر کی نوکری بھی مل گئی۔ پتہ نہیں محمد حسین کو وہ باؤلا سا گھر کبھی یاد آتا ہو گا یا نہیں جہاں نوجوانی، بے فکری اور لاپرواہی کی عمر کی لڑکیاں اسے اتنی سنجیدگی سے روز پڑھایا کرتی تھیں۔

بچپن میں نیلم اور پپو ساتھ ساتھ رہتیں۔ پپو کو نیند زیادہ آتی تھی اور نیلم کو کم۔ پپو سو جاتی تو نیلم کو اکیلے میں کوفت شروع ہو جاتی کہ بہن کے بغیر اسے مزا ہی نہیں آتا تھا۔ نیلم کو شرارت سوجھتی۔ وہ اچانک بے خبر سوئی ہوئی پپو کو ہڑبڑا کر اٹھا دیتی اور شور مچا دیتی "اٹھو، زلزلہ آیا ہے۔" بے چاری پپو گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگتی جس پر نیلم خوب قہقہے لگاتی۔ نیند کی حریص نیلم اسے سوتے دیکھ کر جل جاتی۔ شام کے چار یا پانچ بجے اسے ہلا ہلا کر جگا کر کہتی "اٹھو صبح ہوگئی ہے۔ سکول جانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔" معصوم بھولی پپو اپنی بڑی، معتبر، معزز، باجی کی بات کو سچ جانتے ہوئے شرافت سے بستر سے اٹھ جاتی۔ خواب آلود آنکھوں سے باتھ روم کی طرف چل دیتی، منہ ہاتھ دھوتی، دھیرے دھیرے سلوموشن میں ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کرتی اور پھر فرمانبرداری سے کچن کی پیڑھی پر آ کر بیٹھ جاتی۔ جماہی لے کر کہتی "باجی ناشتہ دو۔" اس پر نیلم پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا اور وہ اسے چھیڑ کر کہتی "ناشتہ اور اس وقت؟ ابھی تو شام کے چار ہی بجے ہیں۔" پپو کو غصہ آ جاتا اور وہ بکتی جھکتی بستر میں گھس کر دوبارہ سونے کی کوشش کرتی۔ انہی میٹھی اور معصوم شرارتوں میں ان کا بچپن بیت گیا اور وہ بڑی ہو گئیں۔

اس تمام وقت میں ابا کی مسلسل بیکاری کی وجہ سے حالات بہت کٹھن تھے مگر نیلم اور پپو صابر دور کی صابر بچیاں تھیں۔ انہوں نے ماں باپ سے کبھی کوئی فرمائش کی نہ سکول کی کاپی پنسلوں کے لیے پیسے مانگے ابا کا بیکار ہونا ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ اس لیے انہیں علم ہی نہیں تھا کہ معاشی آسودگی کس چڑیا کا نام ہوتی ہے اور ان کے گھر میں اچھے دن کب آئیں گے۔

نیلم شادی کے بعد امریکہ چلی گئی تو پپو نے بڑی باجی کا رول سنبھال لیا مگر چھوٹے بہن بھائی اس کے قابو ہی نہ آتے تھے۔ اس نے اپنی طرف سے انہیں کنٹرول کرنے کی بہت کوشش کی مگر سب بے سود۔ بھائی ہمایوں کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا کر کہتی "سبق نہیں یاد کرو گے تو باہر نہیں نکلنے دوں گی۔" مگر بھائی اسے جُل دے جاتا۔ کھڑکی میں سے باہر کود کر گلیوں میں آوارہ گردی کرنے لگتا یا اندر پڑی ہوئی ابا کی کتابوں اور ادبی جرائد کا مطالعہ کرتا رہتا۔ یہ بات پپو باجی کو بہت سال بعد معلوم ہوئی۔

جوان ہونے پر اس کی شادی ایک خوبصورت، بلی آنکھوں والے میجر سے ہوگئی۔ دونوں خوبصورت تھے، جوڑی خوب بجی۔ میجر صاحب نے بیوی سے ڈٹ کے محبت کی۔ پپو خوش ہوگئی مگر اس کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے گانا گانے کا اب بھی بہت شوق تھا مگر جس خاندان میں

وہ بیاہی گئی تھی وہاں تو دنیائے فن اور موسیقی سے کوئی آشنا ہی نہ تھا۔ پپو گانا گانے کو ترستی تھی۔ چوبرجی کے محلے میں واقع گھر کے سب سے اندرون کمرے کے دروازے چاروں طرف سے بند کر لیتی۔ گھر میں جب کوئی اور نہ ہوتا تو کھل کر گانے لگتی۔ محلے کے کسی بچے کو پیسے دے کر گلی میں کھڑا کر کے پوچھتی کہ بتاؤ باہر کس گھر تک آواز نہیں آ رہی۔ آزادی سے گا نا نہ گا سکنے کی اجازت نہ ملنے پر یہ احساسِ محرومی اس کی روح کا ناسور بنتا چلا گیا اور یونہی بہت سے سال گزر گئے۔

میجر صاحب نیک دل مگر غصے کے بہت تیز تھے۔ بات بات پر بھڑک جاتے، لہٰذا ان کی مرضی پہ چلنا لازم تھا۔ پپو نے اپنا گلا گھونٹ دیا اور صبر کے کڑوے گھونٹ پیتی رہی۔ اس گھٹے ہوئے معاشرے میں عورت کو اپنے ٹیلنٹ کے اظہار کی اجازت آسانی سے کب ملتی ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ابھی تک موسیقی سے شغف رکھنے والوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا ہی نہیں جاتا۔ حالانکہ موسیقی جیسی سکون بخش چیز تو ایک نعمت کا درجہ رکھتی ہے۔ اورنگزیب عالمگیر ہر دور میں زندہ رہتا ہے جو گانے والے مرد و زن پہ پابندیاں لگاتا اور آلاتِ موسیقی کو دفن کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ آوازیں کال کوٹھریوں اور بند کمروں میں گھٹی رہ جاتی ہیں اور کہانیاں ختم ہوتی جاتی ہیں۔ سنبل بھی ایک مڈل کلاس خاندان کی بیٹی اور بہو ہونے کی وجہ سے اسی قسم کے متعصبانہ طرزِ عمل کی بھینٹ چڑھی اور سُروں کو سالہا سال اپنے گلے میں ہی بھینچتی رہی مگر اس کو یہ دکھ اندر ہی اندر کھاتا گیا۔ وہ کئی برس تک جھنجھلاتی رہی۔ اس کے اندر گلوکاری کی خواہش بہت شدید تھی مگر گھریلو ماحول اور ممانعتوں کی وجہ سے مجبور رہی۔ بہت سارے سال گزر جانے کے بعد جب اپنی اولاد کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئی تو اس نے اپنی اس خفتہ خواہش کو پورا کرنے کا شوہر سے اذن مانگا۔ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے سسرال سے بغاوت کی اور ہلکی پھلکی گلوکاری شروع کر دی مگر وقت تو اک بہتا دریا ہے۔ رکا کب رہتا ہے؟ اس وقت تک بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ چکا تھا۔ دیر ہو چکی تھی۔ یہ احساس اسے ہر پل گھن کی طرح کھاتا رہتا ہے کہ وہ فن گلوکاری کو باقاعدہ طور پر سیکھ نہ سکی۔ بروقت اس دنیا میں اپنی آواز کا جادو جگا نہ سکی اور قافلے آگے کو چلتے چلے گئے۔

اپنی سب بہنوں میں سے سب سے زیادہ بیگمانہ مزاج بھی اسی کا ہے۔ جوانی میں اونچے طبقے کی بیگمات اس کی سہیلیاں تھیں جن کے ساتھ وہ پارٹیوں میں جاتی، ہنستی گاتی وقت گزارا کرتی تھی۔ ہیرے جواہرات، مہنگے کپڑوں میں ملبوس اپر کلاس بیگمات اسے بہت متاثر کرتی

تھیں۔ اس نے ان سے دوستیاں کر لیں اور انہی میں اٹھنے بیٹھنے لگی۔ مگر اپر کلاس دراصل اس کی کلاس نہ تھی، لہٰذا اسے ان سے جدا ہونا ہی پڑا۔ وہ اکثر اپنی بہنوں سے کہتی "اگر میں امیر ہوتی تو کبھی تم لوگوں کو منہ نہ لگاتی، بلکہ تم سے بات تک نہ کرتی۔" اس بات پر سب ہنس پڑتے مگر ببی کو احساس رہا کہ لکشمی دیوی اس پر کبھی زیادہ مہربان نہیں رہی۔ کبھی اسے کھل کر اپنے درشن نہ دیئے، مالی آسودگی نہ بخشی۔ اسی وجہ سے ببو میں کچھ کر گزرنے، کچھ بن جانے کا جنون جڑ پکڑتا چلا گیا۔

سب بہنوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بھی وہی ہے۔ نماز، روزے کی سختی سے پابند ہے مگر اللہ میاں کو کسی مہرباں دوست سے زیادہ ڈنڈے والا کوتوال ہی سمجھتی ہے۔ اسے اللہ میاں سے بہت ڈر لگتا ہے جبکہ نیلم اللہ میاں کو انڈرسٹینڈنگ دوست سمجھتی ہے۔

اس کی حرکتیں اور عادتیں سب سے نرالی اور انوکھی ہیں۔ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ جی میں جو خیال ہوا سے ہی صحیح سمجھتی ہے۔ درزی سے نئے کپڑے سلوا کر اسے کبھی پسند نہیں آئے۔ اکثر انہیں کھول کھال کر خود ہی ٹھیک کرتے ہوئے زیادہ ہی بگاڑ دیتی ہے اور پھر کسی کام والی کو بخش دیتی ہے۔ کبھی اپنے اچھے بھلے گورے چٹے چہرے کو بلیچ لگا کر جلا لیتی ہے تو کبھی بالوں میں عجیب و غریب رنگ کا ڈائی لگا کر ان کا ستیاناس کر لیتی ہے۔ کبھی آنکھوں میں لینز لگاتے ہوئے انہیں اتارنا بھول جاتی ہے تو کبھی نہ لگائے ہونے کے باوجود انہیں اپنی آنکھوں میں تلاش کرتے ہوئے دیدے زخمی کر لیتی ہے۔ اس کارروائی میں وہ ایک دو بار رات گئے گھبرا کر ہسپتال بھی جا چکی ہے۔ بے حد اونچی ایڑی کا جوتا پہننا پسند کرتی ہے چاہے پاؤں کتنا ہی ڈگمگائے۔ اگر کوئی اس کی ایڑی دیکھ کر پریشان ہو تو فوراً یہ کہہ کر اپنا دفاع کرتی ہے کہ مجھے کوئی مشکل نہیں ہو رہی تو آپ کیوں فکر رہے ہیں؟ وہ خوبصورت ہے اور اپنے آپ کو بہت خوبصورت سمجھتی ہے۔

بچپن میں اسے جنگ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ رات کو جب بلیک آؤٹ کرنے کے لیے ساری بتیاں بند کر دی جاتیں تو سنبل کو لگتا بم بردار جہاز ان کا گھر پھر بھی دیکھ لے گا اور وہ اسی خوف سے گھر کے دروازوں، کھڑکیوں کی درزوں میں دوپٹے، ٹاکیاں ٹھونس ٹھونس کر خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتی۔ آج اسے بڑھتی ہوئی عمر کے تذکرے اور بیماری کے خدشات کے اظہار سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کوئی کبھی اس سے اس کی عمر نہ پوچھے۔ ہر نارمل عورت اور ڈورین گرے (Dorian Grey) کی طرح وہ بھی سدا جوان، صحت مند رہنا اور لگنا چاہتی ہے۔

ببو اپنی امی، شوہر اور بہت سی عورتوں کی طرح انڈین ڈراموں کی بہت شوقین ہے۔

تینوں بڑے شوق سے یہ ڈرامے دیکھتے اور ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ہیمرا یہ چینلز بند کر دیتا ہے تو ان کی جان پر بن آتی ہے۔ زندگی ویران اور دل اداس ہو جاتا ہے۔ پپو ہمت کر کے اٹھتی ہے اور ہیمرا کو کوستے کوستے کیبل کمپنی کے دفتر جا پہنچتی ہے۔ وہاں جا کر نیا شیڈول پتہ کر کے آتی ہے اور سٹاف کو کھری کھری سناتی بھی ہے۔ اس کے شوہر اور اس کی اس معاملے میں بہت سانجھ ہے۔

میجر صاحب ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی بوجوہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس لیے پپو کو دن رات خیال رہتا ہے کہ اپنی فیملی کے لیے کچھ کام کرے اور اپنے کماؤ بیٹے کا کسی نہ کسی صورت ہاتھ بٹاتی رہے۔ اسے ایک ہی کام کرنا آتا ہے وہ ہے گانا گانا۔ زندگی کی اس لیٹ سٹیج پر اس نے اپنے سریلے گلے سے فائدہ لینا شروع کیا اور اپنا یہ دیرینہ شوق بھی پورا کیا۔ اب بھی جب موقع ملے گاتی ہے اور دل اور بجٹ دونوں کو سہارا دینے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ققنس کی طرح ہر قسم کا راگ گا لیتی ہے۔ ققنس قریب المرگ ہوتا ہے تو سوکھی لکڑیاں جمع کر کے ان میں بیٹھ کر دیپک راگ گاتا ہے جس سے لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ خود بھسم ہو جاتا ہے۔ پھر جب مینہ برستا ہے تو اسی بھسمی راکھ سے انڈہ پیدا ہوتا ہے اور ایک نئے ققنس کا جنم ہوتا ہے۔

پپو نے بھی نیا جنم لے لیا ہے اور اب پرفارمنگ آرٹس کے میدان میں قدم رکھ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اسے بروقت موقع ملا ہوتا تو وہ بشریٰ کی طرح بھی اس میدان میں اپنی دھاک بٹھا چکی ہوتی۔

شہرت کی جگمگاتی روشنیوں میں چمکتی ستارہ لڑکی

احمد بشیر اور محمودہ کے آنگن میں چمکنے والا تیسرا چاند گوپی ہے جسے دنیا بشریٰ انصاری کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ یہ چاند صرف ان کے گھر میں ہی نہیں دمکا، اس کی روشنی سے پورا پاکستان ہی منور ہے۔ وہ اٹھی اور دنیائے فن پہ اپنی کارکردگی سے چھا گئی۔ ہمیشہ سپاٹ لائٹ میں رہی اور خوب جم کر کھڑی رہی۔ چاندنی کی پھوار میں بھیگی، ہنسی، مسکرائی۔ لوگوں کو تفریح کے مواقع دیئے، محظوظ کیا، شہرت پائی۔ دولت اس کے پیچھے پیچھے چلتی آئی۔ گوپی کی مقبولیت کا گراف ہمیشہ اوپر ہی اوپر کو اٹھتا چلا گیا۔

قطار اندر قطار پیدا ہونے والی اس تیسری بیٹی کے آنے کے بعد ماں کے دل میں ایک

قدرتی سی حسرت ضرور پیدا ہوگئی۔ کاش قدرت انہیں بھی اور ماؤں کی طرح بیٹے کی محبت کا مزا چکھنے کا موقع دے۔ احمد بشیر حسب سابق مطمئن نظر آتے تھے اور کسی قسم کے تاسف کا اظہار نہ کرتے تھے مگر امی چھپ چھپا کر ایک آدھ آنسو کبھی کبھار ضرور بہا لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے گھر میں آنے جانے والے شوہر کے قریبی دوست شاعر ادیب ابن انشاء سے اپنی اس آرزو کا ذکر کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام بشریٰ رکھیں کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اولاد نرینہ سے ضرور نوازتے ہیں۔ میاں بیوی نے ان کی یہ بات مان لی حالانکہ وہ نہ تو ہم پرست اور نہ معجزوں پر یقین رکھنے والے لوگ تھے مگر پھر اللہ تعالیٰ نے واقعی دعا قبول کر لی۔ بشریٰ خوشخبری بن گئی۔ چند سالوں بعد جمود ٹوٹ گیا اور بیٹا ہمایوں پیدا ہوا۔ بشریٰ نے اپنے نام کی لاج رکھی اور زندگی میں جس جس کے قریب رہی اس کے لیے خوشخبری، خوشحالی، خوش قسمتی کا باعث بنتی رہی۔ اس کے نام کی برکت ہی ایسی تھی۔

گھر میں گوپی مڈل چائلڈ یعنی درمیان والا بچہ تھی۔ دو بڑی بہنوں اور چھوٹے بہن بھائی کے بیچوں بیچ پھنسا ہوا بس ایک یونہی سا بچہ۔ اوپر سے ستم یہ کہ دوسروں کے مقابلے میں بظاہر کم خوبصورت۔ حد سے زیادہ دبلی پتلی، لم ڈھینگ، سانولی سلونی اور اِدھر سے اُدھر لڑھکتے رہنے والی۔ اکثر ہمسایوں کے گھر جا کر بیٹھ جاتی اور اپنی دلچسپ باتوں سے ان کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہتی۔ گھر میں اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی مگر اس نے ٹھان رکھا تھا کہ وہ اپنے آپکو غیر اہم نہیں ہونے دے گی۔ عام طور پر اس طرح کے درمیانی بچے کو بس یونہی ہانک دیا جاتا ہے۔ بڑوں جیسی عزت اور چھوٹوں جیسا لاڈ پیار نصیب نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ بچے اپنا مقام خود پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ گوپی بھی ایسا ہی ایک بچہ تھی۔ اس کو دیکھ کر اکثر لوگ بے حسی سے پوچھتے "یہ کس پر گئی ہے؟" تو اس کے دل پر چوٹ لگتی۔ اس وقت فیملی کراچی کی ایک بلڈنگ میں رہائش تھی۔ وہاں بلڈنگ کے بچے اکثر گوپی کو ستاتے اور کہتے "ذرا بتیاں تو نکالو۔" تو وہ ہونٹ سکوڑ کر اور بھیں بھیں کر کے رونے لگتی۔ سب بچے تماشہ دیکھنے لگتے۔ امی اسے لڑکا بنانے کے لیے نیکر اور بوشرٹ بنا کر سر پہ مرغا کاڑھ دیتیں۔ انہیں کب پتہ تھا کہ یہ ایک دبنگ، انوکھی لڑکی ہے۔ وقت آنے پر ایسا کھلے گی کہ دنیا کو اپنا دیوانہ بنا لے گی۔ یہ مردوں سے بڑھ کر مردانہ وار زندگی کا مقابلہ کرے گی۔

بچپن سے ہی اس کا مزاج مختلف بلکہ کچھ شاہانہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو خوش کرتی رہتی

تھی۔ اسے چاول بہت پسند تھے۔ سکول سے آنے کے بعد جب دیکھتی کہ گھر میں روٹی بنی ہے تو بستہ پھینک کر خود چاول پکانے بیٹھ جاتی۔ اس کے بعد سلاد بناتی، پیاز کاٹتی، ان پر لیموں نچوڑتی، دال پہ تڑکا لگاتی اور اعلیٰ قسم کی ٹرے لگا کر خود کو پیش کرتی تو بڑی دونوں بہنیں حیرت اور چھوٹے دونوں حسرت سے اس کی ٹرے کی طرف دیکھتے چلے جاتے۔ سب بہنوں اور بھائی میں وہ واحد بچہ تھی جس کے پاس کھیلنے کو گڑیا اور گڑیا کے کپڑے سینے کے لیے وقت اور دلچسپی بھی ہوتی تھی۔ دوسرے کسی بچے نے کھلونے نام کی کوئی چیز کبھی نہ دیکھی تھی مگر گوپی پیسے جمع کرتی اور اپنے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرتی رہتی تھی۔ اس نے گڈے گڈی کا بیاہ بھی رچ کے رچایا اور جتنا منا سکتی تھی، اپنا بچپن منایا۔

جنگ 71ء کا زمانہ تھا۔ گوپی محض بارہ تیرہ برس کی لڑکی تھی۔ اس لیے اسے جنگ سے بہت خوف آتا تھا۔ رات کی خموشی میں جب ابا اور نیلم باجی گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر محاذوں سے آنے والی گولہ بارود کی دھمک اور روشنیوں کو پرجوش ہو کر سنتے اور دیکھتے تو گوپی گھبرا جاتی تھی۔ سائرن کی آواز آتے ہی کبھی خندق میں چھپ جاتی اور کبھی ایک ننھے منے حفاظتی کمرے میں۔ دوسروں کو آوازیں دیتی مگر کوئی نہ آتا تو اکیلی ہی اپنی جان بچا کر چھپی رہتی۔ سب اس کی اس حرکت پر اسے چھیڑتے مگر وہ پرواہ نہ کرتی۔ اس وقت اسے کیا پتہ تھا کہ کوئی جتنا مرضی خندقوں میں جا چھپے۔ اپنی حفاظت کے سامان کر لے، حوادث زمانہ کی بمباری سے بچ نہیں سکتا۔ قسمت اپنے ٹارگٹ پہ ہمیشہ ٹھیک نشانے لگاتی ہے۔

گوپی بہت دبلی تھی اس لیے نیلم باجی کو ہر وقت اس کی صحت کی فکر لگی رہتی تھی۔ اکثر صبح جلدی جانے کی وجہ سے خالی پیٹ ہی سکول چلی جاتی تو نیلم بھاگم بھاگ توس تھامے بس سٹاپ پر جا پہنچتی اور ڈانٹ کر کہتی "سوکھی کھالے ورنہ مرجائے گی۔" گوپی یہ بات کبھی بھولی نہیں۔ اس نے اس توس کی ہمیشہ لاج رکھی۔ نیلم باجی کا ہمیشہ احترام کیا اور خیال رکھا۔

گوپی کو بچپن سے ہی سونے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ چھوٹی تھی تو گھنٹوں بے سدھ سوئی رہتی۔ بہنیں اور بھائی کبھی کبھار اس کی نیند آزمانے کے لیے اسے صبح نہ جگاتے تو وہ مسلسل سوئے چلی جاتی۔ حتیٰ کہ دوپہر ہو جاتی۔ گرمیوں میں سب صحن میں سوتے تو فجر کے بعد دھوپ اور مکھیاں تڑکے ہی جگا دیتیں۔ سب اٹھ جاتے مگر گوپی کو کوئی فرق نہ پڑتا اور وہ منہ پر کپڑا ڈال کر سوئے چلی جاتی۔ بہنوں اور بھائی کو شرارت سوجھتی تو وہ اس کی چارپائی اٹھا کر بار بار دھوپ میں رکھ دیتے مگر

اسے کچھ پتہ نہ چلتا اور وہ اپنی نیند کے جہان میں کھوئی رہتی۔

اب وہ بڑی ہو گئی ہے مگر اب بھی اسے اپنی نیند بہت عزیز ہے۔ اگر گزری ہوئی رات اسے اچھی نیند نہ ملی ہو تو وہ اگلے روز یہی کہتی رہتی ہے کہ ''میری نیند پوری نہیں ہوئی۔'' بہنیں اب بھی یہ سن کر مسکرا دیتی ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ جب تک اسے اس کی ضرورت کے مطابق نیند نہ ملے وہ نارمل انداز میں نہ کام کر سکتی ہے اور نہ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ اب اس کی زندگی بہت تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ اپنے خوبصورت گھر میں اپنی مرضی سے سوتی جاگتی ہے۔ اپنے کام کے سلسلے میں کئی بار عالیشان ہوٹلوں میں ٹھہرتی ہے مگر نندیا رانی کے لیے اسے اب بھی سو جتن کرنا پڑتے ہیں۔ اسے ہر چیز پرفیکٹ درکار ہے۔ ارد گرد کا ماحول اس کی پسند کا ہو۔ کمرے میں نہ آواز آئے نہ روشنی۔ بستر میں کسی بے اعتنا، رفاقت کی اذیت ہو نہ تکیے پر بیاباں جنگل کی ویرانیوں کا احساس اور رات کا مقابلہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ رات کے اندھیروں اور تنہائیوں میں زخموں کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔ روح کا آزار بڑھ جاتا ہے۔ دستِ عیسیٰ کے معجزاتی لمس کو جی ترسنے لگتا ہے تو نینداس کی سہیلی بن کر اسے اپنی مادرانہ آغوش میں لے لیتی ہے اور تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ہوتا ہے اور اس کی زندگی چلتی رہتی ہے۔

چھوٹی تھی تو سلائی کڑھائی کا اسے بہت شوق تھا۔ سردیوں میں اپنے لیے خاص طور پر ایک اونی ٹوپی بُنتی اور بڑے اہتمام سے اسے پہنتی۔ کانوں پر کنٹوپ چڑھا کر پتلی لمبی سی گوپی جب سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی تو بھائی بہن کھسر پھسر کر کے کہتے ''قائداعظم آ رہے ہیں۔'' مگر اسے کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ وہی کرتی جو اس کے من کو بھاتا۔ شاید لاشعوری طور پر اسے ڈر تھا کہ اس کی شخصیت کہیں بڑی بہنوں اور دو چھوٹوں کے درمیان دب کے نہ رہ جائے۔ اسی لیے اس نے اپنی ایک علیحدہ شناخت اور مختلف سی زندگی گزارنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک عام سی زندگی گزارنے والی عام سی عورت بن کر جینا نہ چاہتی تھی۔ اسے تو کچھ کارہائے نمایاں کرنا تھے۔ کچھ بننا تھا۔ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا۔ سوعنفوانِ شباب میں قدم دھرتے ہی اس نے ریڈیو، ٹی وی کے چھوٹے چھوٹے پروگراموں میں حصہ لینے کی ابتداء کر دی تھی۔ بڑی دونوں باجیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اس لیے گوپی نے سُکھ کا سانس لیا اور آزادی کے ہلکے پھلکے سانس لینا شروع کر دیے۔ بڑی باجی نیلم تو ویسے بھی حد سے زیادہ پروٹیکٹو تھی۔ اتنی کہ الجھن ہونے لگتی۔ ہمیشہ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے، سیدھے راستے پہ چلنے کی تلقین کر کے سر کھا جاتی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے ادھر اُدھر

بھٹکنا ممکن نہ تھا۔ وہ تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی تھی۔ ہلکے پھلکے عمر کے تقاضے کے مطابق عشق محبت کے چکروں کو ہوا میں سونگھ لیتی تھی۔ کبھی غلطی سے کوئی لڑکا کسی بہنا کے لیے رقعہ پھینک جاتا تو اس کی عقابی آنکھیں خط کے پھٹے ہوئے پرزے بھی جوڑ کر پڑھ لیتی تھیں۔ وہ چھوٹی بہنوں کو کسی قسم کا تجربہ کرنے کی اجازت دینا نہ چاہتی تھی۔ اس کے امریکہ سدھار جانے پر گوپی کی سانس میں سانس آیا اور اس نے اللہ کے حضور سو نفل شکرانے کے پڑھ کر پیش کیے کہ باجی ہوتی تو پتہ نہیں کیسے سب کچھ ہوتا۔ بڑی مصیبت ہو جاتی۔

آج جب وہ اکٹھی بیٹھ کر بیتے دنوں کا ذکر کرتی ہیں تو باجی نیلم بھی خود پہ ہنس دیتی ہے کہ زندگی جیسے استاد نے بہت کچھ اسے بھی سکھا اور بتا دیا ہے۔ گزرتے ہوئے کل کی بہت سی باتیں بے معنی محسوس ہونے لگی ہیں۔ نیلم زندگی کی موجودہ سٹیج پر ریلزم کی پرچارک اور شخصی آزادی کی قائل ہو چکی ہے۔ اب ممتاز مفتی کی طرح وہ بھی سوچتی ہے "صراط مستقیم بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔ ایک سیدھی لائن پہ چلو، نہ اِدھر نہ اُدھر۔ تاریک راہوں میں مارے جاؤ۔" اب وہ اپنی بہنوں کو کہتی ہے "زندگی جینے کی چیز ہے۔ موقع ملے تو جی کر ضرور دیکھو۔" وہ پہلے سے بہت بدل چکی ہے۔

گوپی نے جوان ہوتے ہی محسوس کیا کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب رہتی ہے۔ وہ ہنستی، مسکراتی، مذاق کرتی، پٹر پٹر باتیں بناتی تو چھوٹے بڑے سب اس کے گرویدہ ہو جاتے۔ پھر اسے معاشی خود کفیلی کا بھی چسکہ پڑ گیا۔ ریڈیو، ٹی وی کے ننھے ننھے چیک بھی اسے بہت اعتماد دینے لگے اور اسے علم ہوا کہ خود کما کر اپنا خرچ اٹھانا تو بہت مزے کی بات ہوتی ہے۔ غالباً اسی وقت سے اس کی زندگی کا ایک لائحہ عمل سیٹ ہونا شروع ہو گیا اور شوبز کے میدان میں ننھے ننھے قدم بڑھاتی آگے ہی آگے کو چلنے لگی۔ اس میں کچھ کر دکھانے کی امنگ تھی، زندگی کو خود مختاری سے جینے کی ترنگ تھی۔ دنیا میں خود کو منوانے کا ارمان تھا، بند توڑ کر باہر آنے کو اس کے ٹیلنٹ کا طوفان تھا۔ بچپن میں نظر انداز ہونے، سانولی اور خوبصورت نہ ہونے کا توڑ کر کے زمانے اور خود کو دکھانا تھا کہ دیکھو میں کہاں تک جا سکتی ہوں۔ ہے کہیں میری صلاحیتوں کے انت کی حد؟ وہ خوبصورت بن کر چمکی، گرجی، دمکی اور اس نے پرفارمنگ آرٹ کی دنیا کو اپنے فنی چمکتاروں سے جیت لیا۔ لوگ اور نوٹ اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ خوبصورت سنہری رتھ پہ سوار ایک کامیاب لڑکی نے مڑ کر دیکھا، اب کتنا کچھ اس کے پاس تھا یہ بھی دیکھا۔

محبت کا ترنگا ہاتھ میں لہراتا ہوا، اس کی محبت کا دم بھرنے کا وعدہ لبوں پہ لیے اس کے

سپنوں کے شہزادے کا روپ دھارے کوئی ربڑ کی چپل پاؤں میں ڈالے اس کے پیچھے بگٹٹ بھاگ رہا تھا۔ گوپی کے بچے دل کو فقط ایک ہی آرزو تھی۔ وہ کسی سے محبت کرے اور کوئی اس سے محبت کرے۔ دونوں محبت میں ہی جئیں، مریں اور پھر فنافی اللہ ہو جائیں۔ مٹ جائیں۔ شہزادے کو اپنے پیچھے آتے دیکھ کر وہ رکی، مسکرائی اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ طلائی رتھ میں سوار کروا لیا۔ سورج اور زیادہ روشن ہو گیا۔ بادل پاس سے گزرتے، ان کا منہ چومنے لگے اور شہزادے نے سورج کی روشنی سے گرنے والے سونے کے سکوں کی آس میں اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ گوپی نے اس من چاہے کو پاس بٹھایا، اس کے بال سنوارے، اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور سینے سے دل نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ شہزادہ مسکرایا اور بولا "نہیں نہیں بھلا اس کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو بس اپنے ساتھ راج محل میں رہنے دو۔ اچھا کھاؤں، پیوں، اوڑھوں پہنوں گا۔ قیمتی کاروں میں گھوموں گا تو سمجھ لوں گا میرا جیون مکمل ہو گیا۔ اس دل کو اپنے پاس ہی رہنے دو کہ مجھے اس کا کیا کرنا ہے۔"

پٹر پٹر باتیں کرنے والی گوپی خاموش ہو گئی۔ چپکے سے راج محل کا صدر دروازہ کھول دیا اور اسے اندر لے آئی۔ اسے سجایا، سنوارا، من سنگھاسن پہ بٹھایا اور پوجا کے پھول اس پر نچھاور کرنے لگی کہ اس کی طبیعت میں محبت کرنے اور وصول کرنے کی خواہش ہر خواہش سے بڑھ کر رہی ہے۔ اسے محبت میں رہنے کا، لت پت ہو جانے کا جنون ہے۔ افسوس کہ محبت اکثر ایک واہمہ، اک (Illusion) ہی ثابت ہوتی ہے۔ جُل دے جاتی ہے اور محبت کرنے والے لوگ اپنی ذات کا دھوبی پٹرا کر کے تنہا رہ جاتے ہیں۔ یہی ہوا۔ وہ اپنے کرشن کی گوپی بن گئی۔ آنکھیں بند کر کے اس کے گرد ناچنے لگی اور ناچتے ناچتے بھونرا بن گئی۔ اس کا خیال تھا کہ کرشن بھی اس کی سچی محبت کے سحر میں کھو کر اس کے ساتھ ناچنے لگے ہوں گے مگر آنکھیں کھولنے پہ دیکھا کہ اس کا ہم رقص کوئی نہ تھا، بس دھرتی ہی تھی جو اس کے ساتھ گول گول گھوم رہی تھی۔ کرشن مسکراتا رہا۔ رقص سے لطف اندوز ہوتا رہا اور بیٹھا بیٹھا پتھر کا بھگوان بن گیا۔ اسے چھپر کھٹ پہ سونا آخر کو بھول گیا کیونکہ راج محل کے گدیلوں پہ نیند بھی تو بہت اچھی آنے لگی تھی۔ پیدل نہ چلنے سے پاؤں کے چھالے بھی غائب ہو گئے تھے۔ چہرہ پر رونق اور طبیعت پر اعتماد ہو گئی۔ گوپی نے ناچتے ناچتے سکوں کا چھڑکاؤ جاری رکھا اور وہ اسے اپنا حق سمجھ کر سمیٹتا چلا گیا۔ گوپی کو سونا تو ملا پر پی نہ ملے۔ من کی اچھا پوری نہ ہوئی۔ پی سونے کے پہاڑ پر بیٹھا اونچا اور اونچا ہی ہوتا چلا گیا۔ اتنا کہ اس کے دل کو چھونا ممکن نہ رہا۔ گوپی

نے مٹی کا کٹورا آگے بڑھایا۔ کہا" چند ٹکڑے محبت کے مجھے دان کر دو۔" وہ بولا" مٹی کا کٹورا اور میری محبت؟" داسی نے جھٹ سونے چاندی کا کٹورا آگے بڑھا دیا تو وہ کہنے لگا" یہ کٹورا میرے من کو بھا گیا ہے۔ اسے میں نے رکھ لیا ہے۔ کچھ اور لاؤ۔" تبھی سے گوپی کو یہ پتہ چلنا شروع ہو گیا کہ تمنا کی سیما کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ اس سے آزادی ملتے ملتے تو مٹی کی سرحد آ جاتی ہے۔ اس کی اور کرشن کی تمناؤں میں بہت فرق تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ پاٹن بڑھتا چلا گیا۔ گوپی کو اپنی محبت کے بے توقیر ہونے کا احساس دیمک کی طرح چاٹنے لگا اور وہ دکھ کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔

طبیعتاً وہ ایک داسی ہی ہے۔ اپنے شوہر اور بچوں کی عاشق۔ خدمت گار، تابعدار، مقبوضہ اور مفتوحہ۔ اپنے بچوں کے بچے اس کی جان ہیں۔ یوں جیسے جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے۔ اسے اپنے نواسوں کے ساتھ کھیلتے، لاڈ پیار کرتے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ کوئی کسی کو اس قدر بھی اپنا آپ دے سکتا ہے۔ ان ننھوں کے پیار میں وہ اتنی جنونی ہو جاتی ہے کہ ان کی زبان میں توتلی باتیں کرنے لگ جاتی ہے۔

بچپن میں نوکرانیوں، مہترانیوں کے بچوں کو نہلا دھلا کر گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی تو گھر والے اس کے اس شوق پہ حیران ہوتے اور ہنستے تھے۔ اب جبکہ وہ بہت بڑی ہو گئی ہے، اس کا بچوں سے دیوانہ وار پیار کسی طور پہ کم نہیں ہوا ہے۔ سارے خاندان کے ننھے بچوں کے لیے تحفے لاتی ہے۔ پھر بستر پہ چڑھ کر ان کے ساتھ کھیلتے کھیلتے خود بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی ہے تو سب اسے بچوں والی پگلی کہنے لگتے ہیں۔

ہر بچے سے یوں دیوانہ وار پیار کرتے دیکھ کر گھر والے سوچتے ہیں شاید یہ اپنی تمام تر محبت کا کوٹہ اسی طرح پورا کرتی ہے کیونکہ اس کی محبت کی طلب اور پیاس ادھوری رہی ہے۔ اسے کب کہیں امان ملی ہے؟ وہ گرم ریگزاروں میں چلتے چلتے ٹھنڈ سے کپکپانے لگتی ہے تو پھر اپنے بچوں سے چمٹ جاتی ہے۔ اپنے مداحوں کی ڈارلنگ اور معشوق دنیا والوں کو ڈھیروں قہقہے، خوشیاں اور مسرتیں بانٹتی ہے۔

مگر اس کا دل ایک ایسا بچہ ہے جو کسی طور بہلتا نہیں۔ وہ سچ جانتی ہے کہ اس کے نصیب میں ایک بہت بڑی کمی ہے مگر سچ راحت کب دیتا ہے، الناز ہر کا پیالہ ہی منہ سے لگا دیتا ہے۔ کسی کے اپنا نہ ہونے کا دکھ زہر بن کر قطرہ قطرہ دل سمندر میں گرتا رہتا ہے تو میٹھا پانی بھی کڑوا ہو جاتا ہے۔ آج وہ زندگی کی اس منزل پر خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ سمندر سے ڈرتی ہے کہ کہیں سمندر

اسے ہی نہ پی جائے۔

گوپی ہر ایک کا خیال رکھتی ہے۔ سخی ہے اور اس کا ہاتھ دان کرنے سے رکتا اور تھکتا نہیں۔ خاندان اور خاندان سے باہر لوگ جس میں رشتہ دار، دوست احباب، گھریلو ملازم بھی شامل ہیں، اس کی فیاضی اور حساسیت سے فیض اٹھاتے ہیں۔ کسی کا علاج کروا رہی ہے تو کسی کے بچے کی فیس بھر رہی ہے۔ کسی کا ٹوٹا ہوا مکان بنوا رہی ہے تو کسی ضرورت مند کو ماہانہ خرچ دے رہی ہے۔ ہر کوئی اس سے ہی اپنی مالی غرض بیان کرتا ہے اور وہ حتی الوسع اسے پورا بھی کرتی ہے۔ اس معاملے میں وہ بہت خوش قسمت ہے۔ اللہ اور لکشمی دیوی دونوں ہی ماشاء اللہ اس پر خوب مہربان ہیں مگر دل کا نگر آباد نہ ہو تو دنیا بھر کی دولت اس ایک کمی کا مداوا کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

شوبز اور ڈرامہ رائٹنگ، گلوکاری کی دنیا میں اپنی دھاک بٹھا دینے والی بشریٰ میں ایک کامیاب عورت ہونے کی وجہ سے حد درجہ خود اعتمادی آ گئی ہے جس کی وجہ سے اُسے آج خاندان بھر میں اسے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ سب اسے عقلمند، بردبار، خیر خواہ سمجھتے ہوئے ہر مسئلے میں اس سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور اس کے خیال کو عزت اور اہمیت دیتے ہیں۔ وہ جغرافیائی طور پر دور ہونے کے باوجود دلی طور پر سب سے قریب رہتی ہے۔ سب کا حال پوچھتی ہے۔ خیال رکھتی ہے اور سب کے دکھ سکھ میں انوالو رہتی ہے۔ دور پار کے رشتہ داروں سے بھی اس نے کبھی تعلق نہیں توڑا اور ان کے مسائل اور زندگیوں سے خود کو آگاہ رکھتی ہے۔ سارے خاندان سے اسے خصوصی محبت اور توجہ ملتی رہتی ہے۔ احمد بشیر اپنی اس بیٹی سے خاص طور پر بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور اس کی کراچی سے آمد کے منتظر رہتے تھے۔ وہ آتی تو بانہیں پھیلائے اس کا استقبال کرتے۔ وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر ان سے لاڈ پیار کرتی تو نہال ہو ہو جاتے اور پہلا سوال یہ کرتے کہ "کتنے دن رہو گی۔" وہ کراچی سے ان کے لیے پام فریٹ مچھلی لاتی جسے وہ شوق سے پکوا کر کھاتے اور پھر اس کے گن گاتے رہتے۔ دوسری بیٹیاں اور بہن پروین مذاق سے چھیڑتیں۔ "یہ بھی گوپی کے گلیمر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔" تو گوپی اور اس کے ابا سنی اَن سنی کر دیتے۔ انہیں تو بس ایک دوسرے کی محبت درکار تھی۔ ابا اسے سراہتے، پیار کرتے تو وہ خوش ہو جاتی۔ یہی ایک ایسا مقام تھا جہاں اسے پیار اور پذیرائی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ملتا تھا۔

پھر وہ بیٹیوں سے کہتے "گوپی آئی ہوئی ہے۔ اس کے پاس وقت تھوڑا ہوتا ہے۔ تم سب بہنیں میرے پاس آ جاؤ تا کہ ہم سب اکٹھے اس سے ملاقات کریں اور کوئی لمحہ ضائع نہ ہو۔"

کئی بار لڑکیاں اکیلے میں ان کے علاوہ بھی ایک دوسرے سے ملنا چاہتیں مگر وہ اصرار کرتے کہ ''سب میری آنکھوں کے آگے رہیں، کوئی ملے نہیں۔'' وہ عورتوں کے ڈھیر میں چھپے مزے سے بستر پر لیٹے چاروں طرف سے ہونے والی زنانہ باتیں مزے سے سنتے، خوش ہوتے رہتے۔ ایسا لگتا تھا بیٹیوں، بہن، بیوی اور خاص طور پر گوپی کے ہونے سے وہ زندگی کی توانائی حاصل کرتے ہیں اور بڑھاپے کے مشکل دنوں کو بے رنگ اور بے مزا نہیں ہونے دیتے۔ وہ چلے گئے تو بشریٰ انصاری عرف گوپی کا کوئی سچا عاشق نہ رہا۔ اس کے دل کے دروازے سُنجے ہو گئے اور اس کی زندگی سے ایک بہت بڑی پازیٹیو فورس غائب ہو گئی۔ اب وہ لاہور آتی بھی کم کم ہے۔ پام فریٹ مچھلی بھی نہیں لاتی۔ اپنے آپ کو اپنے شوبز کے کاموں اور بچوں کے بچوں کی خاطر داری میں مصروف رکھتی ہے۔ شوہر اور بچوں کو اس نے جو کچھ ممکن تھا، دیا۔ محبت، خدمت، دولت، عزت، وفا اور دلداری مگر آج خودلق و دق صحرا میں بانہیں پھیلائے کھڑی آسمان کی طرف حیرت سے دیکھ کر سوچتی ہے کہ میرے حصے کے ابر کا ٹکڑا اب تک مجھ پر کیوں نہیں برسا؟ برسوں سے بحرِ مردار میں کھڑے کھڑے میں لوہے کی کیوں بن گئی ہوں؟

رنگ، روپ، رقص میں گندھی مدرتھریسا لڑکی

چوتھا سب سے چھوٹا من موہنا دلربا چاند قلزم ہے جسے دنیا اسماء کے نام سے جانتی ہے اور گھر والے مانو کے پیار بھرے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بچپن سے ہی سب کی لاڈلی، سب کی پیاری، راج دلاری سمجھی جاتی تھی اور اب تک ہے۔ گورا چٹا رنگ، نرم و نازک پیر، بھولا بھالا چہرہ اور گھنگھریالے بالوں والی اس گڑیا کو ہمیشہ "Thing of Beauty" سمجھا گیا اور اس نے گھر والوں سے ڈھیروں پیار پایا۔ اس میں بھی تخلیقی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں مگر منہ بند آتش فشاں کو مناسب وقت کا انتظار تھا۔ بال بچے بڑے کر کے شوہر کی رضامندی سے وہ پرفارمنگ آرٹس کی دنیا میں آئی تو اس کے لیے دروازے کھلتے چلے گئے اور اس کے کام کو ستائش اور پذیرائی ملتی رہی۔ اس کے دوست شوہر نے اپنی بیوی کی خوشی دیکھتے ہوئے اس کی کام کرنے کی جائز خواہش کا احترام کیا۔ خواہ مخواہ راستے کی دیوار بننے کی جگہ اس کو سہارا دینے والا مضبوط ستون بن جانا بہتر سمجھا جس کی وجہ سے مانو کو بھی اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کے اظہار کا بھرپور موقع ملنے لگا۔

وہ رقص کرنے، رقص سے متعلق پروگرام کرنے میں بہت دلچسپی رکھتی تھی۔ سو اس نے ٹی وی کے ایک چینل کے لیے ''رقص رنگ'' کے نام سے خوبصورت پروگرام پیش کر کے خوب داد وصول کی۔ گھریلو محفلوں میں جب وہ رقص کرتی ہے تو دیکھنے والوں پہ سحر سا طاری ہو جاتا ہے۔ شاید مانو کو پتہ ہے کہ زندگی کی پری بھی تو رقص ہی کرتی رہتی ہے۔ بھگت کبیر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''پوری کائنات میں مسلسل ڈھول بجنے کی آواز آ رہی ہے۔'' ویسے ناچ جتنا ایک قدرتی عمل شاید ہی کوئی اور ہو۔ ناچ کا مقصد انسانوں کو اپنے آپ سے اور طبعی دنیا کے خیال سے آزاد کروانا ہی تو ہوتا ہے۔ مانو بھی اپنے اظہار کی آزادی چاہتی تھی۔ سو اس نے بہت سے کاموں میں خود کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اداکاری، ہدایتکاری، فرنیچر ڈیزائننگ، لباس ڈیزائننگ، لکھنا، کھانے پکانا وہ سبھی کچھ خوش اسلوبی سے کر لیتی ہے۔ حالانکہ اسے قدرت کبھی کبھار صحت کے مسائل سے بھی دو چار کر دیتی ہے مگر وہ ہمت نہیں ہارتی۔ اس میں ہمت اور لگن ہے، لہٰذا ڈٹی رہتی ہے۔ کئی بیماریوں، آپریشنوں کے باوجود اپنا کام ایک تسلسل سے جاری رکھے ہوئے ہے۔

مانو اپنی دنیا اور زندگی میں بہت مصروف اور مگن رہتی ہے۔ اس کا کنبہ بھی ماشاء اللہ دوسری بہنوں کے کنبے سے بڑا ہے، لہٰذا بات وہیں شروع وہیں ختم کر لیتی ہے۔ دکھ سکھ تو سب کی ہی زندگی میں ہوتے ہیں مگر وہ اپنے حصے کے دکھ زیادہ تر اپنے ہی پاس رکھنا پسند کرتی ہے۔ زیادہ واویلا نہیں مچاتی۔ اس کی زندگی کے ڈرامے کے کردار چونکہ اسی سٹیج پہ سامنے ہی موجود رہتے ہیں، سو ان سے ملنے والے مسائل کو وہیں نمٹا لیتی ہے اور پھر وہیں سے تقویت بھی حاصل کرتی ہے۔ بڑی بہنوں کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کی زندگی میں کردار کم اور تنہائی زیادہ ہے۔ اس لیے وہ گھبراتی ہیں تو کھڑکی کھول کر تازہ ہوا کا سانس لینا پسند کرتی ہیں۔ فوراً ایک دوسرے کو فون کر کے اپنے مسائل زیست زیر بحث لاتی ہیں۔ یہاں مانو کی طبیعت ان سے مختلف ہو جاتی ہے مگر پھر ہر ایک کا زندگی کرنے کا اپنا اپنا منفرد طریقہ کار تو ہوتا ہی ہے۔ مانو سے سب پیار کرتے ہیں اور اس کا خیال کرتے ہیں۔ یہ بھی سوچتے ہیں کہ مانو ایک موم کی گڑیا ہے۔ ذرا سی آنچ لگی تو پگھل جائے گی مگر مانو نے اپنی زندگی میں آنے والے متعدد طوفانوں کا بہادری سے مقابلہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ روایتی، کمزور عورت نہیں بلکہ ایک مضبوط، لوہے جیسے ٹھوس اعصاب کی مالک شخصیت ہے۔ وہ بہت کچھ برداشت کر جاتی ہے۔ اسی لیے احمد بشیر اسے کبھی کبھی بی بی رابعہ بصری کہہ کر بھی بلایا کرتے تھے۔ مانو نے ان کی اور امی کی نگہداشت کا ذمہ جب اپنے سر اٹھایا تو اسے یہ علم نہ تھا کہ وہ عمر کی

آخری سرحد تک اس ہی کے گھر میں، اس کی آنکھوں کے سامنے رہیں گے اور وہیں سے رخصت ہوں گے۔ ابا کو مانو سے بہت پیار تھا کیونکہ وہ بھی ان سے بہت پیار کرتی تھی اور مانو کا میاں عباس چونکہ اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہے سو وہ بھی بیوی کے معشوقوں یعنی اس کے ماں باپ سے پیار کرتے کرتے ان کا بیٹا بن گیا۔ داماد اور سسرال کی تفریق ختم ہوگئی۔ سبھی ایک چھت کے نیچے چین سے رہنے لگے اور وقت گزرنے لگا۔ احمد بشیر کے آخری سال آرام سے گزرتے چلے گئے۔

مانو نے شادی کے بہت سے شروع کے سال اپنے شوہر کی بڑی اور پہلی بیوی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے رہتے گزارے اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بڑی اور چھوٹی بیگم میں بہنوں سے بڑھ کر سلوک ہوگیا۔ دونوں یک جان دو قالب ہوگئیں۔ ایک جیسے کپڑے پہننا، اکٹھے شاپنگ کرنے جانا، انصاف کے ساتھ ایک ہفتے بعد شوہر سے دستبردار ہونا، ایک دوسری کی ضروریات کا خیال رکھنا ان کے لیے معمول کی بات بن گئی۔ مانو بڑی بیگم سے زیادہ خوبصورت تو تھی ہی اپنے شوہر کے بچوں کی ماں بھی ہوئی جس کی وجہ سے اسے گھر میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بڑی کے دامن میں کسی پھول نے نہ کھلنا تھا، یہ علم تھا مگر مانو نے اس کے گود لیے بچے سے بھی اسی طرح محبت کی جیسے اپنوں سے کی جاتی ہے۔ مانو نے اپنی اہمیت کا کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بڑی کے دل کا خیال رکھا بلکہ یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کے شوہر بڑی سے کہیں بے اعتنائی نہ برتنے لگیں۔ وہ انہیں ہرگز یہ اجازت نہ دیتی کہ وہ بڑی بیگم کو بھول بیٹھیں یا نظر انداز کر جائیں۔ ان کا گھرانہ بڑے توازن سے چلتا رہا مگر پھر ایک حادثہ ہوا اور بڑی بیگم ہمیشہ کے لیے ان سب کو چھوڑ گئیں۔ ان کی وفات کا جتنا غم مانو نے کیا شاید ان کی سگی بہنوں نے بھی نہ کیا ہوگا۔ مانو بڑی کے جانے پہ حواس ہی کھو بیٹھی اور سالوں اُس صدمے سے باہر نکل نہ پائی۔ شاید یہ سب ایک کہانی محسوس ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ مانو نے اس سے کبھی نہ بغض رکھا اور نہ سوکنوں والی عداوت۔ بڑی سے وفا اور محبت کا ثبوت تو یہ ہے کہ آج تک مانو ان کے لے پالک بیٹے کو اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتی ہے اور اس کی پرورش کر رہی ہے۔ اس بچے کے اصل ماں باپ شہر میں ہیں اور اصلیت سے باخبر ہیں مگر بیٹا مانو اماں اور بابا کے زیرِ سایہ ہی رہنا چاہتا ہے کہ وہ انہی کو اپنے اصلی والدین تصور کرتا ہے۔

مانو میں ایک انوکھی اور نرالی عادت ہمیشہ زندہ نظر آتی ہے۔ گلشن میں چلتے پھرتے، خوشے چنتے، نظارہ لیتے، خوشبوئیں دامن میں بھرتے اس کی نظریں اکثر ایسے گلوں پر مرکوز ہو کر جم

جاتی ہیں جو اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گر چکے ہیں۔تن تنہا ہوں،توجہ کے طالب اور محبتوں کے متلاشی ہوں۔جنہیں گھروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی راحت اور گرم آسودگی میسر نہ ہو۔بلائیں جان سے چمٹی ہوں اور بے کلی سرگرداں رکھتی ہو۔مانو کا دل ایک اجلا کنول کا پھول ہے۔جھٹ سے ایسے گلوں کو دامن میں سمیٹ کر گھر لے آتی ہے۔کتنے ہی برس ٹی وی کی ایک نامور اداکارہ اس کے گھر کے فرد کی طرح اس کی زندگی میں شامل رہی۔وہ مانو کے ساتھ آتی جاتی،اٹھتی بیٹھتی،کھاتی پیتی،پھر اسی کے گھر میں ٹھہری کیونکہ اس کا اپنا گھر اس کے قدم واپس باہر کو لوٹا دیتا تھا۔وہاں دکھوں کا ایک بھنڈار کھلا تھا اور تپش سے روح جلنے لگتی تھی۔

مانو نے اسے گود لے لیا اور برسہا برس گزرتے گئے۔وہ جوانی سے پیری کی دہلیز پر آ گئی اور ہیروئن سے ماں کے رول آفر ہونے لگے تو مانو کی گود سے اتری اور بالآخر اپنے گھر میں چھپ کے بیٹھ گئی۔اب وہ بھائی بہنوں کے بچے کھلا کر وقت گزار لیتی ہے۔اسی طرح مانو زندگی کے ہر موڑ پر کسی نہ کسی اکیلی،لاوارث،ضرورت مند لڑکی کا ہاتھ تھام لیتی ہے اور اسے گھر کا سکھ دینے کی کوشش کرتی ہے۔آج کل بھی ایک جواں اداکارہ اس کے سایۂ عاطفت میں ہے۔مانو اس کی بھی دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی اور اسے گھر کے معمولات میں شامل رکھتی ہے کیونکہ وہ بھی زمانے سے اکیلے ہی نبرد آزما ہے اور ماں جیسی پرسکون گود کی بھلا کس کو ضرورت نہیں ہوتی۔ مانو کے شوہر عباس بھی اس ہی کی طرح دل کے نرم اور وسیع القلب ہیں،لہٰذا اس قسم کی سخاوت میں مانو کو انہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور کام چلتا رہتا ہے۔کئی قسم کی دکھیاریاں،اللہ ماریاں،تنہائیوں کی ستائی ہوئی،دھتکاری ہوئی عورتیں،لڑکیاں،جن میں رشتہ دار،دوست بھی شامل ہیں،مانو اور عباس کے گھر بلا روک ٹوک آتی جاتی رہتی ہیں۔گلبرگ میں ان کا ماڈرن سٹائل گھر کسی گاؤں کے ڈیرے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔جہاں سب جمع ہو جاتے ہیں۔کبھی کوئی پڑاؤ ڈال دیتا ہے اور کبھی کوئی اٹھ کر اپنا رستہ لیتا نظر آتا ہے۔فیملی والوں کے لیے بھی اب مانو ایک امی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ امی بھی وہیں ہوتی ہیں،دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ عباس اپنے سسرالی رشتہ داروں کو دیکھ کر روایتی دامادوں کی طرح ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ دل کھول کر ان کی پذیرائی کرتے ہیں۔

پتہ نہیں مانو رابعہ بصری ہے کہ نہیں مگر ایک سپر نیک روح ضرور ہے جو انسانیت کی خدمت کے لیے ایدھی کی طرح ہمہ وقت کمربستہ رہتی ہے۔بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آج اس کا

سب سے بڑا انسانی ہمدردی کا پراجیکٹ ماضی کی ایک بہت اہم، لازوال منفرد انداز کی حامل اداکارہ روحی بانو ہے جس پر مانو ہر وقت مائل بہ کرم رہتی ہے۔ کسی گورنمنٹ ادارے کی گرانٹ، این جی او کا فنڈ، تحفے، تمغے، ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ کے بغیر وہ ایک عرصے سے روحی بانو کی گارڈین اینجل (Guardian Angel) بنی ہوئی ہے۔ اس کو اس کام پر نہ کسی نے اکسایا، ورغلایا نہ سمجھایا مگر یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ روحی کی کیئر ٹیکر بنے، سو وہ بن گئی۔ روحی وہ راندۂ درگاہ، کچلی ہوئی روح ہے جسے وقت اور زمانے نے ٹھوکریں مار مار کر پاگل کر دیا ہے۔ اس نے ہوش وخرد کی دنیا سے ناطے توڑ رکھے ہیں اور اس کے خونی رشتوں نے اس سے۔ ایک عظیم، معتبر، فنکارہ وہ اپنے گھر میں تن تنہا، اپنی وحشتوں کے ساتھ سالہا سال سے زندگی بسر کر رہی ہے اور اس کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کا اجڑا ہوا غلیظ بھوت بنگلہ گھر اپنے واحد مکین کے ذہنی انتشار کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس گھر میں اگر کوئی ذی ہوش جا گھسے تو کئی راتیں چین سے سو نہیں سکتا۔ روحی شیزوفرینیا کی مریضہ ہے۔ اسے کبھی خوفناک چہرے نظر آتے ہیں تو کبھی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی اس کے گھر کی گیس کھلی رہ جاتی ہے تو کبھی اس کے پردوں کو آگ لگ جاتی ہے۔ کبھی اس کا ساتھی کتا بھوک سے تنگ آ کر اس کا ہی سارا کھانا کھا جاتا ہے۔ وہ اپنے مرے ہوئے بیٹے کے کپڑوں، جوتوں میں ملبوس اکیلی بیٹھی خلاؤں میں گھورے چلی جاتی ہے اور کبھی بے انتہا سُر لیے گلے سے ''زندگی تماشہ بنی'' گانے لگتی ہے۔ اسے پتہ ہے کہ وہ ایک بڑی اداکارہ ہے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ تھی مگر وہ سمجھتی ہے کہ وہ ہے۔ وہ فن کے آسمان پر ستارہ بن کر جگمگاتی تھی مگر پھر دھیرے دھیرے اس کی ٹمٹماہٹ کم ہونے لگی اور کم ہوتے ہوتے ایک روز بالکل ہی معدوم ہوگئی۔ لوگ بھول گئے کہ کوئی روحی بانو بھی ہوا کرتی تھی۔ کون ایک گمشدہ فنکار کا پیچھا کرے، اس کے شب و روز کے معاملات کا خیال رکھے۔

مگر مانو نے اسے نہیں بھلایا۔ وہ دفن شدہ روحی بانو کو بار بار کھود کر باہر لے آتی ہے۔ جب روحی بھوکی ہوتی ہے اسے کھانا پہنچاتی ہے۔ بے لباس ہوتی ہے تو کپڑے پہناتی ہے۔ سردیوں میں رضائی سے ڈھانپ آتی ہے۔ بازار سے شاپنگ کرواتی ہے۔ پھر گھر لا کر مہینوں سے گندی میلی، بدبودار پرائیڈ آف پرفارمنس فنکارہ کو گرم پانی سے نہلاتی ہے۔ اس کے سر میں شیمپو لگاتی ہے۔ ایک بچے کی طرح کنگھی پھیرتی ہے۔ سجاتی بناتی ہے۔ روحی کی جو ذہنی حالت ہے اس کی وجہ سے وہ مانو کو اپنی ایک قدردان فین سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی مگر مانو اس کا برا نہیں مناتی اور روحی کا یہ بھرم قائم رہنے

دیتی ہے۔ نیک دل، خداترس مانو شاید مدر تھریسا کا کوئی اوتار ہے کیونکہ اپنی زندگی بھرپور اور مصروف ہونے کے باوجود کون کسی فراموش شدہ انسان کو اتنا وقت اور توجہ دے سکتا ہے؟ اس کے پاس، گھر، شوہر، بچے، نوکر چاکر، اس کا فن، پروفیشن سبھی کچھ ہے مگر اس نے خراب صحت کے باوجود ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ روبی کا اکلوتا بیٹا بھی قتل ہونے سے پہلے مانو اور عباس سے ہی مدد کا طالب اور مسلسل رابطے میں رہتا تھا۔ دونوں نیک روحیں ان دونوں ماں بیٹے کی تب بھی ہر ممکن مدد کیا کرتے تھے اور اب بھی کرتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ اللہ کے نیک بندے ہیں جو دنیا میں اللہ کے کام کر رہے ہیں۔ کوئی مولوی صاحب یا مذہبی درس دینے والی ہائی کلاس بیگم، نمازی، حاجن بی بی ایسی دھتکاری ہوئی عورتوں کی کبھی خبر گیری نہیں کرتی جنہیں زمانے نے بھلا دیا ہو اور جو اتنی پست معیار کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں کہ انہیں انسان کہنے اور سمجھنے سے بھی دل گھبراتا ہو۔ مانو ایسی ہی عورتوں کی سہیلی بن جاتی ہے۔

انہیں اپنا پلو پکڑا دیتی ہے اور ان سب جھمیلوں میں پڑنے کے باوجود خوش رہتی ہے۔ اسے اداس لوگ اداس نہیں لگتے بلکہ وہ مرجھائے ہوئے اداس لوگوں میں زندگی کے رنگ اور جینے کی امنگ بھر دیتی ہے۔ جب وہ قدرے کھلنے لگتے ہیں تو مانو تیتری کی طرح رقص کرنے لگتی ہے کہ اس کا بہترین اظہار مسرت اس کا رقص ہوتا ہے۔ اس پل زمین اس کے قدموں کے نیچے تھر کنے لگتی ہے اور آسمان نیلی چھتری تان لیتا ہے۔ وہ بجتی ہے، سنورتی ہے، چاندی کے جھمکے، پائل پہن کر چھم چھم کرتی پھیریاں لیتی تو اسے اپنے لاڈلے ابا احمد بشیر یاد آ جاتے ہیں جو اپنی اس منی سی بیٹی سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ اس کی اداؤں کے دیوانے اور اس کے فن کے مداح تھے۔ وہ تیار ہو کر انہیں ہمیشہ اپنا جلوہ دکھاتی تو وہ خوش ہو کر اخبار ایک طرف رکھ دیتے اور تعریفی نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتے۔ آج وہ اپنی ذات کی تکمیل کے لیے محبت کر رہی ہے۔ اپنی زندگی سے، اپنے دوستوں اور اپنے کام سے۔ وہ پھول پھل رہی ہے۔ کھل رہی ہے، مسکرا رہی ہے۔ اسے ترجیحات میں توازن رکھنا یعنی جینا آ گیا ہے۔ اس نے اپنے حصے کے بہت سے کشٹ کاٹے ہیں مگر آج وہ رنگوں، نغموں، خوشبوؤں میں بسی اڑی اڑی پھر رہی ہے۔ مانو بہنوں میں سب سے چھوٹی ہے مگر ذمہ داری اور درجے، مرتبے کی وجہ سے سب کی بڑی بنی ہوئی ہے۔ فارغ وقت میں اپنی پوتی سے کھیلتی ہے اور بہو کے ساتھ مل کر فرنیچر بزنس کو بڑھانے کی ترکیب لڑاتی ہے، کپڑے

سکتی ہے اور نہ جانے کچھ کر لیتی ہے۔

مانو اپنے اصلی نام قلزم کی طرح ایک گہرا سمندر ہے جس کی تہہ میں چھپے لاتعداد مرجان ابھی دریافت ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

---------O---------

کہتے ہیں اگلے زمانوں کے بہت سے شہر صدیوں سے پانی میں ڈوبے، چپ سادھے ہوئے ہیں۔ کشتی بان سناتے ہیں کہ ایک ایسے ہی شہر کے کلیسا سے کبھی کبھار گھنٹیوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ سوائے گوپی کے یہ چاند لڑکیاں بھی مدتوں زیر آب رہیں مگر ان کی صلاحیتوں کے کلیساؤں سے گھنٹیوں کی آوازیں آنا بند نہ ہوئیں۔ پھر کبھی کبھار ایک ایسا دن بھی آ جاتا ہے جب یہ آوازیں پھولوں کے گجروں کی طرح سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہیں۔ کشتی بانوں کو جزیرے قریب اور منزلیں خوبصورت نظر آنے لگتی ہیں۔

ممتاز مفتی کہا کرتے تھے.... احمد بشیر کے جینز کا جوار بھاٹا ان لڑکیوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔ ان کی یہ بات سچ ہے کہ چاروں بہنیں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کو بے چین رہتی ہیں۔ زندگی کا گورکھ دھندا کب کسی کو سمجھ میں آتا ہے مگر وہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کی رگوں میں تخلیقی ہنر کے لہو کی آمیزش، ایک قدرتی عمل تھا۔ احمد بشیر اور محمودہ کے بچوں میں سے کسی نے رائٹر، اداکار، ہدایتکار، گلوکار، ڈیزائنر تو بننا ہی تھا۔ آرٹ، کلچر، ٹیلنٹ کے دریا گھر میں ہی بہہ رہے تھے۔ سو یہ تو ہونا ہی تھا۔

ان کا اکلوتا بیٹا کم عمری میں ہی ملک سے باہر چلا گیا۔ سو وہ اس تمام بگاڑ سنوار اکھاڑ پچھاڑ سے محفوظ رہا۔ اس نے ایسا کوئی پرخار راستہ نہ چنا جس پر چل کر اپنے آپ کو منوانا لازم ہو جائے۔ ایسا کوئی آگ کا دریا پار نہ کیا جس میں بھسم ہو جانے کا خطرہ یقینی ہو۔ معاشی آسودگی کی گولی نے اسے پرسکون رکھا اور وہ ٹھیک رہا مگر لڑکیاں آگ کے گولے سے گزر کر دوسری طرف جانے پر کمربستہ ہو گئیں اور زندگی کی مبینہ، خطرناک تار پر ہاتھ میں لوہے کا مضبوط ڈنڈا تھامے نپے تلے قدم اٹھاتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ یہ لڑکیاں روشن خیال، کشادہ ذہن اور پراعتماد تھیں۔ صلاحیت اور قابلیت سے یوں بھری ہوئی تھیں جیسے انار میں رس سے بھرے دانے ہوں۔

یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں گاتی، مسکراتی سٹیج، ٹی وی پر پرفارم کرنے کی خواہش رکھنے والی لڑکیاں پیدا ہو جائیں تو مصیبت بھی ساتھ ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی انہیں اپنے

ڈھب اور مرضی سے جینے کا اذن نہیں دیتا۔ اگر ان بیٹیوں کی جگہ چار اور بیٹے ہی پیدا ہوئے ہوتے تو وہ رج کے اپنے تخلیقی شوق پورے کرتے اور ہنر دکھاتے۔ کوئی ان کے سانس روکنے کے لیے گلے میں پھندے نہ ڈالتا۔ انہیں نہ کوئی روکتا ٹوکتا، نہ تنقید کا نشانہ بناتا۔

کراچی میں رہتے تھے تو بچیاں چھوٹی تھیں۔ آنگن میں پریوں کی طرح اڑتی پھرتی تھیں۔ احمد بشیر موسیقی کے رسیا تھے اس لیے بڑے بڑے موسیقاروں، گلوکاروں کا گھر میں آنا جانا تھا۔ آلاتِ موسیقی گھر میں پڑے رہتے تھے۔ لاہور شفٹ ہوئے تو لوگوں نے کہا "اب کوئی اور ڈیکوریشن پیس لے آؤ کہ لڑکیوں کے رشتے نہیں آئیں گے۔"

یہ معاشرہ اس حقیقت کا ادراک نہیں رکھتا کہ حسنِ فن کا شعور آپ کی ذہنی بالیدگی کی دلیل ہوتا ہے۔ سیکولر قدروں میں یہ کشش ہوتی ہے کہ وہ سکھاتی ہیں کہ انسان کبھی مرتے نہیں۔ وہ تو بس دنیا کے جلال و جمال کا مظاہرہ دیکھنے کو آپ میں اور پھر دوسروں کو اسی مسرت کا موقع دے کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ فنون کی روح میں پوشیدہ جلوے کائنات میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ انہی سے روشنی ملتی ہے اور یہی آپ کو شانت رکھتے ہیں۔ دنیا میں انسان صرف کھانے پینے نہیں بلکہ ایک منفرد تجربہ کرنے آتے ہیں اور تجربہ ہی زندگی ہوتا ہے۔

فنون سے وابستہ لوگ معمولی نہیں بلکہ منتخب ہوتے ہیں۔ وہ ارد گرد لطافت اور سکون پھیلاتے ہیں۔ انہیں عزت، پیار، تکریم، قبولیت اور مواقع دینا ہی درست بات ہے۔

احمد بشیر کی چاروں بیٹیاں سادہ، ایماندار، مخلص، دوسروں پر جلد ہی اعتماد کر لینے والی خواتین ہیں۔ وہ کئی بار جذباتی استحصال کا بھی شکار ہو جاتی ہیں مگر ان کی سوچ مضبوط اور مثبت رہتی ہے۔ آج یہ ایک دوسرے کی سہیلیاں، بانہہ بیلیاں ہیں۔ ان کے دکھ سکھ سانجھے اور جانے پہچانے ہیں۔ اپنی سوچ اور ہمت سے زندگی کی راہوں میں دیئے روشن کیے جا رہی ہیں۔ کبھی رو رہی ہیں اور کبھی مسکرا رہی ہیں۔

---------O---------

مضامین ۔ خیال میں

نئے زمانے کا آدمی

فرخ نگار عزیز کے والد میاں عبدالعزیز عرف فلک پیما، کے بارے میں لکھنے بیٹھی تو سوچا کیا لکھوں؟ ان کی بیٹی فرخ نگار عزیز صاحبہ کے گھر سے ان کے والد کی تین کتابیں اٹھالائی اور بیچ بیچ میں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ گمان اغلب تھا کہ پرانے زمانے کے انداز میں لکھے گئے یہ خشک مضامین منہ کا مزا خراب اور پھیکا کر کے رکھ دیں گے مگر یقین جانیے سب اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ جوں جوں پڑھتی گئی منہ میں شیرینی گھلتی گئی اور آخر میں تو زبان نے باقاعدہ چٹخارے لینا شروع کر دیئے۔

ان مضامین میں وہی طنز، مزاح، لطافت، ظرافت نمایاں ہے جو انشائیوں میں موجود ہوتی ہے مگر فلک پیما اپنے پڑھنے والوں کو شعوری یا غیر شعوری سطح پر کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیتے ہیں۔ ان کی تحریر مقصدیت سے خالی نہیں بلکہ لبالب بھری ہوئی ہے۔ ان کا اپنے لیے فلک پیما نام کا انتخاب ان کی اپنی ذات میں اعتماد ظاہر کرتا ہے۔ واقعی جو شخص خود کو ستاروں کا رازداں اور زمین کی پہنائیوں سے بہت دور سمجھتا ہو۔ اس کا سیلف امیج ظاہر ہے کہ بہت مضبوط اور مثبت ہی ہوگا۔ اسی لیے ان کے خیالات کی اڑان بھی خوشگوار، ارفع اور بلند بالا نظر آتی ہے۔ اُن کی نثر میں موتیوں کی لڑی کی طرح دمکتے بہت سے One-liners ٹکے ہوتے ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود معنی کے اعتبار سے بھرپور اور مکمل ہیں۔ ان کے کچھ One-liners ملاحظہ کیجیے۔

1) میں الفاظ کی مٹی میں سونا تلاش کرتا ہوں۔

2) عشق کی غلامی سب سے بڑی شہنشاہی ہے۔

3) میں سال کے تین سو پینسٹھ ناول لکھتا ہوں۔

اس طرح کے مرصع فقرے، پڑھنے والے کے ذہن میں ایک خوشگوار احساس اور تاثر چھوڑتے ہیں اور یہی کامیاب ادب کی نشانی ہے۔ دراصل وہ کوئی خشک قسم کے مضمون نگار نہیں بلکہ رومانوی تحریک سے وابستگی رکھنے والے، خوبصورتی کے قدردان اور پرستار لکھاری تھے۔ ان کے نزدیک خوبصورتی اور رومان کا تصور محدود نہیں بلکہ لامحدود تھا۔ وہ اپنی تحریروں میں فرد، رویوں، تاریخ، نظریات غرضیکہ زندگی کی ہر جہت میں خوبصورتی کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

انہیں اپنی قوم کا صدیوں تک مستقلاً ایک خوابیدہ کیفیت میں رہنا پریشان کرتا ہے۔ انہیں چونکہ لوگوں میں انٹلیکچوئل گروتھ بہت ضروری لگتی ہے۔ اس لیے وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ مسلمانوں نے بنی آدم کی انٹلیکچوئل ڈویلپمنٹ کے لیے اتنی صدیوں تک کیا کیا ہے؟ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ برصغیر کے لوگ ایک غیر متحرک قسم کی فضا میں جیتے اور بس یونہی مرجاتے ہیں۔ ان میں عمل کی صلاحیتیں موجود تو ہوتی ہیں مگر خوابیدہ ہیں۔ علامہ اقبال کی طرح وہ بھی حرکت یعنی عمل میں یقین رکھتے تھے۔ اس لیے کچھ ناقدین انہیں علامہ اقبال کا ہم عصر بھی کہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ علامہ اقبال سنجیدہ شاعری اور فلسفہ کے ذریعے اپنا پیغام دیتے اور فلک پیا نغماتی، گنگناتی نثر کے ذریعے اپنے قارئین کی سوئی ہوئی حسیات کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے بعض مضامین مختصر افسانے یا نثری نظم بھی کہلائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ''ہو نہیں سکتا'' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون ہے جو بلاشبہ نثری نظم کے زمرے میں آسکتا ہے۔

فلک پیا تمام عمر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز، حاکموں کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے کے باوجود بیچ میں سے عوام کے آدمی ہی رہے کیونکہ ان کی سوچ down to earth رہی، بدلی نہیں۔

وہ اپنی اصل کو نہیں بھولے۔ انہیں عام آدمی کی زندگی کی عام مشکلات کا خاص احساس تھا۔ وہ اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں انہی موضوعات پر لکھتے رہے اور حکمت و حکایات کے ذریعے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں سوالات جگاتے رہے۔ برٹش راج کی آخری سانس لیتی ہوئی ایڈمنسٹریشن، اس دور کی سیاست، بدلتے ہوئے حالات و واقعات سے چونکہ ان کا گہرا اور قریبی تعلق تھا، اس لیے ان کی تحریروں میں بھی ان ہی دنوں کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔

انہیں ہمارے ماضی، ہماری تاریخ وروایات کے لمحہ بہ لمحہ سفر کا بخوبی علم تھا مگر وہ ماضی پرست ہرگز نہیں تھے بلکہ ان کی تو آنکھیں مستقلاً مستقبل کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اہم تاریخی واقعات کے چھینٹوں سے ان کی تحریریں جاندار اور گل رنگ، سچی اور خالص محسوس ہوتی تھیں۔

انہوں نے شہزادی زیب النساء، محمود وایاز، سکندر اعظم، ملکہ نور جہاں، مرزا غالب غرضیکہ بہت سے تاریخی اعتبار سے اہم لوگوں کے بارے میں حکایات بیان کی ہیں جن کا مقصد محض قصہ گوئی نہیں بلکہ قاری کے لیے لمحۂ فکریہ مہیا کرنا ہے۔ ہر واقعہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی پیغام یا معنی رکھتا ہے جس سے قاری کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کر سکتا ہے۔ وہ فرد کی ترقی، خاص طور پر عورتوں کی ترقی کے علمبردار تھے۔ وہ عورت کو عورت سے زیادہ فرد سمجھتے تھے۔ اگر آج ہم اُن کی اس بات کی داد نہ دیں کہ انہوں نے اس زمانے میں بھی اپنی بیٹیوں کو بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم دلوائی، انہیں بطور فرد اپنی شناخت اور اپنے زورِ بازو پر اپنی زندگی گزارنے کا اعتماد اور سلیقہ بخشا تو یقیناً ناانصافی ہوگی۔

فرخ آپا بتاتی تھیں کہ اُن کے والد عورتوں کے معاملے میں بہت روشن خیال تھے۔ شام کو کلب جاتے تو اپنی بیگم کو بڑے فخریہ انداز میں ساتھ لے کر جاتے۔ اُن کی اس حرکت پر انگریز بھی حیران ہو جاتے کیونکہ وہاں آنے والی واحد انڈین مسلم خاتون ہوا کرتی تھیں جو ان سے سوشل میل ملاقات کیا کرتی تھیں۔ اُن کی والدہ نے اپنے شوہر کی حوصلہ افزائی پا کر تحریک پاکستان میں قائداعظم کے ساتھ مل کر خواتین کے فرنٹ پر بھی بہت کام کیا۔ اس زمانے کو پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو یہ بات کوئی اتنی معمولی بات نہیں ہے۔

اُن کے ڈرامے بھی اس دور کی تہذیب و ثقافت کے ہی آئینہ دار ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مکالموں پر مبنی یہ مختصر ڈرامے اپنے موضوعات کے اعتبار سے بہت دلچسپ اور جاندار ہیں۔ انہیں پڑھنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ عورتوں کو اسی گھسے پٹے، روایتی رول میں دیکھنا انہیں بور کرتا تھا۔ رسموں، رواجوں میں قید، اولاد اور گھرانے کی خواہشوں پر خود کو قربان کر دینے والی، ستی ہو جانے والی عورت سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایسی عورت کو کمہار کے طوطے سے تشبیہ دیتے ہیں کیونکہ کمہار کے طوطوں میں سے چاہے جونسا مرضی اٹھا لیں سبھی ایک سا رنگ و روپ، ایک سی ہیئت اور ایک سا بے جان وجود رکھتے ہیں۔ اس طرح جینے والی عورت انہیں مردہ اور زندگی سے عاری لگتی ہے۔

یہاں میں اس کی مثال کے طور پر ان کے ایک ڈرامے "ماں بیٹی" کا حوالہ دینا چاہوں گی جس میں ایک آرٹسٹ بیٹی اپنی ماں کو روایتی زندگی گزارتے دیکھ کر یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ اس کی زندگی کا معیار اس سے کہیں بہتر اور زیادہ Productive ہونا چاہیے۔ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی آرٹ سکول میں داخلہ لے کر بیٹی کی طرح آرٹسٹ بن سکتی ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے ڈرامے ''بدصورتی کی نظر'' میں ایسی دو عورتوں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے جن میں سے ایک خوبصورت اور ایک بدصورت ہے۔ مکالمہ بتدریج Develop ہوتا ہے اور آخر میں بدصورت عورت کے احساسِ کمتری کو مٹانے کے لیے وہ اسے یہ پیغام دیتے ہیں کہ اصل حسن عورت کے باطن کا حسن ہے، ظاہر کا نہیں۔ اصلی دلکشی صلاحیتوں اور ذہنی استعداد کی دلکشی ہوتی ہے، چہرے یا جسم کی نہیں۔

فلک پیما کی آئیڈیل عورت تعلیم یافتہ اور ماڈرن Sensibility والی عورت ہے۔ شاید آج ہمارے لیے یہ کوئی اتنے اچنبھے کی بات نہیں مگر میں پھر کہوں گی کہ ہم جب اسے اُس دور کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو یہ بات یقیناً ایک بہت آگے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ چالیس سال قبل کی مسلمان عورت اپنی شخصیت اور ذات کی اسیری کی کیفیت میں جیے جانے کو ہی نارمل سمجھنے پر مجبور تھی کیونکہ مرد کا معاشرہ اس سے یہی توقع کرتا تھا۔

مگر یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ عورت کے خلاف تعصب کی فضا آج بھی کچھ خاص بدلی نہیں۔ مجھے یقین ہے اگر فلک پیما آج کے مولوی کلچر کے زمانے میں زندہ ہوتے تو ایسی پروگریسو سوچ رکھنے پر انہیں شدید ردعمل اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ انہوں نے عورتوں کے لیے اصغری اکبری جیسے رول ماڈلز کو مسترد کیا اور تاریخ میں سے کچھ ایسے جہاں اور بھی ڈھونڈ نکالے جن کا جاننا پڑھنے والے کے لیے مسرت کا باعث بنتا ہے۔

اس کی مثال کے طور پر میں یہاں ان کے ایک ڈرامے ''نورالنہار'' کا تذکرہ کرنا چاہوں گی جس میں انہوں نے گیارہویں صدی کی سلجوقی شہزادی نورالنہار کے بارے میں ایک حکایت بیان کی ہے۔ یہ واقعہ کم از کم میرے لیے تو ایک انکشاف سے کم نہ تھا۔

شہزادی نورالنہار خوبصورت، جوان، طاقتور اور خود اعتماد شخصیت کی مالک تھی مگر اس کے والد نے اسے بیٹوں کی طرح پالا تھا اور مرنے سے پہلے اسے یہ وصیت کر دی تھی کہ اگر وہ تمام عمر اسی طرح آزادانہ گھومنا پھرنا، سیاحت کرنا، شکار کھیلنا چاہتی ہے تو کبھی اپنے پاؤں میں شادی کی بیڑیاں نہ ڈالے۔ بادشاہ نے اپنے جانشینوں کو بھی تحریری وصیت کر دی تھی کہ اس کے بعد کوئی اس کی بیٹی کو کسی بات کے لیے مجبور نہ کرے اور نہ ہی اس کی زندگی میں کسی قسم کا دخل دے۔

ایک روز نورالنہار جنگل میں ایک زخمی شہزادے کی تیمارداری کرتی ہے۔ چند ملاقاتوں بعد دونوں میں محبت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور شہزادہ اسے شادی کا پیغام دیتا ہے۔ اس کے لیے

دل میں نرم گوشہ رکھنے کے باوجود نورالنہار سوچ میں پڑ جاتی ہے اور بالآخر شہزادے سے شادی سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ شادی کے بعد اس کی شخصی آزادی سلب ہو کر رہ جائے۔ یہاں اہم بات یہ نہیں کہ شہزادی نے شادی جیسے Institution کو مسترد کر دیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں گیارہویں صدی میں ایک باپ ایسا گزرا ہے جس نے اپنی بیٹی کو اس کی طبیعت کے خلاف، عام روایتی زندگی گزارنے پر کبھی مجبور نہیں کیا اور اسے اپنی زندگی بحیثیت ایک خودمختار فرد کے جینے کا حق عطا کیا۔ کیا یہ قابلِ ستائش بات نہیں؟

تب کے فلک پیما کی تحریریں آج پڑھیں تو ذہن میں روشنی سی بھر جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج ہم اس کلاسیکی ادب کو ماضی کی زنگ آلود الماری سے باہر نکال کر اس کی گرد جھاڑ رہے ہیں۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس گرد میں ہمیں امید کے بہت سے ستاروں کی چمکتی دمکتی افشاں کے لاتعداد ذرات چمکتے دکھائی دیں گے۔

کہتے ہیں وقت ایسا نہیں رہتا مگر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اگر وہ وقت فلک پیما کا تھا تو آج بھی فلک پیما کا وقت ہے۔ اُن کے خیالات پرانے نہیں بلکہ آج بھی نئے اور تر و تازہ ہیں۔ اتنے ہی اہم اور برتر جتنے تب تھے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں نئے سرے سے پڑھیں اور ان کی باتوں کی نئی تعبیریں تلاش کریں۔ نئی نسل سے ان کا تعارف کروائیں کیونکہ وہ ہمارا بیش قیمت ادبی ورثہ ہیں۔

انہوں نے اپنی قبر کے کتبے کے لیے کچھ ون لائنز تجویز کیے تھے۔ معلوم نہیں وہاں کونسا فقرہ کندہ ہے مگر مجھے ذاتی طور پر یہ بہت اچھا لگا "موت آئے گی مجھے، میری باتوں کو نہیں۔" فلک پیما کو اعتماد تھا کہ اُن کی باتیں زندہ رہیں گی، انہیں کبھی زوال نہیں آئے گا اور ان کے لفظ دیر تک اُن کے ہونے کی گواہی دیتے رہیں گے۔

آج ہم ان کی باتیں دہرا کر، سنا کر، اُن کے اس اعتماد کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ پرانے زمانے کے نہیں بلاشبہ نئے زمانے کے آدمی ہیں۔

---------O---------

کتھا U.K کی تقریب میں

پیارے دوستو، ہیلو، السلام علیکم، ست سری اکال اور نمسکار۔

یوں تو ہندوستانی دوستوں سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ملاقات ہوتی رہتی ہے مگر ہندوستانی ادیبوں کی کسی ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کا یہ میرا پہلا اتفاق ہے اور مجھے کہہ لینے دیجیے کہ بڑا ہی حسین اتفاق ہے یہ۔ آپ سب لوگوں سے ملنا، ساتھی قلم کاروں کے فنِ تحریر کے بارے میں جاننا، لندن میں منگل منانا بہت اچھا لگ رہا ہے۔

ایوارڈ پانے والے خوش نصیب دوستوں کو میری طرف سے بہت بہت بدھائی ہو۔ ان مہان لکھاریوں کے کام نے یہ شام سجائی اور یوں ہمارے مل بیٹھنے کا سامان پیدا کیا۔ مجھے خود کو یہاں پا کر خوشی تو ہو رہی ہے مگر دل کو ایک ہلکا سا ملال بھی ہے۔ ایک حسرت ہے جو دل میں جنم لے رہی ہے کہ کاش میں بھی ان کتابوں کے چمکیلے شبدوں کو پڑھ سکتی جن پر آج انہیں یہ سمان دیا گیا ہے۔ دیکھ سکتی کہ ان کے خیالوں کے پنچھی جب آسمان کی بلندیوں تک پرواز کرتے ہیں تو کیسے دکھائی دیتے ہیں؟ ان کے گیان سے کچھ موتی جھولی میں بھر کے اپنے ذہن میں اجالا کر سکتی مگر افسوس کہ مجھے ہندی پڑھنا نہیں آتی اور آپ اردو میں نہیں لکھتے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ہم پھر بھی ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھ لیتے ہیں، اس لیے کہ ہم دل کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ بول چال کے اعتبار سے ہندی اور اردو دو پٹہ بدل بہنیں ہیں۔ بھائی اس لیے نہیں کہوں گی کہ بھائی مرد ہوتے ہیں اور مرد لڑ مرتے ہیں اور آج یہاں لڑائی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ صرف محبت اور دوستی کا ہی ذکر چھڑے گا۔

ہمیں ایک دوسرے سے کٹ جانے کی وجہ سے کئی صدمے پہنچے۔ ایک بڑا نقصان یہ

ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے ادب سے شناسا نہیں رہے۔ میرے نزدیک، ادب سے ناشناسائی زندگی سے ناشناسائی کے برابر ہوتی ہے۔ ادب کا بھونرا زندگی کے پھول سے ہی رس لیتا ہے اور زندگی کی منظر کشی کرتے ہوئے وقت کو Document کرنے کا اہم کام سرانجام دیتا ہے۔ ادب سے بڑی کوئی سچائی نہیں۔ ادب آزاد ہوتا ہے، وہ کسی تعصب اور حد بندی کو نہیں مانتا کیونکہ اس کا ایک اپنا ضمیر، اپنی روح ہوتی ہے جو من مانی کرتی ہے۔ سچا لیکھک دل کی زمین میں درد گوندھتا ہے، کاغذ کو اپنے بھیتر کا بھید بتاتا ہے تو پڑھنے والوں کے ذہن میں روشنی کے پھول کھل اٹھتے ہیں اور جیون میں جاگرتی کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ لیکھک سماج کا ایک اہم فرد ہوتا ہے کیونکہ وہ گزرے ہوئے کل، گزرتے ہوئے آج اور آنے والی صبح کی کہانیاں لکھتا ہے تاکہ پچھلی پیڑھی کا تجربہ ضائع نہ ہو اور آنے والی پیڑھی اس سے کچھ سیکھ سکے۔ وہ ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتا ہے جس میں بوڑھوں کے ماضی اور جوانوں کے مستقبل ضائع نہیں ہوتے۔ اس کا ایسے خواب دیکھنا ضروری ہے ورنہ شعر و نغمہ راکھ بن جائیں، کہانیاں پتھرا کے رہ جائیں، ساگر خشک ہو جائیں اور لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنا چھوڑ دیں۔

ہم آپ ایک انوکھے برصغیر سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تاریخ، تہذیب اور روایات ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہم ایک ہی دھرتی ماں کے بچے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ ایک دوسرے کے کچھ نہ کچھ لگتے ہی رہیں گے۔ ہمارے لوگ آچار ایک، زندگیاں ایک سی اور ان سے جنم لینے والی کہانیاں بھی ایک دوسرے کی پرچھائیاں ہیں۔ جب ہماری کہانی اتنی ملتی جلتی ہے تو پھر بھلا ہم آپس میں کیوں نہ ملیں جلیں؟ ملیں گے نہیں تو غلط فہمیاں دور کیسے ہوں گی، اجنبیت کی دیواریں کیسے گریں گی؟ اور اگر دل صاف نہ ہوئے تو ستم کی رسمیں جاری رہیں گی اور آنے والا وقت ہماری ہنسی اڑائے گا۔

ہماری سانجھ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ہماری عادات، مزاج، پہناوے، کھانے، دکھ سکھ، سچائیاں ایک سی ہیں۔ ہمارا ادب زمین کی خوشبو سے مہکتا ہے کیونکہ ہم کہانی کہتے ہیں ٹھاکروں، وڈیروں، طاقتوروں کے ظلم کی جو وہ پسے ہوئے طبقے پہ صدیوں سے ڈھاتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم قصہ سناتے ہیں ہیر کی جھانجھر کی چھن چھن کا جسے سن کر رانجھے کی مرلی اور سُریلی ہو جاتی ہے۔ ہم داستان بیان کرتے ہیں شہر کے ورکنگ مڈل کلاس لوگوں کی جو محنتوں، محبتوں اور مجبوریوں کی بھول بھلیوں میں چوہوں کی طرح اندھا دھند دوڑتے چلے جا رہے ہیں اور انہیں راستہ

سُجھائی نہیں دیتا۔

یہ خوبصورت شام ہمیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ ہمارے کلچر میں کہانی سننے اور کہنے کی بڑی پرانی روایت موجود ہے۔ ہماری نانی دادیاں، گرمیوں کی راتوں میں ہمیں سندر کہانیاں سنا کر سلایا کرتی تھیں تو آنگن میں بچھے سفید بچھونوں پہ لیٹ کر ہم چاند کی نیلی ٹھنڈی چاندنی میں بھیگی کہانیاں سنتے سنتے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے۔ پریوں، جنوں، راجوں، راجکماریوں، بونوں اور غریب لکڑ ہاروں کے بارے میں سنی ہوئی رومانوی کہانیوں سے ہمارا تصور زرخیز ہوا۔ اس میں اتنی طاقت پیدا ہوئی کہ ماڈرن ٹیکنالوجی اور میڈیا کے اس دیوانے دور میں آج بھی ہم کہانی کی محبت سے بندھے اور سحر میں قید آپ بیتی اور جگ بیتی لکھ رہے ہیں تا کہ اپنے اندر کے انسان کو دریافت کر سکیں، اسے کھو جانے سے بچا سکیں۔

کہانی کہنا ایک برتر فن ہے۔ تمام الہامی کتابوں میں ماضی کے قصے کہانی کی ہی ایک صورت ہیں اور ان کہانیوں کے ذریعے انسان کو زندگی گزارنے کا سبق دیتی ہیں۔ رامائن اور مہابھارت دنیا کے ادب میں ایک معجزے سے کم نہیں۔ ہندو پاک کے ساہتیہ ادب میں صوفی سنتوں یعنی Mystics کا چھوڑا ہوا شعر اور نثر کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ تلسی داس، کالی داس، سنت گیانیشور، گرونانک، میرا بائی، بھگت کبیر، امیر خسرو، بلھے شاہ، مادھولال حسین، بھٹائی وغیرہ کا کلام آج بھی پڑھیں تو تروتازہ محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس میں فوک وزڈم، انسانی حقوق، عورتوں کے مسائل اور سوشل جسٹس کا پیغام ملتا ہے۔ صوفی کا لٹریچر بہت پروگریسو لٹریچر تھا کیونکہ صوفی کا مذہب، مذہب انسانیت تھا۔ صوفی انسان دوست تھے اس لیے خدا کے نزدیک تھے۔ وہ یہ راز جانتے تھے کہ انسان کا دل ہی خدا کا گھر ہوتا ہے۔ بلھے شاہ کہہ گئے ہیں۔

گل سمجھ لئی تے رولا کی
اے رام رحیم تے مولا کی

لاہور دہلی واہگہ بارڈر کی تقسیم لائن یہ چھ سات فٹ زمین کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جو دونوں ملکوں کا ہے بھی اور نہیں بھی۔ چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک روز لتا جی اور نور جہاں نے آپس میں ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا۔ وقت طے کرنے کے بعد نور جہاں جی نے لتا جی کی فرمائش پہ اپنے ہاتھوں سے کریلے پکائے اور دونوں بہنیں گارڈز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زمین کے اس ٹکڑے پہ ملنے آئیں اور کھانا کھایا جس پہ خون کا کوئی چھینٹا نہیں تھا۔ لیکھک برادری سے بھی اکثر

خاص خاص موقعوں پہ انڈو پاک کے انٹلکچوئلز اور فنکار وہاں آ کر ایک دوسرے سے ملاقاتیں کیا کرتے اور بہت کچھ اپنے ساتھ واپس لے کر جاتے تھے۔ میں بھی ایک ایسے ہی خواب سے میں جیتی ہوں جب ہم آپ بے دھڑک ایک دوسرے کے گھروں میں ملنے جلنے کے لیے آ جا سکیں گے کیونکہ راوی میری بہن ہے تو گنگا میری ماں ہے۔ ہمالہ کی وادی میں میرا بھائی شوالک رہتا ہے اور جہلم کے دینے میں گلزار جنم لیتا ہے۔

شاہجہاں کا تاج محل، کوہ نور کی نیلا ہٹیں، ملکہ نور جہاں کے ہاتھوں سے چھوٹتے ہوئے کبوتر، امیر خسرو کی بندشیں، غالب کی غزل، میر کا درد، اقبال کا فلسفۂ خودی اور فیض کی پہلی سی محبت، میں یہ سب بھینٹ کرنا چاہتی ہوں، آج کی اس بکھرتی بگڑتی دنیا کے انت شامیانے تلے، امن کے نام پر، دوستی اور چین کی زندگی کے نام پر کیونکہ سکون اور امن سے زیادہ اس سے ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

بارش سرحد کے اِس پار ہو یا اُس پار۔ دونوں ہی طرف سوکھی دھرتی پہ اُگنے والے اناج کے دانے پھولنے لگتے ہیں تو بھوکے پیٹوں والے بچے، ڈھول کی دیوانی تھاپ پہ ناچ اٹھتے ہیں۔ میں کوئی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی گیانی دھیانی ہستی نہیں ہوں۔ میں تو بس ایک عورت، ایک ماں ہوں جو کانچ کے جگنوؤں جیسی نازک چھوٹی موٹی کہانیاں لکھنے کا ہنر سیکھنے کی کوشش کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنے بچوں کے بچوں کو ویسی ہی معصوم، دھنک رنگ کہانیوں کا ورثہ دے جائے جو اسے تھمایا گیا تھا۔ بچے سکون سے سو سکیں اور انہیں تباہی پھیلانے والے ایٹم بم جیسے بدصورت کھلونوں کے خواب کبھی ڈرا نہ سکیں۔

میں ساحل پہ کھڑی، امن کے جزیرے کی طرف بہتے پانیوں، میں دوستی کے پھول بہا رہی ہوں۔ اس جزیرے پہ اب ویرانی کے سوا کوئی نہیں رہتا مگر

پھول بھیجے ہیں جزیروں کی طرف لہروں کے ہاتھ
کوئی ہو شاید وہاں پر بھی جہاں کوئی نہ ہو

---------O---------

کچھ روح کے بارے میں

روح کیا ہے؟ اس کا وجود کیا ہے؟ یہ کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ اس کا کام کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے سوالات ہیں جنہوں نے حضرتِ انسان کو ہمیشہ ہی متجسس اور بے چین رکھا ہے۔ ہر مہذب، ہر معاشرہ، ہر تہذیب میں اس کے غیر مرئی وجود سے متعلق کوئی نہ کوئی تصور ضرور موجود ہے۔ سوالات کے جوابات بھی مل جاتے ہیں لیکن انسان اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش سے کبھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی یہ تلاش ازل سے جاری ہے اور ابد تک ختم نہیں ہوگی۔

قرآن پاک میں روح کو امرِ ربی کہا گیا ہے۔

قرآنی ارشادات:

☆ ''آپ فرما دیئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔''

☆ ''روح میری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے۔''

☆ ''آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے روح اللہ کی مخلوق ہے اور تمہیں تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے۔''

مندرجہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کے بارے میں ایک اسرار قائم کر رکھا ہے اور انسان اس اسرار کا پردہ چاک کرنے کی طاقت سے قاصر ہے۔ وہ جتنا مرضی سر پٹخ لے، پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر لے، صحراؤں کی خاک چھان لے، علم کے حصول میں ایک حد سے زیادہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شاید یہ اسی لیے ہے تاکہ انسان میں کھوج کی صلاحیت سدا سرسبز اور تازہ رہے اور اسے آگے دوڑاتی رہے۔

حدیث قدسی میں روح کو ایک پرندہ کہا گیا ہے جو جنت کے درختوں سے پھل کھاتی ہے اور قندیل میں بسیرا کرتی ہے۔

کتنا خوبصورت اور شاعرانہ تصور ہے یہ۔ یعنی ایک ایسی مخلوق جس کا ایک جگہ مستقل قیام نہیں اور وہ مسلسل حرکت میں رہتی ہے۔ قوت پرواز رکھتی ہے اور نور میں گھر بناتی ہے۔

روح کا لفظ ریح سے ہے یعنی ہوا اور ہوا سے زندگی حاصل ہوتی ہے۔ روح بدن میں زندگی کا کرنٹ بن کر دوڑتی ہے اور ایک خاص وقت کے بعد جب جسم کی معیاد پوری ہو جاتی ہے تو روح اپنے اس محل سرائے کو چھوڑ کر پرواز کر جاتی ہے اور جسم بے جان، بے معنی اور بے حیثیت ہو کر رہ جاتا ہے۔

ای بی ٹائلر 1871ء میں چھپنے والی اپنی کتاب "قدیم تہذیب" (Primitive Culture) میں کہتا ہے" ہر معاشرے کے لوگوں میں یہ تصور یقیناً موجود ہوتا ہے کہ عام انسان کی دکھائی دینے والی، چھوئے جانے والے جسم کے اندر ایک اَن دیکھی، چھوئے نہ جا سکنے والی ہستی رہتی ہے جیسے ہم روح کہتے ہیں۔ دنیا بھر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ روحیں خوابوں، مراقبوں، سایوں، عکسوں، بے ہوشی کے دوروں، موت اور جنموں کے وقت موجود ہوتی ہیں۔ چند عقیدے تو عالمگیر سطح پر کافی حد تک ایک جیسے ہی ہیں لیکن چند تہذیبوں میں یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک سے زیادہ روحیں پائی جاتی ہیں۔"

یہاں مشرقی ایکواڈور کے ایک قبیلے" جوارو" کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ کچھ انسانوں میں تین طرح کی روحیں ہوتی ہیں۔ ایک عام یا نچی روح، دوسری اروتم (Arutam) اور تیسری موزیک (Musaic)

جوارو کا عقیدہ ہے کہ نچی روح ہر انسان میں پیدائش کے موقع پر موجود ہوتی ہے۔ موت کے وقت یہ جسم کو چھوڑ کر چار اضافی تبدیلیوں کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے یہ جسم کی جائے پیدائش پہ جاتی ہے۔ وہاں جا کر اپنی گزشتہ زندگی (دکھائی نہ دے جانے والی صورت میں) بسر کرتی ہے۔ پھر یہ خوفناک بلا کی صورت اختیار کر کے جنگل جنگل، بھوکی اور تنہا پھرتی ہے۔ وہاں یہ مرنے کے بعد ایک بہت بڑے جناتی سائز کا پتنگا وام یا نگ بن جاتی ہے جو اکثر اس علاقے میں پھڑ پھڑاتا نظر آتا ہے۔ یہ بھوکا پتنگا طوفانی بارشوں کی شدت سے اپنے پر تڑوا کر زمین بوس ہو جاتا ہے۔ اس فائنل سٹیج میں روح پانی کے بخارات کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر دھند بن

کر ہمیشہ کرۂ ارض پہ چھائی رہتی ہے۔

دوسری روح Arutam پیدائشی طور پر کسی کے اندر نہیں ہوتی بلکہ اسے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے کچھ رسوم پوری کرنا پڑتی ہیں جن میں سب سے پہلے اس کے طالب کو روزہ رکھ کر ایک مقدس آبشار کے نیچے نہانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ تمباکو کا پانی یا دھتورہ پودے کا عرق نوش کرتا ہے۔ آج سب جانتے ہیں کہ دھتورہ ہلوسی نیشن پیدا کرتا ہے لیکن یہ لوگ اسے کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔ اب اروتم روح جنگل کی گہرائیوں سے ایک بہت بڑے چیتے یا اژدھوں کے جوڑے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور اس شخص کے پاؤں میں لوٹنے لگ جاتی ہے۔

اگر وہ شخص حوصلہ کر کے اسے چھو لے تو یہ روح رات کے وقت اس کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ اب یہ شخص پر اعتماد ہو کر بات کرنے اور کچھ بھی کر گزرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس میں اپنے دشمنوں کو مار ڈالنے کی ایک ناقابل تسخیر خواہش پلنے لگتی ہے۔

تیسری روح موزیک یعنی بدلہ لینے والی روح کہلاتی ہے۔ یہ روح اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اروتم روح والے افراد کو ان کے دشمن قتل کر دیتے ہیں۔ موزیک روح مرنے کے بعد سر میں پیدا ہو کر باہر نکل کر اپنے حملہ آور کو قتل کرنا چاہتی ہے۔ اس سے بچاؤ کے لیے مرنے والے کا سر کاٹ لیا جاتا ہے۔ پھر اسے ابال کر چھوٹا کر لیا جاتا ہے (Shrink) (ماہر نفسیات کے لیے یہ متبادل لفظ اسی طرح وجود میں آیا تھا۔) اب یہ شرنک شدہ چھوٹے سر کو گھر لا کر دیوار پہ لٹکا دیا جاتا ہے اور پھر مختلف تقریبات، تہواروں میں، رسموں اور رقص کے دوران سرعام اس کی نمائش کی جاتی ہے۔ روح سے متعلق متعدد کتابوں کے مصنف دیپک چوپڑہ اپنی کتاب ''کامیابی کے ساتھ روحانی قانون'' میں کہتے ہیں: ''روح معلومات کا ایک متحرک بنڈل ہے جو مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ جسم میں رہتی نہیں، لہٰذا جسمانی موت سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جسم کو تو یہ صرف اپنے ہونے کے اظہار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ جیسے آپ ریڈیو پہ Beethoven کو سنتے ہیں جبکہ بیتھوون ریڈیو کے اندر تو موجود نہیں ہوتا۔ ریڈیو محض انرجی اور معلومات کو مقید رکھنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اسی طرح آپ کا جسم آپ کی روح کو محض ایک گھر مہیا کرنے کے کسی اور کام نہیں آتا۔ اس کا زمان و مکان میں کوئی مقام اور حیثیت نہیں۔ پیدائش اور موت ایسے ہی ہیں جیسے ریڈیو کو آن اور آف کر دیا جائے، ہاں البتہ موسیقی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔''

یہودی Rabbi زلمان شلومی نے جو World wisdom Nerupa

Institute Colarado U.S.A سے متعلق ہیں، ایک دلچسپ قصہ سنایا۔ کہنے لگے: ''میری بچی نے سوال کیا، بابا جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تو پھر بھی جاگ سکتے ہیں نا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں۔''

''تو پھر جب ہم جاگ رہے ہیں تو کیا اس سے بھی زیادہ جاگ سکتے ہیں؟''

میں یہ سمجھتا ہوں روح اسی کیفیت کا نام ہے۔ جب ہم اور زیادہ'' جاگ جاتے ہیں'' زلمان شلومی نے روح کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

ایک امریکن کتاب "Dancing with the masters" اور "Seat of the Soul" کے مصنف نے ایک جگہ ریڈ انڈین قبیلہ Sioux سے متعلق ایک حکایت یوں بیان کی۔ تخلیق کار نے تخلیق مکمل کرنے کے بعد ساری مخلوق کو ایک روز ایک جگہ اکٹھا کیا اور کہا:

''میں انسانوں سے ایک چیز چھپانا چاہتا ہوں اور انہیں اس وقت نہیں دینا چاہتا جب تک کہ وہ اس کے قابل نہ ہو جائیں۔ یہ انمول خزانہ ہے۔ اس حقیقت کی پہچان کہ ہر انسان اپنی Reality خود تخلیق کرتا ہے۔''

چیل نے کہا'' مجھے یہ امانت سونپ دیجیے۔ میں اسے چاند پہ لے جاؤں گی۔''

تخلیق کار نے کہا'' نہیں۔ وہ ایک دن وہاں جا پہنچے گا اور اسے ڈھونڈ نکالے گا۔''

سامن مچھلی آگے بڑھی اور کہنے لگی'' مجھے دے دیجیے، میں اسے سمندر کی تہہ میں چھپا دوں گی۔''

''نہیں، وہ اسے وہاں سے بھی نکال لائے گا۔'' تخلیق کار نے جواب دیا۔

'' مجھے دے دیں۔ میں اسے سرسبز میدانوں کے نیچے بہت نیچے دفن کر دوں گی۔'' گائے نے تجویز پیش کی۔

''انسان زمین کی جلد پھاڑ کر اسے وہاں سے بھی نکال لائے گا۔'' تخلیق کار نے جواب دیا۔

مادر زمین کے سینے میں رہنے والی بڑی سی مادر چوہیا آگے بڑھی۔ اس کی آنکھیں نہیں تھیں مگر وہ روح کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ لیتی تھی۔ کہنے لگی'' میں بتاؤں اسے کہاں چھپائیں؟ اسے انسانوں کے سینے کے اندر ڈال دیں، اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔''

اور تخلیق کار نے کہا'' ایسا ہی ہوگا۔''

---------O---------

اینجلا کا خط

''ابا کی رخصتی کے بعد امی نے ان کی الماریاں، درازیں، زنبیلیں وغیرہ خالی کرنے کا کام سنبھال لیا کہ بنجارہ ان کی بابت کوئی واضح ہدایت دیئے بغیر ہی اگلی منزل کو چل دیا تھا اور اسباب دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ روز کہتیں، ان کاغذوں سے بھرے تھیلے کا کیا کروں؟ اس والی بوری کو چیک کرو۔ اس دراز میں جھانکو۔ پھر ہم دونوں نے ڈھیرے ڈھیرے گٹھڑیاں کھولنی شروع کیں۔ بھید کھلا کہ سیدھا سادا دِکھنے والا فقیر منش بنجارہ اصل میں ایک امیر کبیر سوداگر تھا۔ اس کی چھوڑی ہوئی منہ بند دیگوں میں ہیرے موتی، لعل و جواہر اور سربستہ راز تھے۔ ہر لکھا ہوا لفظ اشرفی کی طرح کھنکتا اور سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس خزانے کو دیگ میں سے نکالنا لازم ٹھہرا تا کہ اس کی دمک اور چکا چوند کو برتنے اور پرکھنے کا کچھ سلیقہ سیکھا جا سکے؟ آگہی کے کچھ نئے در کھولے جا سکیں۔

کوشش ہے اور رہے گی کہ احمد بشیر جیسے مہان لکھاری اور گیانی کے قلم سے ٹپکا ہوا کوئی بھی موتی بحرِ فراموشی میں گر کر غائب نہ ہونے دوں۔ ان کے ذریں شبد اپنے قارئین کے ذہنوں میں ہمیشہ چمکتے ستاروں کی طرح اجالا بکھیرتے رہیں۔ احمد بشیر کی تحریریں اعلیٰ فکر، منفرد طرزِ زندگی اور انسانی رشتوں سے گہرا تعلق محسوس کرنے کی مظہر تحریریں ہیں کہ ایسی خاص تحریریں عام طور پر پڑھنا نصیب نہیں ہوتیں اور ایسے لوگوں سے زندگی کے راستوں میں بار بار ٹکراؤ بھی نہیں ہوتا۔

تقریباً بیس سال قبل احمد بشیر کی پنسلوانیا میں واقع ERIE یونیورسٹی کی ایک پروفیسر اینجلا سے قلمی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ میرے بھائی ہمایوں کی استاد تھی جس نے اسے غالباً ابا کے بارے میں بتایا ہو گا کہ میرے ابا ادیب ہیں۔ اعلیٰ فکر کے مالک ہیں، وغیرہ میں نہیں جانتی۔ سنتے رہے کہ اینجلا کے

خط آتے ہیں اور ابا ان کا جواب دیتے ہیں۔ ابا اور اینجلا کبھی نہیں ملے مگر کسی کو جاننے اور محبت کی خوشبو سونگھ لینے کو شاید ملنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ سفید فام اینجلا اپنے سیاہ فام شوہر کی کے ساتھ گزاری زندگی پر بات کرتی رہی ہے۔ ابا کے چھوڑے ہوئے بے شمار کاغذوں میں سے مجھے اینجلا کا یہ خط ملا ہے اور خط نہ جانے کیا ہوئے ہیں۔ یہ والا خط پڑھا تو میں سحر زدہ سی رہ گئی۔ عورت کی زندگی اس کے دل کے معاملات، ترجیحات، مجبوریاں، مصلحتیں، کیا دنیا کے ہر کونے میں ایک سی ہوتی ہیں۔ کوئی کس خطے میں جنم لیتی ہے کوئی کہاں کی مٹی میں نیند لیتی ہے مگر کچھ آفاقی سچائیاں ایسی ہیں جنہیں ہم سامنے آتا دیکھتے ہیں تو بس دنگ ہی تو رہ جاتے ہیں۔ یہ خط آپ بھی پڑھیں۔ میری طرح شاید آپ کے ذہن میں بھی خیال آتے کہ آخر میں لکھے نام اینجلا کی جگہ سکینہ، پاروتی کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بات کیا ایک ہی ہے؟" یہ خط میں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔

نیلم احمد بشیر

----------O----------
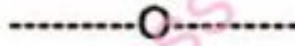
میرے پیارے دوست۔

تم نے کہا تھا "مجھے لکھنا جب خاموشی بہت بوجھل ہو جائے۔ جب تم دیکھو کہ سب مور مر چکے ہیں۔" میرے دوست میرے ادھر، مور مرتے جا رہے ہیں اور آج میں تمہیں خط لکھنے بیٹھی ہوں۔

میں تمہیں بتاؤں گی کہ انجیلا کیسے بنی؟ شاید یہ خط بہت طویل ہو جائے۔ شاید اسے وہاں سے شروع ہونا چاہیے جہاں سے وقت شروع ہوا تھا مگر میں سمجھتی ہوں، وقت کا حساب رکھنا ایک بور بات ہے اور ویسے بھی اس میں کوئی صداقت نہیں ہوتی۔ ساڑھے چار سال پہلے میرا شوہر (مجھے اندازہ نہیں تھا کہ الفاظ چھریوں کی طرح آپ کو زخمی بھی کر سکتے ہیں۔) کہنے لگا، وہ مجھے پہاڑ کی چوٹی تک لے جا چکا ہے مگر اتنی اونچائی پہ اسے سانس نہیں آ رہا، لہٰذا وہ نیچے اترنا چاہتا ہے۔

عیسائی تہذیب میں جنم لینا بھی ایک بدقسمتی ہے کیونکہ یہودیوں کا خدا ایک حاسد خدا ہے۔ میرا شوہر محبت کرنے والا مہرباں آدمی تھا۔ اس جیسا شوہر میں نے کبھی کسی کا نہیں دیکھا۔ جب میں اس کو دیکھتی تو مجھے بادلوں کے بغیر ایک جنت نظر آتی ہے۔ جب اس نے پہلی بار مجھ سے کوہ پیمائی کی بات کی تو میں نے سوچا، خدا جلتا ہے کہ میں اپنے شوہر کو اس سے زیادہ چاہتی ہوں۔

میں اس کا انتظار کر رہی تھی، وہ میرا رہنما، میرا محافظ تھا اور میں اس کا انعام تھی۔ میں اس کے لیے کچھ زیادہ ہی اچھی تھی۔ وہ کہتا تھا، کوئی دوسری عورت ہی اس کا خواب تھی میں نہیں۔ بہرحال وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا اور ہم تینوں دو سال اس دوزخی وقت کو بھگتتے رہے۔ میں آپ کو اس دکھ بھری کہانی کی تفصیلات نہیں سنانا چاہوں گی۔ میرا شوہر کی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ سو وہ میرے اور نینسی (Nancy) کے درمیان میں سفر کرتا رہا۔ اب بھی وہ کبھی میرے پاس کبھی اس کے پاس ہوتا ہے۔ جب بھی اس نے کوئی قدم اٹھایا، وہ اسے آخری فیصلہ قرار دیتا رہا۔ وہ کہتا، اب میں کبھی تمہارے پاس لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ پھر آتا تو کہتا، اب میں کبھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ یہ سلسلہ واضح طور پر ہماری طرزِ زندگی بن چکا تھا مگر وہ کبھی اس بات پر قائل نہ ہوا کہ اب یہی ہماری زندگی کا چلن رہے گا۔ ثبات ہے تو اس تغیر کو رشتے کو نہیں مگر کچھ تھا جو بدل چکا تھا۔ جب وہ جاتا تو کہتا، میرا انتظار ضرور کرنا۔ میں آنے کا وعدہ کر کے جا رہا ہوں اور پھر کسی طرح سے میں بھی اس طرزِ زندگی کو سمجھوتہ کرنے کو ہی حقیقت سمجھنے لگ گئی۔ یہی سوچ کر کہ مجھے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے، گہری اور سچی طلب ہے۔

ہم تینوں اوہائیو کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ اس دوران میں ERIE چلی آتی تھی تاکہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکوں۔ کلی اور نینسی جنوبی اوہائیو چلے گئے اور پھر Memphis ٹینیسی منتقل ہو گئے، لہٰذا اب کلی کو ہم سے ملنے کے لیے ہزاروں میل کا سفر کرنا پڑ گیا۔ اس دوران ہمیں بہت نقصانات اٹھانا پڑے۔ ہم نے مل جل کر جو گھر بنایا تھا، بیچنا پڑ گیا۔ اس کی نوکری چھوٹ گئی اور ہمیں باقاعدہ طور پر کنگالی ڈکلیئر کرنا پڑی۔

جب آپ کو یہ ہی نہ پتہ ہو کہ آپ کون ہیں اور بچے کہاں رہائش رکھتے ہیں تو نوکری کیسے رکھی جا سکتی ہے؟ کلی خود کو بیکار اور ناکارہ سمجھنے لگا تھا جیسے کہ وہ ایک انسان کے رتبے سے بھی نیچے جا گرا ہو۔ اس کی عزتِ نفس بھی سلامت نہ رہی تھی۔

یہ مت پوچھنا کہ میں نے اسے چھوڑا کیوں نہیں یا طلاق کیوں نہیں دی۔ سوال کا جواب تو میں خود بھی نہیں جانتی۔ میرے جاننے والوں میں سے کوئی بھی ایسی زندگی نہیں گزار سکتا جیسی میں نے گزاری ہے۔ میں نے بہت سے دوست بھی گنوا دیے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں میں بہت کمزور عورت ہوں۔ میں مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی اور نیا ساتھی ڈھونڈنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتی۔ میری ماں نے مجھے اپنی وصیت سے عاق کر دیا ہے کیونکہ میں کلی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکی ہوں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مجھے کوئی عجیب وغریب عورت سمجھتے ہیں جسے نہ تو کوئی جلن محسوس ہوتی ہے نہ وہ غصہ دکھاتی ہے اور نہ ہی اپنے شوہر پہ اپنا حق جتاتی ہے مگر میں تمہیں سچ بتاؤں ایسی بات کوئی نہیں ہے۔ میں ان سب بلاؤں سے کافی جنگ لڑتی رہتی ہوں۔ میں بالکل قطعی طور پر جانتی ہوں کہ دل میں کسی کے قتل کی خواہش رکھنا کیسا اور کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ ایسے حالات میں قتل بھی سرزد ہو سکتے ہیں اور ان حالات کا شکار ہو جانے والوں کے لیے میں دل میں ہمدردی بھی محسوس کرتی ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ درد کیا ہوتا ہے۔ رحم کرنا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ جذبہ وہ ہوتا ہے جس میں دل کا ایک واضح شفاف تصور ہو، شبہات سے عاری اور انتقام سے خالی، ہیجان سے انجان۔ شاید تم کچھ اور سوچتے ہو گے۔

جب اس نے پہلی بار مجھے نینسی اور آٹھ دوسری عورتوں کے بارے میں بتایا تو میرا ردعمل یہ تھا۔ ''آپ کسی شخص کو اس کے مڈ لائف کرائسس کے درمیان چھوڑا نہیں کرتے۔'' شاید میں چھوڑ بھی دیتی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ اس سارے سلسلے میں کتنا وقت ضائع اور اذیت ملی ہوگی۔ میں نے سوچا مجھے نینسی کو جاننا چاہیے۔ ویسے یہ تو طے ہے کہ جس شخص سے آپ نفرت کریں یا خوف کھائیں، اسے جاننا اتنا آسان کام نہیں ہوتا مگر میں نے پھر بھی سوچا کہ نہیں مجھے یہ کرنا ہی ہوگا۔ اپنے مدِ مقابل کو پہچان کر ہی جینا ہوگا۔ میں نے سوچا یہ ضروری ہے کہ میں اسے جانوں، کیا خبر وہ اس کے لیے مجھ سے بہتر ہی ہو۔ وہ کوئی بری عورت نہیں ہے۔ بس جذباتی طور پر بھوکی ننگی ہے۔ مجھے وہ کئی معاملوں میں سخت گیر، پسماندہ، غیر تعلیم یافتہ، اجڈ دنیا داری کی سمجھ بوجھ رکھنے والی، پریکٹیکل، فزیکل، سمجھدار اور اپنا برا بھلا سوچ کر چلنے والی عورت نظر آئی مگر اس کی شخصیت میں کسی گہرائی کو میں نے نہیں پایا۔ زندگی نے اس کے ساتھ بھی کوئی خاص انصاف نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اتنی کھوکھلی تھی۔

اور یہ میری شخصیت کی گہرائی اور پختگی ہی تھی جس نے ملی کو مجھ سے دور کر دیا اور اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ وہ مجھ سے دور بھاگ رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے روحانی ارتقاء کی خاطر مجھ سے فرار حاصل کر رہا ہے۔ میں نے اس کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ جب تک اس نے چاہا، میں نے اس کا راستہ دیکھا۔ میرے اپنے ذہن میں ایسے اعلیٰ وارفع خیالات بھی موجزن رہتے کہ جیسے کہ یہ بھی میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس دنیا میں آتے ہوئے اس شخص کو ایسی ایک عورت سے تحفظ دینے کے لیے اس کی زندگی میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوں۔ ملی کی ہی خاطر میں نے

اپنی بدقسمتی کی بلاؤں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سچ کا سامنا کیا اور جان لیا کہ نکی کا وجود ہی میری زندگی، میرا راستہ اور میری منزل ہے۔

ویسے نئر شاید کوئی آسان رستہ بھی چن سکتی تھی۔ اگر میں آپ کی دنیا کے کسی خطے کی باسی ہوتی۔ شاید تنہائی میرے حصے میں کچھ کم آتی۔ مجھے شاید کچھ ایسے لوگ مل جاتے جو یہ سمجھ سکتے کہ میں کیا کرنا چاہ رہی ہوں۔ یہاں کے لوگوں کے لیے میں ایک معمہ ہوں۔ ظاہر ہے میں ذہین ہوں، قابل ہوں، اپنے کام میں بہت نامور اور پھر..... خواتین کی آزادی کے اس دور میں ظاہر ہے کہ ایک بے وقت کی راگنی الاپ رہی ہوں۔ ایسی عورتیں میرے معاشرے میں اب کہاں ہوتی ہیں۔

دو سال قبل میں بہت تضادات کا شکار تھی۔ مایوس بھی تھی۔ میں نے پہلے کونسلرز پادریوں اور ماہرین نفسیات سے ملاقاتیں کیں مگر میں کسی کو اپنی بات سمجھا نہ سکی اور مرد مجھے بہرحال چاہتے تھے۔ میرا ایک اچھا دوست ہے جو ایسی باتوں کی معلومات رکھتا ہے کہ دنیا میں کہاں کہاں کون کون سے ماہرین موجود ہیں۔ میں نے اسے کہا، مجھے سب سے ماہر جوتشی ڈھونڈ کر دو۔ تین مہینے کی سرتوڑ کوشش کے بعد اس نے مجھے ہندوستان کے ایک جوتشی پنڈت کا پتہ دیا۔ یہ بھی ایک دکھ بھری مزاحیہ داستان ثابت ہوئی۔

جو کچھ جوتشی نے مجھے بتایا اچھا لگا۔ کہا ''نکی گھر لوٹ آئے گا اور وفادار بھی رہے گا مگر''.... اس نے مجھے ایک طویل اور محبت بھرا خط لکھا جو مجھے سچ تو لگا لیکن کچھ ٹھیک نہیں لگا۔ میں نے نہ جانے کیوں اس کے کہنے پہ ایک لمبا الجھا ہوا سلسلہ شروع کر دیا۔ مشرقی برلن سے اپنی پیدائش کے سرٹیفکیٹ منگوانا کوئی آسان کام تو نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میری ماں نے میری پیدائش کے حساب میں تقریباً بارہ گھنٹوں کی گڑبڑ بھی کی ہوئی تھی۔ اس بیچاری کو شاید ٹھیک طرح سے یاد بھی نہ رہا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے پنڈت جی نے بارہ گھنٹوں کے الٹ پھیر کی وجہ سے میری قسمت کا زائچہ نکالا ہو جبکہ مشرقی برلن کے حقائق تو کچھ اور ہی بتا رہے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ پنڈت جی کا کونسا حساب درست اور کونسا غلط ہوگا۔ انہوں نے پھر یہ بھی کہا کہ میرے حالات یونہی رہیں گے۔ نکی کم کم آئے گا اور ہمارے تعلقات بس سرسری نوعیت کے ہی رہیں گے۔ شادی کا دیوتا میرے لیے یہی ارادے رکھتا ہے۔ نکی کے لیے ایک عورت کافی نہیں ہے۔ بہرحال اس کے نینسی سے تعلقات ایک آدھ سال میں ختم ہو جائیں گے۔ پنڈت صاحب نے مجھے کئی خطوط لکھ کر یہی

دہرایا۔ ایک بار پھر میں گہری مایوسی میں ڈوب گئی اور مجھے خیال آیا، آخر یہ ستارے میرے لیے کیا معنی رکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس نے ان ستاروں کو بنایا ہے، وہ ان کے راستے تبدیل کرنے کی بھی تو قوت رکھتا ہوگا۔ اگر نہیں تو ستاروں سے آگے کوئی اور جہاں بھی ہوگا۔ جہاں یقیناً ایک نہ ایک دن ہم سب جا پہنچیں گے۔ میں نے دعا کرنا شروع کر دی۔

تقریباً چھ ماہ گزرے ہوں گے کہ مجھے پنڈت کا مختصر کچھ کچھ پڑھنے کے قابل خط ملا۔ جو میں پڑھ سکی وہ یہ تھا۔ "ستارے بدل چکے ہیں۔ میں تمہارے لیے ایک لمبی اور خوشگوار شادی شدہ زندگی دیکھ رہا ہوں۔" چونکہ میں وہ خط اچھی طرح پڑھ نہ سکی تھی، لہٰذا میں نے اسے جواباً لکھا کہ وہ مجھے دوبارہ لکھ کر بتائے کہ کیا تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ جب اس کا پھر سے خط آیا تو اس میں سوائے اس کے کوئی ایسی قابلِ ذکر بات نہ تھی کہ ستارے تبدیل ہو چکے ہیں مگر حالات میں بہتری لانے کے لیے مجھے دعا کرنا ہوگی کہ میرا شوہر میرے ساتھ ہی رہے اور جب بھی وہ آئے مجھے اس کو کھلے دل اور بازوؤں سے خوش آمدید کہنا ہوگا۔

پنڈت کی پیشین گوئی کے مطابق نینسی اور ٹی کا تعلق ایک ڈیڑھ سال میں ختم ہو ہی جانا تھا۔ ایک دن دونوں نے مجھے بتایا کہ اب وہ اکٹھے سوتے نہیں ہیں۔ ٹی کہنے لگا، بس نینسی کا گھر اس کے لیے وہ جائے پناہ ہے جہاں وہ بس چلا جاتا ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ وہاں جاتا ہی کیوں ہے؟ پھر ہم دونوں مل کر اس کی کئی وجوہات سوچتے ہیں مگر سب ہی ناموزوں، بے وزن اور بے تکی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا جیسے کہ چاندراتوں میں لہرا چھل کر چاند کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کی دراصل کسی کو بھی وجہ معلوم نہیں کیونکہ یہ بہت بڑا اسرار ہے۔ جو بھی وجہ بتائی جاتی ہے بس ایسی ہی جیسے کتے کو ہڈی پھینک کر مطمئن کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

اب وہ اس کے پاس ہے اور مجھے روز فون کرتا ہے۔ ہم دونوں نہیں جانتے کہ فون کا بل کیسے ادا ہوگا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا "اگر میں وقت کا حساب کرنے لگوں تو ان ساڑھے چار سالوں میں تم نے میری نسبت اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارا ہے۔ میرے ساتھ تو کبھی تم دو ماہ سے زیادہ کبھی نہیں رہ سکے جبکہ اس کے ساتھ چھ ماہ تک گزار چکے ہو۔ تم اور وہ اکٹھے ہم آہنگی سے رہتے ہو، ریلیکس کرتے ہو، تم ہی نے مجھے بتایا ہے تو پھر وہیں کیوں نہیں رہ جاتے، یہاں کیوں آ جاتے ہو۔ پھر یہ اذیت ناک زندگی کیوں؟ ٹی نے جانتے ہو اس کا کیا جواب دیا۔ کہنے لگا، مجھے اس سے محبت جو نہیں ہے۔ اس کا میرا رشتہ تو بس سطحی قسم کا ہے۔ تم ہی سے تو میں قلبی

اور گہرا ٹھوس تعلق محسوس کرتا ہوں اور یقین جانو تم تک پہنچنے کے رستے تلاش کرتا رہتا ہوں میں تمہیں اپنا انتظار کرنے کو نہیں کہہ رہا، تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔'' یہ پہلی بار ہے جب اس نے یہ انکشاف کیا کہ وہ جس جرأت اور گہرائی سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے، اسی کو قائم بھی رکھنے کا خواہش مند ہے۔ یہ گہرا تعلق جو اس کا کہنا ہے کہ اسے مجھ سے ہے۔ کیا ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں مگر میں اسے محسوس ضرور کر سکتی ہوں۔ اسے اگر توڑ سکیں تو شاید پھر دونوں خوشی محسوس کریں مگر ہم دونوں توڑنا بھی نہیں چاہتے اور خوفزدہ بھی رہتے ہیں کہیں یہ خود بخود نہ ٹوٹ جائے۔

ہم جب پہلی بار ملے تو ہم دونوں نے ہی تازہ تازہ اپنے ساتھیوں سے طلاق لی تھی۔ اتفاق کی بات ہے ہم دونوں نے ایک ہی جاب کے لیے اخبار کے اشتہار کو اپنا سی وی بھیجا تھا۔ انٹرویو ایک بہت بڑے ہوٹل میں تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ کلی پہلے سے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے مجھے اپنی نشست آفر کر دی۔ پھر جرمن زبان میں ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔ میں حیران ہوئی کہ میں نے تو اس سے کوئی بات بھی نہیں کی، یہ کیسے جان گیا کہ میں جرمن ہوں۔ جب میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا تو مجھے اس میں قطعاً کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی مگر ایک جھٹکا سا ضرور لگا تھا۔ یوں جیسے میں نے اسے اندر تک جان لیا ہو، پہچان لیا ہو۔ اس نے اس روز گرے اور زرد رنگ کی ٹائی پہنی ہوئی تھی اور میں بتاؤں کہ میں نے بھی گرے ڈریس اور زرد زیر جامہ پہن رکھا تھا جو میری منی سکرٹ سے دکھائی بھی دے رہا تھا۔ ویسے حیرت کی بات ہے، میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ حالانکہ میں اتنی فیشن کی دلدادہ بھی کبھی نہیں رہی تھی۔ اگلے گیارہ سال، اس لمحے تک جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے چھوڑ رہا ہے، ہم دونوں ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہیں ہوئے۔ پھر مجھے بعد میں خیال آیا، جب میں سات سال کی عمر کی بچی تھی تو میرے ذہن میں میرے ہونے والے شوہر کا ایک خاکہ ابھرتا تھا۔ وہ میرے پہلے شوہر کا نہیں تھا۔ وہ کلی کا تھا۔ وہ سب کیا تھا؟ پتہ نہیں۔

وہ گیارہ سال ہم نے بڑی خوشی سے گزارے تھے۔ پھر بھی مجھے کبھی کبھی محسوس ہو گیا تھا جیسے کلی مجھ سے کسی گہرے تعلق کے خیال کی مزاحمت کرتا رہتا ہے۔ مجھے لگتا جیسے وہ مجھے سب کچھ نہیں بتا رہا۔ میں اکثر اس سے اس بارے میں پوچھتی رہتی مگر وہ کوئی جواب نہ دے پاتا۔ آخر میں نے خدا سے دعا کی کہ ہمیں ایک کر دے۔ تین سال کے بعد ہماری موجودہ صورتحال کا دور شروع ہو گیا۔ اس سے قبل ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے نیند نہ آئی۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ میں

بیڈروم میں اٹھ کر نیچے کی منزل میں جا پہنچی اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ برف کے بڑے بڑے گالے اڑ اڑ کر میری لالٹین کے آگے رقص کرتے نظر آنے لگے۔ سارا بیک یارڈ سفید سفید برف سے بھر گیا اور ماحول پراسرار دکھنے لگا۔ اچانک بادل زور سے گرجے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کی وہ للکار کسی آنے والے طوفان کا اعلان کر رہی ہو۔ میرا دل خوف سے بھر گیا اور میں نے خدا سے سچے دل سے دعا کی کہ وہ ہماری حفاظت کرے۔ میرے دوست بتاؤ، کیا یہ سب کچھ عارضی نہیں ہے؟

دنیا کا عظیم لٹریچر ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی ابدی نہیں ہوتی۔ ہمیں وہ یہ بھی سکھاتا ہے کہ زمان و مکان کی قید سے باہر نکل کر جینا آسان نہ سہی مگر ضروری بہت ہے۔ جب سے کلی اور میرے درمیان یہ مسائل ہوئے ہیں، ہم نے اپنی شادی پہ کیے گئے عہد و پیمان دہرانا شروع کر دیے ہیں۔ پادری نے شادی کے وقت کہا تھا ''ہم تب تک جدا نہ ہوں گے جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے۔'' ہم دونوں نے اس بات کو کھلے ذہن اور ہر طور سے ڈسکس کیا اور اس نتیجے پہ پہنچے کہ ''ہم موت کو یہ اختیار کیوں دیں کہ وہ ہمیں جدا کر سکے۔ اس کا جدائی سے کیا کام؟'' کلی کہنے لگا ''جدائی ہمیں موت کی درکار ہے، ایک دوسرے کی نہیں۔'' کیا یہ سب خوابوں کی سی باتیں ہیں؟ کیا حقیقت کی تلخ دنیا میں انہیں قابل عمل بنایا جا سکتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں، سچ صرف درد کی راہ پہ چلنے سے ہی حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ سچ کا کوئی دوسرا راستہ بھی تو ہوگا۔ ایسا راستہ جو درد سے خالی ہو۔ کہاں ہے وہ راستہ؟

آخری بار جب وہ مجھے چھوڑ کر گیا، اس کو دو مہینے ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے شاید حادثاتی طور پہ، اگر حادثہ اس کائنات میں کوئی بامعنی نظریے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے لیے ایک جاب بھی ڈھونڈ لی تھی۔ کلی کا خیال تھا یہ اس کی آخری ترین ہے۔ اسے لوگوں کو تربیت کے لیے گھیر کر لانا ہوتا ہے، تنخواہ تو اچھی تھی مگر کلی کے لیے لوگوں کو ڈھونڈنا آسان نہ تھا۔ اسے بہت زیادہ وقت گھر سے دور گزارنا پڑ رہا تھا اور میں اس کی عدم موجودگی کے امتحان کے لیے اب خود کو تیار نہیں پا رہی تھی۔ میرے بچے بڑے ہو کر گھر سے جا چکے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میں مکمل طور پر یہ تنہا زندگی گزار رہی ہوں۔

یہ تقریباً میری پوری کہانی ہے یا شاید جتنی مجھے خود پتہ ہے۔ تم سے کہہ دینا اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے تم مجھے سمجھ سکتے ہو، یہاں ہماری سوسائٹی میں زیادہ تر لوگ اسے سمجھ نہیں

پاتے۔ میں اپنی کچھ نظمیں بھی تمہیں بھیج رہی ہوں۔ یہ کوئی اتنی بُری بھی نہیں ہیں۔ ان کی کمزوری یہ ہے کہ یہ ہومر کی Odyssey جاننے کے بعد لکھی گئی ہیں جو تم جانتے ہو کہ ایک طویل یونانی نظم ہے۔ میں نے اپنے طلبہ کو یہ متعدد بار پڑھائی ہے اور میں اس نتیجے پہ پہنچی ہوں کہ ہومر اس کا حقیقی مصنف نہیں ہوسکتا۔ یہ یقیناً وہ کہانیاں ہیں جو اسے زبانی سنائی گئی ہیں اور نسل در نسل منتقل کی ہوئی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ تمہارے ملک میں یہ پڑھائی جاتی ہیں یا نہیں؟

اچھا جب میں نے رامائن پڑھی تو مجھے بھی یہ یقین ہوگیا کہ بالمکی ایک گہرا اوژن اور ذہانت رکھنے والا شخص تھا۔ ایسا دکھتا ہے کہ کہانی میں کئی قسم کے پیچ ہیں جو میرے پلے نہیں پڑے۔ میرا خیال ہے اور یجنل Odyssey بھی ایسی ہی ایک کہانی رہی ہوگی مگر جس طرح سے ہومر اسے کہتا ہے، مجھے لگتا ہے اسے خود بھی پیچ کی اس قسم کی تہوں کا ادراک نہیں ہوا ہوگا۔

اوڈیسی کی کہانی ہم تک کچھ یوں پہنچتی ہے۔ اوڈیسس (Odysseus) ٹرائے کی جنگ میں جیتتا ہے تو وہ اور اس کے ساتھی اپنے بحری جہازوں میں گھروں کو لوٹتے ہیں مگر وہ یک چشمی مانسٹر سائیکلو (Cyclops) کو اندھا کر دیتا ہے جس کا باپ پوسائیڈن (Poseidon) سمندروں کا خدا ہے۔ پوسائیڈن اسی وجہ سے آڈیسس کو ڈبو دینا چاہتا ہے مگر کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ اتھینا (Athena) جو کہ ذہانت کی خدا ہے، اس کا ساتھ دیتی رہتی ہے۔ پوسائیڈن بہرحال یہ کرتا ہے کہ اسے کسی جزیرے پہ لے جا پھینکتا ہے اور یوں اسے دہری دیر ہوتی جاتی ہے۔ اسے گھر پہنچنے میں مزید دس سال لگ جاتے ہیں۔ گھر کو لوٹنے کے اس سفر کو ہی Odyessey کہا جاتا ہے۔ اسی دوران اس کی بیوی Penelope پینالوپی بیس سال تک وفاداری سے اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں زیادہ نہیں مگر یہ ضرور بتایا جاتا ہے کہ اسے چاہنے والے اس کے دروازے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ انہیں یہ کہہ کر ٹالتی رہتی ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب ضرور کرلے گی مگر ابھی نہیں۔

انہیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ وہ دراصل اپنے سسر کے لیے ایک کوٹ بُن رہی ہے اور جب تک وہ ختم نہیں ہوگا، وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ وہ دن بھر اسے بُنتی ہے مگر رات کو اپنا بنا ہوا ادھیڑ دیتی ہے اور یوں وقت گزرتا جاتا ہے۔ جب اوڈی سس بالآخر گھر پہنچتا ہے تو اسے اس کے کتے کے سوا کوئی نہیں پہچان پاتا۔ وہ اپنے ہونے کا اظہار کرنا چاہتا ہے، لہٰذا اپنے کمال ہنر سے بارہ کلہاڑی نما ہینڈلز سے ایک تیر گزارتا ہے جو صرف اُسی کا خاصہ رہا تھا اور اس کے علاوہ کبھی

کوئی نہ کر سکا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک خونی لڑائی لڑتا ہے جس میں اپنی باوفا بیوی پینالوپی (penelope) کے تمام خواہش مندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

میری نظموں میں پینالوپی ہی اوڈیسی نظم کی شاعرہ ہے۔ مہمات وہ ہیں جو اس کے بُننے اور ادھیڑنے کا عمل ہے۔ ہر ایک سے وہ ایک مختلف سوچ بُنتی ہے کہ اب اس کا محبوب شوہر کیا کر رہا ہوگا۔ اس میں اس کی اپنی خواہش اور تمناؤں کے تانے بانے بھی موجود ہیں، لہٰذا ہر ٹانکا ایک چاہنے والا اور ایک دنیا بھی ہے۔ اس کی دنیا ادھیڑ بُن میں کھوئی ہوئی ہے۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔

آپ نے مجھے پاکستان آنے کی دعوت دی ہے، بہت شکریہ لیکن میں مالی مشکلات کی وجہ سے آ نہ سکوں گی۔ آپ کے خط میں بار بار پڑھتی ہوں، کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں آپ۔ ویسے مجھے دنیا دیکھنے کا اب کوئی خاص شوق تو نہیں رہا مگر آپ کی دنیا دیکھنے کا ارمان اب دل میں ضرور پیدا ہو رہا ہے۔ اپنی بیگم کو میری طرف سے سلام اور محبت ضرور دیں۔ آپ کی دوستی، محبت اور توجہ کے لیے، بہت بہت شکریہ۔

اینجیلا

ERIE۔ پنسلوانیا۔ یو ایس اے۔ 1988ء

---------O---------

ہند کا اولین سفر۔ سنہ 2004ء

سوچتے تھے کبھی ہندوستان جائیں گے۔ یوں کریں گے، ووں کریں گے، فلاں سے رابطہ کریں گے، فلاں سے پینگیں بڑھائیں گے۔ جانے سے پہلے بڑا واضح، مفصل پروگرام ہوگا۔ ساتھ میں نہ جانے کون ہوگا۔ (ہنسیئے مت کم از کم امید تو کی جا سکتی ہے نا) مگر ہوا یوں کہ ساری کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ اچانک ہی جانا پڑ گیا۔ نہ کوئی ارادہ نہ کوئی تیاری، نہ اڑن کھٹولہ نہ شاہی سواری۔ بس پروین عاطف کا پیغام آیا کہ چلو سامان باندھو ہم انڈیا جا رہے ہیں۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر ہاں کر دی (تب بھی ایسے ہی کہا تھا) پروین یوں تو میری پھوپھی ہیں لیکن غیر سرکاری طور پر وہ میری گوڑھی سہیلی ہیں اور میں چونکہ ان کو کبھی ناں نہیں کر سکتی، لہٰذا انکار نہ کر سکی اور ہاں کہہ دی۔ کہنے لگیں ''ممبئی میں ورلڈ سوشل فورم کا کٹھ ہو رہا ہے جس کے لیے بہت سی این جی اوز جا رہی ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی اپنے خرچ پہ کسی این جی او کے ساتھ ہو لیں؟''

بھاگم بھاگ ہم دونوں این جی او کے دفتر پہنچے۔ اپنے پاسپورٹ جمع کروائے، رقم ادا کی اور جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ جنوری کے خوشگوار موسم میں انڈیا کی سیر کا خیال اچھا لگا۔ سوچا موسم سہانا ہوگا، دل دیوانہ ہوگا جب انڈیا کو جانا ہوگا۔ انڈو پاک کے موجودہ ''دوستی موسم'' سے یہ بھی تاثر مل رہا تھا کہ جیسے اب ہمارے بارڈر مکھن ملائیوں جیسے نرم ہو گئے ہیں، کبھی ہم پھسل کر ادھر نکل جایں گے اور کبھی اس پار پہنچ جائیں گے۔ یہ خبر نہ تھی کہ دوستی کی تمام تر نعرہ بازیوں اور پیش قدمیوں کے باوجود انڈیا یا پاکستان کے ویزا دفاتر دانت نکوسے بیٹھے ہیں کہ ''آؤ تو سہی، دیکھو ہم تمہارے ساتھ کبڈی کبڈی کھیل کر تمہیں کیسے پچھاڑتے ہیں، تمہیں چت گراتے ہیں۔''

ہوا وہ جس کا مجھے ذرہ نہ تھا۔ میرا خیال تھا میرا پاسپورٹ امریکن ہونے کی وجہ سے مجھے ٹھک سے ویزا مل جائے گا اور دوسرے منہ دیکھتے رہ جائیں گے مگر جو ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ انڈیا ویزا آفس نے کہہ دیا کہ انہیں پاکستان میں میری موجودگی مشکوک اور امریکن شہریت نامطلوب لگی تھی۔ بھاگے دوڑے، لپکے لاہور سے اسلام آباد کے کئی فون کھڑکائے مگر انڈین ہائی کمیشن نے بھی ہمارے ہی دفاتر کی طرح فون نہ اٹھانے کا قصد کر رکھا تھا۔ سر پیٹ لیا، بال نوچ لیے۔ (کپڑے پھاڑنے کے خیال پہ ذرا جھجک گئے۔) لاہور سے اسلام آباد کتنی ہے مہنگے فون کیے مگر گھنٹی بس بجے چلی جاتی اور کوئی فون نہ اٹھاتا۔ تنگ آ کر میں نے اپنے کزن عزیز ڈاکٹر پرویز ساکن اسلام آباد کی منت کی کہ بھیا ذرا جاؤ اور جا کر پتہ لاؤ کہ یہ لوگ فون کیوں نہیں اٹھاتے۔ رحمدل پرویز دل جس کا ہے شفقت سے لبریز، یہ سن کر بولا کہ میں جو ہوگا کروں گا اور آپ کے اس سوال کا جواب حاصل کر کے چھوڑوں گا۔ اس نے اپنا کارندہ دوڑایا جو یہ مایوس کن خبر لایا کہ انڈین ہائی کمیشن کا سٹاف حال ہی میں منعقد ہونے والی سارک کانفرنس کی وجہ سے تھک گیا ہے۔ ارکانِ دفتر اب اپنی سیٹ پہ کم ہی بیٹھتے ہیں۔ زیادہ وقت چائے پی کر اپنی تھکن اتارتے ہیں۔

یہ تو خیر سے ہم بھی جانتے تھے کہ ہم برصغیر کے لوگوں میں سستیاں، بے قاعدگیاں، بے کاری کی شوقینیاں ایک جیسی ہیں مگر افسوس کہ سانجھ کا یہ مظاہرہ ہمارے کسی کام نہ آ رہا تھا۔ ہمیں تو بس ایک سیدھا سادا معصوم سا ویزا چاہیے تھا جس کے لیے ہم ہر طرح کے پاپڑ بیلنے کو تیار تھے مگر ہماری خدمات کی یہ آفر ضائع جا رہی تھیں کیونکہ آج کل کے دور میں پاپڑ کھاتا کون ہے؟ میرا پاسپورٹ پنگ پانگ کے بال کی طرح لاہور سے اسلام آباد کے درمیان اچھلتا رہا اور ٹی سی ایس والے خوشحال ہوتے چلے گئے۔

پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ میرا تو ویزا لگ گیا مگر پروین کو ویزا دینے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ حیرت کی بات تھی۔ ان کا تو شریفانہ سا پاکستانی پاسپورٹ تھا جس میں سابقہ سفروں کے ان گنت ویزے لگے ہوئے تھے مگر شاید انڈیا والے اس بات سے امپریس یا قائل نہیں ہوئے تھے۔ شخصی طور پر حاضر ہونے کے باوجود انہیں ویزا نہ ملا تو وہ بہت دلگرفتہ ہوئیں۔ متعدد کالیں کیں، مگر دفتر والے ٹس سے مس نہ ہوئے۔

زندگی میں انہوں نے اور میں نے بہت سفر کیا ہے۔ (یہاں انگریزی والا بھی سمجھا جا سکتا ہے) لیکن سنگی ساتھی ہونے کے باوجود ہم دونوں نے کبھی اکٹھے کوئی سفر نہیں کیا۔ کچھ ایسا

عجیب اتفاق ہوتا ہے کہ ہم دونوں جب بھی سفر کو نکلتی ہیں علیحدہ علیحدہ ہی جاتی ہیں۔ اب کی بار سوچا تھا ہمارا یہ شوق پورا ہو جائے گا لیکن شومئی قسمت کہ ایسا ہو نہ سکا۔ ظالم سماج نے ہمیں ایک بار پھر جدا کر دیا تھا۔ مایوسی ہوئی، دل ٹوٹ گئے، جی تو میرا بھی چاہا کہ نہ جاؤں لیکن کیا کرتی، سفر کے اخراجات بمعہ موٹی ویزا فیس کے پیشگی ادا کر چکی تھی، لہٰذا اٹھی، کمر باندھی اور چل دی دیکھنے کو کہ خدا کیا کرتی ہے۔ (خدا مونث بھی ہو سکتا ہے)

دفتر سے ہدایت ملی تھی کہ آپ صبح ٹھیک سات بجے پہنچ جائیں ورنہ ہم آپ کے بغیر ہی روانہ ہو جائیں گے۔ یہ سن کر میرے تو غم سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کہیں یہ مجھے چھوڑ کر ہی نہ چل دیں۔ یہ خوف اتنا بھیانک تھا کہ رات بھر نیند ہی نہ آئی اور میں صبح پانچ بجے اٹھ کر تیار ہو گئی۔ ایک بڑے سے تکیہ نما ٹریول بیگ (جو میں نے نیو یارک سے خریدا تھا اور بعد میں اسی قسم کا اچھرے میں رُلتا ہوا پایا تھا) میں کچھ گرم کپڑے، کتابیں، منا سا تکیہ، کمبل اور ضروری چیزیں رکھیں اور گھر سے نکل پڑی۔ سوچا سویرا تو ہونے ہی والا ہے، کوئی نہ کوئی رکشہ مل جائے گا مگر جنوری کی صبح چھ بجے سڑک سنسان اور بے جان نظر آئی تو پریشانی ہونے لگی۔ ٹھنڈ اتنی زیادہ تھی کہ گمان گزرا شاید میں لاہور میں نہیں سائبیریا میں ہوں۔ رکشہ نام کی کسی ایجاد کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اپنی پھڑکتی ہوئی رگ ایڈونچر کو قابو میں کیا اور چار و ناچار اپنی نیک طینت ہمسائی عائشہ کی بیل بجائی جو اپنے بیٹے کو سکول ڈراپ کرنے کے لیے جاگ چکی تھی۔ عائشہ بی بی نے میری سمسیا سن کر گاڑی نکالی اور مجھے چھوڑ کے آنے پہ رضامند ہو گئی۔

گلبرگ میں واقع این جی او کی شاندار بلڈنگ کے آگے وین گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ جو لوگ ان کے پاس کھڑے تھے، انہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پاکستان کے مختلف اور دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے ہیں۔ سندھی، پٹھان، کیلاشی، کراچی والے۔ سب سٹوں پہ سیٹ ہو گئے اور چند ہی لمحوں میں وین اپنی منزل یعنی واہگہ بارڈر کی جانب روانہ ہو گئی۔ ایک خوبصورت صبح طلوع ہو رہی تھی اور میں لاہور کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ دل میں اک ہُوک سی اٹھی۔ لاہور شہر چھوڑتے ہوئے دل ہمیشہ ہی کمزور پڑ جایا کرتا ہے۔ اس شہر نے تو جیسے دل کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

عین آٹھ بجے صبح ہم لوگ واہگہ بارڈر پہنچ گئے۔ بابِ آزادی گیٹ کے اُس پار دشمن ملک تھا جس سے آج ہم دوستی کرنے جا رہے تھے۔ نہ جانے کیسا تھا وہ دیس جو پہلے ہمارا بھی تھا

مگر اب صرف اُن کا تھا، جو اس طرف رہتے تھے، ہمسائے ہونے کے باوجود ہم دونوں ہمسایوں نے اکٹھے رہنا نہ سیکھا اور دیوار پار سے ایک دوسرے کو پتھر مارتے رہے۔ تعصب اور بیگانگی کا ورثہ اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کیا اور محبتوں کی اہمیت کو نہ جانا نہ مانا۔ میں اس واہگہ گیٹ بارڈر پہ پہلے بھی چند بار آکر پرچم اتارنے اور گیٹ بند کرنے کی رسمی کارروائی دیکھ چکی تھی مگر اب تو میں گیٹ کے اس پار جانے والی تھی۔

واہگہ بارڈر کی یہ پرچم کارروائی پچھلے چند سالوں سے قومی اور بین الاقوامی میڈیا کی توجہ کا مرکز بن چکی ہے۔ اس کا ذکر اکثر ٹی وی پروگرامز، اخبارات، رسائل میں بھی ملتا ہے اور لوگ جوق در جوق شام ڈھلنے سے پہلے پہلے یہ نمائش، انوکھی کارروائی دیکھنے کے لیے چلے آتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے لوگ اپنی اپنی سائیڈ پہ سٹیڈیم سٹائل سیٹوں پہ بیٹھ کر دوسرے ملک کی طرف پرتجسس نظروں سے دیکھتے ہیں اور قومی نعرے لگاتے ہیں۔

پاکستانی سائیڈ کے رینجرز چست، چاق و چوبند، گرانڈیل دکھتے ہیں۔ جب وہ اپنی سرمئی یونیفارم پہنے سنجیدگی اور درشتی سے اپنے گیٹ کی طرف چلتے ہیں تو ان کے مارچ کرنے کی شدت سے زمین کانپنے لگتی ہے۔ دوسری طرف بھی غالباً ایسا ہی کچھ ہو رہا ہوتا ہوگا۔ وہ ہمیں کبھی صاف نظر نہیں آیا۔ دونوں سرحدوں کے رینجرز اپنے اپنے پرچم اتار لینے کے بعد ایک دوسرے کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے زور زور سے اپنے گیٹ بند کر لیتے ہیں۔ پل بھر کو دونوں گیٹ کھلتے ہیں تو بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ سپاہی ایک دوسرے سے مصافحہ کر کے سلیوٹ مارتے ہیں اور پھر سے غیر بن جاتے ہیں۔ انڈین پاکستانی ملی ترانوں کا شور بہہ کر ادھر سے اُدھر پھیلتا نکلتا جاتا ہے تو یہ محسوس کر کے بھی بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ان کے بھی انڈین فلمی ترانے ہمیں بھی اسی طرح یاد ہیں اور اچھے لگتے ہیں۔

انڈین سپاہی ہمارے پاکستانی رینجرز کی نسبت جسمانی طور پر قدرے ہلکے، رنگ کے سلونے اور قد کے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پاکستانی رینجر تو اتنے توانا، قدآور اور رعب دار ہیں کہ ان کی مارچ کرتی تصاویر دنیا بھر کے میڈیا میں دکھائی جا چکی ہیں۔ وہ جب لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے تو ان کے منہ سے سانپ کی سی پھنکاریں سنائی دیتی ہیں۔

پرچم کشائی اور اترائی کی یہ رسم دیکھنے کے بعد انڈین اور پاکستانی عوام کو باڑ کے اردگرد چکر لگا کر ایک دوسرے کو دور سے دیکھنے دیا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے چند فٹ کے

فاصلے سے گزرتے ہوئے تقسیم شدہ برصغیر کے لوگ ایک دوسرے کو حیران حیران آنکھوں سے دیکھتے ہوئے خاموشی سے گزرتے جاتے ہیں۔ دل میں یقیناً کئی سوالات اور خیالات لیے کہ اس پار کے لوگ کیسے ہیں؟ کیسے دکھتے ہیں؟ کیسے رہتے ہیں؟ الگ رہنے کے باوجود اپنے اپنے سے کیوں لگتے ہیں؟

اس حالیہ دوستی کی فضا قائم ہونے سے پہلے میں نے واہگہ بارڈر کے سرد، خشک ماحول کو دیکھ کر اکثر سوچا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر دونوں ملکوں کے سپاہی اور عوام ایک دوسرے کو خشمگیں غیریت بھری آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے محبت بھری نرم نگاہوں سے پیار کے پیغام بھیجتے، ہاتھ ملاتے، مسکراتے۔ تقریباً ساٹھ برس سے زیادہ ہونے کو آئے مگر ایک سانجھی تاریخ اور تہذیب کے دعویدار ہو کر بھی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑے، روٹھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس انتظار میں کہ کوئی باہر والا آئے، ہماری دوستی کروائے، ہماری ایک دوسرے سے دوبارہ شناسائی کروائے اور برصغیر میں سکھ چین، امن راج کرے۔ کتنی فضول سوچ ہے یہ.....

شکر ہے اب کچھ موسم بدلا ہے، رُت گدرائی ہے۔ امن کی خوشبو کے مہکتے جھونکے بارود کی بدبو کو دور بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ماحول صاف صاف لگنے لگا ہے کہ نفرت کی آلودگی تو دلوں کو بھی سیاہ کر ڈالتی ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ صبح سویرے واہگہ بارڈر پہ این جی اوز کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ ورلڈ سوشل فورم میں شامل ہونے کو کئی قافلے جا رہے تھے اور ہم اس خوش فہمی میں تھے کہ شاید ہم اُن چند گنے چُنے خوش نصیبوں میں سے تھے جو انڈیا جا رہے تھے۔ ہمارا گروپ گو کہ سب سے پہلے وہاں پہنچا تھا مگر آفس ونڈو پر وہی پاکستانی شائل دھکم پیل، وہی آگے نکل جانے کی جلدی، قطار نہ بنانے کی عادت کے مظاہرے دیکھنے کو ملے۔ کھڑکی کے آگے ہاتھ میں پاسپورٹ تھامے میں سب سے پہلے آئی تھی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا، کون کون آگے آیا، مجھے پیچھے کرتا چلا گیا۔ کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں تو بس منہ ہی دیکھتی رہ گئی۔ ایسا ہمیشہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے، پتہ نہیں۔

واہگہ امیگریشن آفس سے تقریباً گیارہ بجے خلاصی ہوئی تو ہمیں بارڈر کراس کرنے کا اذن ملا۔ آرڈر ملا کہ جو جو کلیئر ہوتا چلا جائے، آگے کو چلتا چلا جائے۔ یہ سن کر میں نے اپنا ڈھول نما، بے ڈھب، لمبوترا بیگ اٹھایا اور اسے اس کے زنگ آلود پہیوں پہ رکھ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ خبر نہ تھی کہ بوجۂ عدم جوانی اب عمر رسیدہ ہڈیوں کی ناتوانی اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ ہم جو خود کو ہی

گھسیٹے پھر رہے تھے تو بہت تھا۔ ایک مجبوری تھی اور ہم تھے دوستو۔ ہم کہاں کے دانا تھے جو دوسری نوجوان لڑکیوں کی طرح سمارٹ سے ماڈرن سوٹ کیس لیے ان کے لمبے لمبے ہینڈ تھامے انہیں پالتو پوڈل کتوں کی طرح لیے لیے پھرتے۔ پھر یہ خبر بھی نہ تھی کہ دونوں سرحدوں کے درمیانی حصے یعنی نو مینز لینڈ کے فرلانگ بھر ایریا میں ہمیں پیدل مارچ کر کے جانا تھا۔ جان بڑی مشکل میں آ گئی تھی۔ ہم نے بیچارگی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو اپنے ہاں کی طرح کے چند قلی حضرات کھڑے نظر آئے جو شاید ہم جیسے کسی بے وقوف شکار کی تلاش میں تھے۔ کاندھے پہ پٹکا، سر پہ ٹوپی، قدرے ملکے جُثے والے ایک دو قلی ہماری طرف لپکے۔ ایک بابا جی قلی نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا تو ہم نے انہیں اپنا سامان اٹھا کر ساتھ چلنے کا اشارہ کر دیا۔ میں پیدل قلی بابا کے ساتھ اپنے ملک سے اس کے ملک کے اندر تک چلی جا رہی تھی۔ اس قلی کی شکل بھی میرے ملک کے کسی بھی قلی سے مماثلت رکھتی تھی۔ کپڑے، شکلیں، رنگ ڈھنگ اور سب سے بڑھ کر ان کا ایک سے معاشی طبقے سے تعلق صاف نظر آ رہا تھا۔ بابا جی اور میرا فرلانگ بھر کا ساتھ رہا مگر اس دوران ہی میں نے جان لیا کہ اس کی ایک جوان بیٹی بیاہنے والی عمر میں ہے اور جہیز کی فکر نے اس کی نیندیں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ لو بھئی یہ تو اپنے ہی گھر والی بات ہو گئی۔

انڈین سائیڈ پہ پہنچتے ہی اس طرف تعینات ایک سپاہی نے بڑے پیار سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمارے بہن بھائی آ رہے ہیں۔" اس جملے میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ میرے دل و دماغ پہ یکدم ایک نشہ سا چھا گیا اور میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ بہت ہی اچھا محسوس ہوا۔ جواباً اچانک میرا ہاتھ خود بخود ماتھے تک چلا گیا اور میں مسکرا دی۔ سوچا کیا کہوں اسے؟ سلام، ہیلو، نمستے، ست سری اکال؟ پتہ نہیں اب تک پہلا لفظ جو کان میں پڑا وہ محبت کا تھا۔ اس پہ مجھے امید بندھ گئی۔ سوچا اپنوں کا ہی دیس ہے۔ کسی غیر کا نہیں۔ اناری کے امیگریشن آفس پہ کئی پاکستانی این جی اوز کے ارکان اپنی انٹری کروانے میں مصروف تھے۔ ایک خوبصورت گلاب کی کلی جیسی کھلی کھلی پاکستانی لڑکی کو دیکھا تو میں بس اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ سر پہ پٹھانوں جیسی سفید گرم ٹوپی پہنے، کالی شلوار قمیض میں ملبوس دمکتے چہرے والی لڑکی کے ہر انداز سے خود اعتمادی جھلکتی تھی۔ نہ جانے کون تھی وہ؟ پر تمکنت شخصیت والی لڑکی نے سفر کے آنے والے دنوں میں بھی مجھے اپنی طرف متوجہ رکھا۔ امیگریشن آفس میں ہر طرف غسلخانے کی ناگوار بو تھی مگر کاؤنٹر پر بیٹھا عملہ بڑی مستعدی اور نظم و نسق سے اپنا کام نپٹا رہا تھا۔ کئی ان پڑھ افراد فارم پُر کروانے کے لیے پڑھے لکھے

ساتھیوں کی مدد مانگ رہے تھے۔ اس لڑکی نے بھی اپنے ناخواندہ ساتھیوں کے فارم بھر کے کاؤنٹر پر جمع کروا دیئے۔ ایک سندھی کا پاسپورٹ چیک کرنے کے بعد ایک امیگریشن افسر نے زور سے میز پر یوں کھسکا کر لڑھکایا کہ وہ دور تک چلا گیا۔ سندھی شخص سمجھا شاید اس کے پاسپورٹ یا ویزا میں کوئی مسئلہ ہے۔ وہ گھبرا کر غش کھا گیا۔ خوبصورت پاکستانی لڑکی نے آگے بڑھ کر اس انڈین افسر سے درشتی سے پوچھا ''آپ لوگ اپنے مہمانوں سے اس طرح کا سلوک کرتے ہیں؟'' اس کی جرأت کے آگے وہ افسر شرمندہ نظر آنے لگے۔ فائٹر اور باغی لڑکیاں مجھے ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہیں، لہٰذا چند ہی لمحوں بعد ہم نے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر لیا اور ہماری دوستی ہوگئی۔ مجھے یہ جان کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ یہ تعلیم یافتہ لڑکی کیلاشی ہے جو پاکستان کے ایک انوکھے، پراسرار قبیلے کے طور پر دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ پہاڑوں کی اس بیٹی کا نام گلشن اور افلاس تھا۔ دونوں ہی نام جنگلی پھولوں کی طرح خوبصورت اور مہکار سے بھرے تھے۔ گلشن نے یہ بتا کر مجھے مزید حیران کر دیا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ پائلٹ ہے اور اپنے علاقے کی پہلی میٹرک پاس لڑکی۔ اب بھی وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہیں رہتی ہے۔ اپنے قبیلے کے لوگوں کی بہبود کے لیے کام کرتی ہے۔ اس نے اپنے قبیلے کی لڑکیوں کو ایک بار کسی یونانی تنظیم کے ساتھ یونان بھی بھیجا تھا تاکہ وہ جان سکیں کہ سکندرِ اعظم کی چھوڑی ہوئی سپاہ کی یہ نشانیاں کس اور کیسے وطن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی اصل کیا ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد کی سرزمین کیسی ہے؟ گلشن نے سفر کے دوران مجھے اپنے لیپ ٹاپ کمپیوٹر پہ اپنے خوبصورت کیلاشی گھر کی تصاویر بھی دکھائیں جو اس نے خود اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنے گھر کے لیے لکڑی سوئٹزرلینڈ کے جنگلوں سے منگوائی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کیا کیلاش کے جنگلوں کی لکڑی اس کے معیار کی نہ تھی مگر مجھے کیا پتہ، اس کی کوئی اپنی ہی ضرورت ہوگی جس کے تحت اس نے ایسا کیا ہوگا۔

گلشن کے ساتھ کیلاشی مرد و زن کا ایک گروپ تھا جس میں ایک شخص کچھ خواندہ تھا۔ اس کا نام قائداعظم مجھے بہت دلچسپ لگا اور قائداعظم سے اس کی عقیدت سے میں بہت متاثر ہوئی۔ قائداعظم کیلاش میں ہوٹل چلاتا تھا اور گلشن اور وہ دونوں بڑی محبت سے اپنے باقی ساتھیوں کا خیال رکھتے تھے۔

ہم امیگریشن سے فارغ ہوئے تو کرنسی کاؤنٹر والی خاتون نے مجھ سے پوچھا ''آپ کتنی رقم لے کر جا رہی ہیں؟'' میں نے بتا دیا۔ سات ہزار انڈین روپے جو میں نے دس ہزار

پاکستانی روپوں کے عوض حاصل کیے تھے۔ وہ مسکرا کر بولی "ویسے تو آپ کو صرف پانچ ہزار انڈین روپے لے جانے کی اجازت ہے مگر چلیے میں آپ کو جانے دیتی ہوں۔ آخر یہاں سے شاپنگ بھی تو کر کے جانا ہے۔" میں نے مسکرا کر اسے قائل کرنا چاہا۔ عورت تھی نا.....دوسری عورت کی بات آسانی سے سمجھ گئی اور اس نے مجھے جانے دیا۔ قلی بابا تمام وقت میرے ساتھ رہا اور مجھے گائیڈ کرتا رہا مگر جیسے ہی میں نے اسے فارغ کر کے سو روپے دیئے وہ مجھ سے تکرار کرنے لگا۔ وہ تو شکر ہوا کہ ایک انڈین افسر نے مداخلت کی اور اس سے میری جان چھڑوائی ورنہ تو وہی حال ہو گیا تھا جو ہمارے قلیوں سے سامان اٹھوانے کے بعد ہوتا ہے۔

تقریباً سو افراد کا قافلہ باری باری اپنے سامان کی چیکنگ کے مراحل سے فارغ ہو کر اب باہر نکل آیا تھا جہاں چند بسیں ہمیں امرتسر لے جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ تقریباً ایک بجے دوپہر کا وقت ہو چکا تھا، لہٰذا سبھی کو لنچ کی طلب نے بے چین کرنا شروع کر دیا۔ ہم لوگ ایک کھوکھا نما چائے شاپ کے لکڑی کے بنچوں پہ بیٹھ گئے۔ کچھ نے کولڈ ڈرنک، چائے اور آلو کے کٹلس کا آرڈر دیا اور کھانے میں مشغول ہو گئے۔

میں اپنے وطن سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور آ چکی تھی مگر اس طرف بھی وہی موسم، وہی فضا، وہی دھوپ، وہی ہوا، وہی درخت، وہی زمین، وہی آسمان تنا تھا۔ پنجاب اِدھر تھا اور پنجاب اُدھر بھی۔ "ہائے یہاں کے کوّے بھی ہمارے کوّوں جیسے ہیں۔" کسی نے سادگی سے فقرہ کہا تو میں مسکرا دی۔ دونوں طرف سرسبز پنجاب کی زرخیز زمین تھی مگر ایک فرق میں نے ضرور محسوس کیا۔ پاکستانی سائیڈ پہ اُگنے والی فصل بہت چھوٹی اور کمزور سی تھی مگر ہندوستانی فصل بڑی قد آور، توانا اور زور شور سے لہراتی تھی (رینجرز والا معاملہ یہاں الٹ ہو گیا تھا) اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی زراعت میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ ان کی حکومت کاشتکاری میں از حد دلچسپی لیتی ہے اور اپنے کسانوں کو مفت بجلی اور دوسری بہت سی آسانیاں دیتی ہیں۔ ان کے ہاں وافر مقدار میں اناج پیدا ہوتا ہے اور پورے ملک میں کہیں بھی ایک بھی ایکڑ زمین بلا کاشت نہیں چھوڑی جاتی۔

شاید صحیح جمہوری نظام کے یہی فائدے ہیں کہ وہاں عوام کی بہتری اور سہولت کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو بس فوجی حکمرانوں اور سیاستدانوں کے وارے نیارے رہتے ہیں۔ وہ ہم تمہارے تم ہمارے رہتے ہیں اور بندر بانٹ میں سارا ملک ڈھیرے ڈھیرے چٹ ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی آٹا ناپید ہو جاتا ہے تو کبھی مرغی پر لگا کے اتنی اونچی اڑ جاتی ہے کہ عوام

اسے بس دیکھ ہی سکتے ہیں، نیچے لا کر کھا نہیں سکتے۔

لوگ کھوکھے والے سے چائے لے کر پی رہے تھے مگر وہ چائے اتنی پتلی اور ذرا سی تھی کہ اسے دیکھ کر میں نے اپنے لیے چائے منگوانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا کیونکہ مجھے چائے محبت کی طرح گرم، بھرپور اور جاندار ہی اچھی لگتی ہے۔ گلشن میں کچھ دیگر خواتین خالی بنچوں پر بیٹھ کر ادھر اُدھر تکنے لگیں۔ اچانک ہم نے جو سامنے چلتے ہوئے ٹی وی کی طرف دیکھا تو ہمارے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ ایک پاکستانی فلموں کے گانے کی ویڈیو گیت مالا چل رہی تھی۔ جسے غالباً اچھل رہی تھی، کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ماشاءاللہ اتنے لچر، بے ہودہ، بدمذاق گانے تھے کہ پاکستانی فلمی صنعت کو آفرین کہنے کو دل چاہنے لگا۔ وہ ایسے ایسے گانے بھی بنا سکتے ہیں؟ سب خواتین شرمندگی سے بغلیں جھانکنے لگیں۔ ہمارے پاک وطن کی بے ڈول ایکٹریسیں ایسے ایسے غضبناک طریقے سے اپنے آپ کو ہلا جلا رہی تھیں کہ اسے دیکھ کر کسی بھی شریف آدمی کا ایمان ڈول سکتا تھا۔ ان کی حد سے متجاوز حرکات و سکنات کا نظارہ کرنا کافی مشکل ثابت ہونے لگا۔ یہ غالباً کوئی سنسر شدہ گانوں کی لڑی تھی جو انڈین کھوکھے والے کو کسی پاکستانی نے جذبہ بھائی چارہ کے تحت تحفتہً دے دی تھی کہ بھیا تم دیکھ لو، ہم لوگ بھی تم سے کوئی خاص پیچھے نہیں رہ گئے۔ بس پہنچنے ہی والے ہیں تمہارے پہلو میں۔ ویڈیو کو ایک بار ہم نظر انداز کر کے سہہ گئے مگر جب چائے کھوکھے والے نے اسے ری وائنڈ کر کے دوبارہ چلانا چاہا تو ہم سے رہا نہ گیا اور صاف کہہ دیا کہ بھائی کوئی اور فلم لگا دو۔ بس کر دو۔ غضب خدا کا، ہمارا پڑوسی ملک سرحد پہ ہی ہمارے پاک وطن کے ایسے ایسے ہوش ربا نظارے دکھا کر ہمیں صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ توبہ، نہ میں پاک آں نہ میں پلیت آں مگر دشمن اس طرح سے ہم پہ وار کرے گا، یہ ہم نہ جانتے تھے۔ بہر حال اب ہمیں اپنے وطن کے بارے میں اس کے ناپاک عزائم کا بخوبی علم ہو چکا تھا، لہٰذا ہم چوکنے ہو گئے کہ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

تمام مسافر آ گئے تو ہم سب نے بسوں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہیں میری ملاقات کراچی کی انقلابی شاعرہ عطیہ داؤد سے ہوئی تو ہم دونوں ایک دوسرے کو ہم سفر پا کے بہت خوش ہوئے کیونکہ ہم دونوں تقریباً ہم عمر، ہم خیال اور ہم مزاج تھیں۔ زیادہ تر ساتھی ہم سے کم عمر تھے، لہٰذا ان سے ظاہر ہے اتنی دوستی نہیں ہو سکتی تھی۔ آنے والے دنوں میں عطیہ داؤد کا اور میرا وقت آپس میں بہت اچھا گزرا۔

بس چلنے سے پہلے میں نے سوچا سامنے سڑک پار لگے پی سی او سے اپنے دہلی کے دوست آتم سہگل کو فون کر کے اطلاع دے دوں کہ میں آپ کی سرزمین میں داخل ہو چکی ہوں اور جس ٹرین میں ممبئی جا رہی ہوں، وہ صبح دہلی سے گزرے گی۔ پی سی او پر پہنچ کر میں ایک طرف کھڑی ہو کر فون کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ ایک سکھ نوجوان کہیں فون پہ بات کر رہا تھا۔ گفتگو کے دوران جب اس نے ایک فقرہ کہا تو مجھے سن کر بڑا مزا آیا۔ کہنے لگا'' آج گھار وچ مرغا پکایا سی تے مرغا اک سو تے وی روپے دا آیا سی۔'' آپ کہیں گے اس میں ایسی کونسی انوکھی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پاکستان میں جب بھی چکن پکتا ہے تو مرغی پکائی جاتی ہے۔ مرغا پکانا شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ مرغی یا ککڑی کا ہی سالن بنتا ہے۔ کبھی اس کے شوہر کے قتل ہو کر ہماری خوراک بننے کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ انڈیا میں مرغی کی جگہ مرغا پکایا جاتا ہے۔ یہ انکشاف مجھ جیسی حقوق نسواں کی حمایتی عورت کے لیے بہت خوش کن تھا۔ اس کا مطلب تھا انڈیا کی مرغیوں کی قسمت ہماری پاکستانی مرغیوں سے زیادہ اچھی تھی یا وہاں برابر کے حقوق کے تحت مرنے کو بھی تختہ دار پر چڑھنا پڑتا تھا۔ اس ضمن میں یاد آیا کہ مجھے یہ بات بھی ہمیشہ کھلتی ہے کہ'' ویر میرا گھوڑی چڑھیا'' گایا جاتا ہے۔ ویر صاحب آخر صرف گھوڑی پر ہی کیوں بیٹھتے ہیں، گھوڑے کو کیوں نہیں تکلیف دیتے۔ شامت صرف مادہ کی ہی کیوں آتی ہے۔ عورت ہو یا مرغی......

دہلی میں آتم صاحب سے بات کر کے تسلی ہوگئی کہ اب انڈیا میں کسی واقف کار سے رابطہ ہو گیا ہے۔ بس دھیرے دھیرے چلنے لگی تو میں نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں۔ لاہور کا کوئی نواحی علاقہ ہی لگتا تھا۔ بالکل یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ ہم کسی دوسرے ملک میں سفر کر رہے ہیں۔ سب کچھ اپنا اپنا سا تھا۔ گھنٹہ بھر کی مسافت کے بعد بس سڑک کنارے ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔ پتہ چلا امرتسر آ گیا ہے۔ ہمارے ساتھ ہمارے انڈین میزبان کوآرڈی نیٹر اشوک صاحب بھی سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں باہر سے ہی امرتسر کی ایک خوبصورت سرخ اینٹوں سے بنی یونیورسٹی دکھائی اور چند منٹ کی بریک کے لیے بس رکوا دی۔

اشوک مجھ سے کہنے لگے، آج صبح جب میں نے اپنے بچوں کو بتایا کہ میں بارڈر پہ ایک پاکستانی گروپ کو ریسیو کرنے جا رہا ہوں تو میرے بیٹے نے مجھ سے کہا'' کیوں؟ یہ تو ہمارے دشمن ہیں۔'' بس اسی قسم کی سوچ کو ہمیں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اشوک کی یہ بات سن کر میں بھی بدمزہ ہوگئی۔ واقعی یہ کیا فضول بات ہے۔ ساتھ ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں اور

کبھی نہ ملیں۔ کس قدر گھٹن زدہ سوچ ہے دونوں طرف کے لوگوں کی۔ اشوک کا اور میرا تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ میں دیکھ کر کچھ حیران سی ہوگئی کہ ہماری بس سے کچھ سکھ اترے اور سڑک کنارے کھڑے ہوکر تصویریں بنانے لگے۔ ''ہائیں یہ پاکستانی لوگوں میں سکھ کہاں سے آ گئے؟'' مجھے بتایا گیا کہ یہ پاکستانی سکھ کمیونٹی کے چند افراد ہیں جو پشاور میں رہتے ہیں اور ہماری طرح ہندیاترا کو جا رہے ہیں۔ دلچسپ بات تھی۔

امرتسر میں بھی ہمارے ہی شہروں کی طرح سڑکوں پہ شاپر بیگ اور کوڑے کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے جن پہ آوارہ گائیں، کتے اور کالے سؤر منہ مار رہے تھے۔ سفید سؤر تو خیر میں نے امریکہ میں دیکھ ہی رکھے تھے۔ (جانوروں کی صورت میں بھی) مگر کالے سؤر دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ اللہ کی شان تھی۔ گورے ملکوں میں سفید سؤر اور سلونی جلدوں والے لوگوں کے دیس میں کالے سؤر۔ بڑا حساب کتاب رکھا ہے اللہ میاں نے۔

بس دوبارہ چل دی اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں کھڑے تھے۔ شام ہو چکی تھی اور سب لوگ کچھ کچھ تھک گئے تھے۔ سکیورٹی وجوہات کی بنا پر ہمیں سختی سے ہدایت دی گئی کہ کوئی بھی شخص ہوٹل کی حدود سے باہر قدم نہ نکالے۔ سب لوگوں نے گروپ لیڈر منیر صاحب کا کہنا مانا مگر سکھ بھائیوں نے ایسی کسی پابندی کی کوئی پرواہ نہ کی اور بڑے آرام سے خراماں خراماں ہوٹل سے باہر چلے گئے۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ ہمیں سکھ ہونے کی وجہ سے جب کوئی غیر انڈین نہیں سمجھے گا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ چلے گئے تو کھانا کھانے کے بعد سبھی لان میں بنے چبوتروں پر بیٹھ کر روانگی کا انتظار کرنے لگے۔ گروپ کے کچھ اور لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے جوڑے پہنے سندھی لوک فنکار اپنے مخصوص لباس اور شکل و صورت کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ کیلاشی، کشمیری، پٹھان، پنجابی سبھی لوگ وہاں موجود تھے۔ پاکستان کے تقریباً تمام علاقوں، تہذیبوں اور متفرق جغرافیائی خطوں سے چنے ہوئے رنگا رنگ پھول اس ایک شام اکٹھے دکھنے میں آ رہے تھے۔ یہ وہی پھول تھے جن سے مل کر پاکستان نام کا گلدستہ بنتا اور مہکتا ہے۔ سب لوگ انڈیا سوشل فورم 2004ء میں شرکت کرنے کو ممبئی جا رہے تھے۔ جہاں دنیا کی سب اقوام اور بالخصوص تھرڈ ورلڈ کے ممالک کو امن اور معاشی خودمختاری کی بات کرنا تھی۔ امن کے راگ چھیڑنا تھے۔ محبتوں کی بات کرنا تھی۔

ٹرین کو رات نو بجے روانہ ہونا تھا اور ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ اس روز اتفاق سے

سکھوں کا کوئی مذہبی تہوار تھا جس کی وجہ سے ہوٹل والوں نے لان میں ایک بڑے سے الاؤ Bonfire کا انتظام کر رکھا تھا۔ سب لوگ الاؤ کے گرد کھڑے ہو گئے۔ پنجاب کی ٹھنڈی شام میں سرخ جاندار الاؤ سے نکلتی زندگی بخش تمازت جسموں کو بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ شعلوں کو آسمان سے باتیں کرتے دیکھا تو ذہن بھی آفاق کی کارگہہ شیشہ گری دیکھنے میں محو ہو گیا۔ ہوٹل کے بیروں نے مونگ پھلی اور مکئی کے پھلوں کی ٹرے لا کر ہمیں تھما دی اور خود بھی ماحول کے سحر میں گرفتار نظر آنے لگے۔ ہم نے مونگ پھلیاں چگ لیں اور پھلے بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیئے۔ پھلے آگ میں گرتے تو پھول بن جاتے اور شعلوں میں سے جگنو بن کر اوپر ہی اوپر کو پرواز کر جاتے۔ بہت دلچسپ نظارہ تھا یہ۔ دوستانہ مسکراہٹوں والی کچھ غیر ملکی خواتین بھی کرسیوں پہ بیٹھی سب کی تصاویر کھینچنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے ساتھی فنکاروں نے اپنے بڑے سے ڈھول پہ تھاپ دی اور سندھی انداز میں گول دائرہ بنا کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ موسیقی نے سب کو اپنے سحر میں قید کر لیا تھا۔ سو ہم بھی اٹھے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص میں شامل ہو گئے۔ دائرہ بڑے سے بڑا ہوتا چلا گیا۔ سب نے امن زندہ باد، انڈیا پاکستان دوستی زندہ باد کے نعرے لگائے اور ڈھول کی تھاپ تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رقص میں سارا جہاں ہمارے ساتھ گھوم رہا ہے۔ خوش ہو رہا ہے۔ ہوٹل کے بیرے معصوم تجسس سے ہماری طرف دیکھ کر شاید سوچ رہے تھے...... ''یہ لوگ ٹھیک ہی ہیں، ایسے برے بھی نہیں۔'' ممبئی ٹرین کا وقت ہو چلا تھا، لہٰذا ہم سب پھر سے بسوں میں سوار ہو کر سٹیشن کو چل دیئے۔

ممبئی جانے والی ٹرین میں ہمیں تقریباً دو دن اور دو راتیں گزارنا تھیں۔ اتنے لمبے عرصے کے لیے ٹرین میں مقید رہنے کے خیال سے دل دہل گیا اور حوصلے پست ہونے لگے۔ اب جو ٹرین میں داخل ہوئے تو اپنے ہاں کی کسی تھرڈ کلاس ٹرین کا سا ماحول دیکھ کر ہم نے بالکل ہی ہتھیار پھینک دیئے اور اپنے خدا کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ تیسری دنیا کی پسماندگی، گندگی اور باتھ روم کی ناگوار بو تھی اور ہم تھے دوستو۔ اشک رواں کی نہر کو ہم نے بہنے سے پہلے ہی آنکھوں سے روک دیا اور سفر کے انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔ سوچا زندگی کے جبر مسلسل کو کاٹنا تو ہے تو ٹھیک ہے جو ہوگا سہہ لیں گے۔

میں نے اور عطیہ داؤد نے اوپر نیچے کی برتھ لے لی اور اپنا اپنا سامان سیٹ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ٹرین چلی تو سردی اتنی بڑھی کہ ہڈیوں میں خون جمنا شروع ہو گیا۔ ہم لوگ اپنے

ساتھ ایک ایک ذاتی کمبل تو لے ہی آئے تھے مگر اس خونخوار سردی میں وہ ناکافی ثابت ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہماری این جی او کے نمائندے ادریس صاحب فرشتۂ رحمت بن کر نمودار ہوئے اور ہم سب کو ایک ایک کمبل اور عطا کر دیا جسے ہم نے صبر شکر کر کے اپنے اوپر لے لیا۔ ''مجھے رات ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ دہلی تک سردی بہت ہو گی۔ اس لیے ہمارے دفتر نے ایک لاکھ روپیہ خرچ کر کے یہ نئے کمبل خرید لیے ہیں تا کہ آپ لوگ راستے میں ٹھٹھریں نہیں۔'' انہوں نے پاس آ کر بتایا تو میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ این جی اوز غریب نہیں ہوتیں ورنہ ہم سب کی تو اس سفر میں قلفیاں جم گئی ہوتیں۔

اس طویل سفر کے دوران مختلف این جی اوز سے تعلق رکھنے کے باوجود سب آپس میں گھل مل گئے اور ٹرین کے دور دراز ڈبوں تک ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کئی پرانے واقف کار مل گئے اور کئی نئی شناسائیاں ہوئیں۔ اس گاڑی میں ہندوستانی مسافر بھی سوار تھے جن کا رویہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زیادہ تر ہندوستانی ہم لوگوں کے پاس سے سنجیدہ نظر آتے گزرتے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پہ اجنبیت کے تاثرات دیکھ کر مجھے افسوس ہونے لگا۔ سوچا یہ لوگ جب پاکستان آتے ہیں تو ہم لوگ ان کے آگے کیسے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ صدقے واری جاتے ہیں، پھول برساتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ناچتے ہیں۔ امن و محبت کے گیت گاتے ہیں مگر یہ تو ہمیں لفٹ ہی نہیں کروا رہے تھے۔ کیا صرف ہمیں ہی ان سے دوستی کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ ایسی یکطرفہ محبت کے تو ہم ہرگز قائل نہیں، لہٰذا ہم دل ہی دل میں برا مان کر بیٹھ رہے۔ حالانکہ انہیں اس کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ ہمارے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہم سے آخر رہا نہ گیا اور ایک دو لوگوں کو پاس سے گزرتے ہوئے روک کر دل شکنی کے جذبات کا اظہار کر دیا۔ ''چلیں آپ ہمارے سواگت کو ڈھول نہ بجائیں۔ گلے میں پھولوں کی مالا نہ پہنائیں۔ مگر یوں نظر انداز کر کے گھور کے بھی نہ گزریں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہماری ایسی باتوں سے برف کچھ پگھل سی گئی اور ہندوستانی مسافر دھیرے دھیرے ہم لوگوں کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ جلد ہی ہم سب ایک دوسرے سے بے تکلفانہ تعارف حاصل کرنے لگے اور گانے گانے کا سیشن شروع ہو گیا۔ اپنا ارادہ بھی یہی تھا کہ ان منجمد لوگوں کو ذرا ہلا کر ہلائیں جلائیں اپنا بنائیں سو ایسا ہو گیا اور سفر بہتر طور پر کٹنے لگا۔ راستے میں اچھا برا جو ملا صبر شکر کر کے کھا لیا مگر سب سے زیادہ تکلیف یہ ہوئی جب چائے مطلب کی نہ ملی۔ شاید انڈیا والوں کو اچھی چائے بنانے یا پینے

کا پتہ ہی نہیں ہے۔ پورے دورے کے دوران میں اچھی چائے کے لیے ترستی رہی، پھکی زیادہ میٹھی اور کم چائے کی پیالی سے مجھ جیسے کٹر خالص چائے نوش کا گزارہ نہیں ہو رہا تھا۔ بس تشنگی رہی اور گاڑی چلتی رہی۔ اچھی چائے ایک خواب بن کے رہ گئی اور میں چائے چائے چائے کا ورد کرتی رہی۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے ٹی ٹی صاحب آئے اور ہم سب کے ٹکٹ چیک کیے۔ تسلی ہو جانے کے بعد وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی کمبل اوڑھ کر ایک سیٹ پہ بیٹھ گئے اور ہم سے بات چیت کرنے لگے۔ ٹی ٹی صاحب کا نام تحسین تھا۔ ان سے میں نے ہند میں مسلمانوں کے حالات پہ کافی دیر تبادلہ خیال کیا۔ ڈبے کے ایک کونے میں دو پولیس والے بمعہ اپنی بندوقوں کے سیٹوں پر براجمان ہماری حرکات وسکنات کو بغور دیکھے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پہ احتیاط اور خبردار کے تاثرات نمایاں نظر آتے تھے۔ مجھے وہ پولیس والے سخت کھٹک رہے تھے۔ کیا ہم لوگوں نے اپنی سیٹوں کے نیچے بم چھپا رکھے تھے جو وہ یوں مستقل ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاید وہ سکیورٹی کی خاطر ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہوں لیکن مجھے اس سے بداعتمادی کی بو آ رہی تھی اور اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آخر ہم ان کے ملک میں دوست بن کر آئے تھے۔ میں نے تحسین صاحب سے گلہ کیا تو وہ میری بات سمجھ گئے اور انہوں نے ان سپاہیوں کو وہاں سے اٹھا کر کہیں اور جا کر بیٹھنے کے لیے کہہ دیا۔ اگلی صبح میں ٹرین میں ذرا سیر کو چل دی۔ بہت ہی لمبی ٹرین تھی جس میں بیٹھے بہت سے پاکستانی دوستوں سے تو سالوں بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ سبھی لوگ بہت اچھے موڈ میں نظر آ رہے تھے۔

ایک ڈبے میں گوادر کے مچھیروں کا ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لوگ اپنے علاقے میں آنے والی نئی نئی تبدیلیوں سے متعلق ایک کھیل تیار کر رہے تھے جو انہوں نے ممبئی کے ''سوشل فورم'' میں پیش کرنا تھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں آج کل پاکستان میں گوادر کے ساحل کی ڈویلپمنٹ کے بہت چرچے ہو رہے ہیں۔ اسے دبئی کی طرز پر بنایا جا رہا ہے تاکہ دوسرے ملکوں کے سیاح آئیں، وہاں آ کر اس کی خوبصورتی کا نظارہ کریں اور ہماری معیشت کو فائدہ پہنچے مگر گوادر کے رہائشی اس سارے منصوبے سے اتنے خاص خوش نہیں ہیں۔

''کیا آپ کو اچھا نہیں لگے گا جب آپ کے علاقے میں پسماندگی دور ہوگی۔ نئی سڑکیں، عمارتیں، سکول، ہسپتال، تفریح کے مقامات بنیں گے؟'' میں نے ایک مچھیرے سے پوچھا۔

''ہمارا کام صرف مچھلیاں پکڑنا ہے۔ صدیوں سے ہمارے آباؤ اجداد یہی کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نئی بندرگاہ بننے سے ہمارے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔ ہمیں مچھلیاں پکڑنے کے لیے لمبا چکر کاٹ کر ایک گھنٹہ بس سواری کے بعد سمندر تک پہنچنا نصیب ہوگا۔ اس سے ہمارا وقت بھی ضائع ہوگا اور ہمیں محنت بھی زیادہ کرنا پڑے گی۔ ہمیں یہ منظور نہیں۔'' ایک مچھیرے نے شکوہ کیا تو میں چپ ہوگئی۔ سچ ہے انسان کسی بھی نئے اور مختلف خیال کو آسانی سے پہلی بار قبول نہیں کر لیتا۔ اسے نئی چیز مشکل اور غلط بھی لگ سکتی ہے۔ مچھیروں کی ایک لگی بندھی روٹین تبدیل ہونے جا رہی ہے، وہ اس لیے پریشان ہیں۔ مگر شاید ان کی آئندہ نسل اپنے علاقے میں معاشی آسودگی، جدید ترین سہولیات کے مزے اٹھانے کے بعد یوں شاکی اور نالاں نہ رہے۔ شاید وہ اس تبدیلی کو اپنے لیے بہتر سمجھ کر اس نئی صورتحال سے مفاہمت کر لیں۔

دہلی کا سٹیشن پتہ نہیں کب آیا، یاد نہیں۔ میں رات گئے تک جاگنے کے بعد نیند کی گولی لے کر بے خبر سوئی ہوئی تھی کہ یکدم کسی نے مجھے ہڑبڑا کر اٹھا دیا۔ صبح کے سات بجے تھے اور میرے دہلی کے دوست آتم سہگل اور ان کا بیٹا میرے سرہانے کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ وہ سویرے سویرے اتنی تکلیف اٹھا کر سینڈوچ لیے سٹیشن پہنچ گئے تھے۔ لمبی ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ سنا ہے وہ ہر ڈبے کے آگے کھڑے ہو کر میرا نام پکار رہے تھے کہ ہمارے گروپ کے ادریس نے سن لیا اور انہیں بے خبر سوتی ایک گٹھڑی کے پاس لا کھڑا کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ان کے وافر مقدار میں لائے گئے سینڈوچز اپنے جیسے مسکین مسافروں میں تقسیم کر دیئے جس کی وجہ سے آتم سہگل کے خاندان کو درازیٔ عمر اور خیر و عافیت کی زندگی کی دعائیں دی گئیں۔ محبت بھرے سینڈوچز کا ذائقہ دیر تک میرے منہ اور دل میں خوشیاں بکھیرتا رہا۔

اب ٹرین پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے گزر رہی تھی اور گرمی محسوس کرتے ہم لوگ ایک ایک کر کے اپنے کمبل اتارتے چلے جا رہے تھے۔ ممبئی پہنچنے تک بے انتہا گرمی محسوس ہونے لگی۔ سب لوگ کئی قسم کے ہوٹلوں میں بکھر گئے۔ عطیہ نے میرا اور اپنا انتظام ''سحر گارڈن'' ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں کروایا تھا۔ جہاں پہنچتے ہی ہم لوگ تھکے ہوئے، مرے ہوئے کتوں کی طرح بستر پر گر گئے اور کئی گھنٹے ہلنے کے قابل نہ ہو سکے۔ ہوٹل کافی درمیانہ قسم کا تھا مگر یہ شکر تھا کہ فلش سسٹم، شاور اور ایئر کنڈیشنر ورکنگ حالت میں تھا ورنہ تو بہت گڑبڑ ہوتی۔

ہماری میزبان این جی او نے یہاں تک تو ہمارا انتظام کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں

نے ہمیں پہچاننے تک سے انکار کر دیا۔ یہ کسی کو نہ بتایا گیا کہ تھا کہ ممبئی میں پہنچنے کے بعد آپ کا کھانا پینا، ٹرانسپورٹ مہیا کرنا، مدد کرنا سب خود آپ کے ہی سر پہ ہوگا۔ ان کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ہم جتنے دن ممبئی میں رہے، ہمارا ان سے واسطہ نہ ہونے کے برابر رہا۔ کسی نے ہمیں نہ پوچھا ''آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں؟ نئے ملک، نئے شہر میں کہیں رُل تو نہیں رہے؟ کہاں جائیں گے؟ کیا کریں گے؟'' ایسی کوئی مدارت نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی بنے پھرتے رہے۔

صبح ہوئی تو سوچا اب ''سوشل فورم'' تو پہنچنا ہی ہے۔ اسی مقصد کے لیے لائے گئے تھے، لہٰذا یہ تو لازمی تھا کہ وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچیں۔ ناشتہ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں چنا ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہم سے پہلے بھی وہاں کافی لوگ پہنچے ہوئے ہیں اور ایک گرما گرم بحث چھڑی ہوئی ہے۔ ٹاپک یہ تھا کہ لوگ زیادہ تھے اور ناشتہ کم۔ دراصل یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانیوں کی نسبت ہندو بھائی کم خوراک ہوتے ہیں۔ ہماری خورد و نوش کی عادات بے کراں کا انہیں کیا پتہ تھا۔ اسی لیے بیرے حیران ہو رہے تھے کہ یہ لوگ ایک بار ناشتہ سرو ہو جانے کے بعد مزید انڈے، پراٹھے اور چائے کیوں مانگے چلے جا رہے ہیں۔ اب کے تو اس بات سے میں حیران نہیں ہوئی لیکن پہلی بار ایک کانفرنس کے دوران جب نیپال میں ڈائننگ ٹیبل کی تہی دامنی کا ایسا مظاہرہ دیکھا تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے سارے لوگوں کے لیے اتنا کم کھانا کیسے رکھا گیا تھا۔ مسلمان قوم دریا دل، بے پرواہ قوم ہے۔ آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ، بس جو بن پڑے کھا گزرتے ہیں۔ کل کی انہیں فکر نہیں ہوتی کیونکہ کل کا تو اللہ مالک ہوتا ہے۔ آج بس اپنا ہوتا ہے۔ بس یہی یہاں بھی ہو رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگوں کو ''ممبئی سوشل فورم 2004ء'' کے لیے گورے گاؤں پہنچنے کی تشویش ہونے لگی۔ نہ کوئی بس نہ سواری۔ نہ وین نہ گھوڑا گاڑی۔ جن کو تو خود لایا گیا تھا انہیں کھانے پینے اور سواری کے لیے مبلغ ہزار ہزار انڈین روپے دیے گئے مگر مجھے اور عطیہ کو کوئی رعایت نہ دی گئی۔ ہم لوگوں سے کہہ دیا گیا کہ آپ لوگ اپنا خرچہ اپنی ذمہ سے جو چاہیں کریں۔ ہم آپ کے لیے یہاں کچھ نہیں کر سکتے۔ اتنی نو لفٹ ملنے کے باوجود میں نے اور عطیہ نے سوچا، اب یہاں آ مرے گئے ہیں تو ''سوشل فورم'' تو ضرور اٹینڈ کریں گے، لہٰذا ہم نے رکشہ لیا اور خود ہی پوچھتے پچھاتے گورے گاؤں کو چل دیے۔ بعد میں سنا کہ ان دنوں ممبئی میں اتنے سارے لوگوں کی آمد کی وجہ سے سارے ہوٹل بک ہو چکے تھے اور رکشہ والے خوب کما رہے تھے

لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ کسی رکشہ والے نے نہ منہ مانگے پیسے مانگے، نہ کسی اور وجہ سے ہمیں تنگ کیا۔ سیدھے سادھے میٹر چلاتے اور منزل پر پہنچا دیتے۔ اتنے نیک رکشہ والے دیکھ کر رشک آ رہا تھا کہ کاش ہمارے ہاں بھی ایسے ہی رکشہ والے پیدا ہو جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ گورے گاؤں یقیناً کسی زمانے میں گوروں کا علاقہ ہوگا مگر اب تو ہر طرف سانولے ہی نظر آ رہے تھے۔ اک بڑا سا میدان یا شاید پارک نما ایریا تھا جس میں دنیا بھر سے لوگ آ کر جمع ہو رہے تھے۔ ہر ملک، قوم، رنگ و نسل کے مرد و زن کا ایک سیلاب تھا جو ہر طرف موجزن تھا۔ پاکستان سے کل چار سو افراد تھے مگر ہندوستان کے ہر علاقے سے عورتیں، مرد اور علاقائی رقص کرنے والی ٹولیاں رونقیں جماتی، موسیقی کے ساتھ حرکت کرتے مسلسل گزرتی نظر آ رہی تھیں۔ ہر طرف ورلڈ سوشل فورم کا سلوگن ''ایک اور دنیا ممکن ہے'' بینرز پر لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دنیا کے چند بڑے ملکوں کو جو گلوبلائزیشن کے ڈھونگ کے ذریعے غریب ملکوں کی صنعتوں کو تباہ کر رہے ہیں، بے نقاب کیا جائے۔ ملٹی نیشنل کی اجارہ داری ختم کی جائے۔ لیبر کا استحصال بند کیا جائے۔ دنیا میں امن و یگانگت کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ تھرڈ ورلڈ جاگے اور اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائے۔ ایجنڈا یہی تھا کہ ان باتوں کا احساس جگایا جائے۔

سوشل فورم میں کئی جگہوں پر سیمینارز اور ورکشاپس، لیکچرز اور تقاریر ہو رہی تھیں۔ لیلیٰ خالد، ونی منڈیلا، مبیش بھٹ، شبانہ اعظمی، اروندتی رائے، شیریں عبادی اور عاصمہ جہانگیر وغیرہ نے اپنے پلیٹ فارموں پر بے باکانہ اظہار رائے کیا اور داد پائی۔

پانچ بڑی معتبر پاکستانی انجمنوں نے اپنی پاکستانیت یوں قائم رکھی کہ باوجود اصرار کے انہوں نے اکٹھے ہو کر نہیں دکھایا اور کوئی مشترکہ جلوس نہیں نکالا جس سے ان کے درمیان ہم آہنگی کا تاثر مل سکتا۔ تفرقہ بازی کا بول بالا رہا اور انائیں سلامت رہیں۔ پاکستانی اکٹھے ہو جائیں تو پھر پاکستانی کیسے کہلائیں۔ دنیا بھر کی این جی اوز نے اپنے اپنے سٹالوں پر معلوماتی پمفلٹ اور لٹریچر رکھا ہوا تھا اور انہیں بینرز سے سجایا ہوا تھا۔ یہیں پر وہ اپنے ملکوں کی بنی ہوئی مصنوعات بھی فروخت کر رہے تھے جنہیں لوگ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ موسم بہت گرم تھا مگر میں نے سردیوں کے حساب سے موٹے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جب پسینے سے بے حال ہو گئی تو سوچا کیوں نہ کوئی پتلا سا کرتا خرید لوں اور یہیں پہن لوں، لہٰذا میں نے ایک انتہائی خوبصورت کڑھائی والا بغیر بازوؤں کا کرتا خریدا اور باتھ روم میں جا کر اپنی موٹی قمیض سے تبدیل کر لیا۔ باہر آ کر

چین سامالا اور میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔

ہر دیس کے موسیقار اور ناچنے والے لوک آرٹسٹ اپنی ٹولی میں سامنے ناچتے آتے تو بہت اچھا لگتا۔ ہمارے ہاں کے کنگن ہار والے سندھی اپنی ٹولی بنائے اپنے مخصوص ساز بجاتے پاس سے گزرے تو میں بھی لیک کران میں شامل ہوگئی۔ کچھ دیر کوان کے ساتھ چلی، گھومی پھر ناچی اور خوش ہوگئی۔ دنیا کے اس بڑے میلے میں راہ چلتے پاکستان سے آئے ہوئے بہت سے لوگ ملتے رہے اور بچھڑتے رہے۔ یوں جیسے سمندر سے ایک موج اٹھے، آکر آپ کو بھگو جائے اور پھر واپس سمندر میں سما جائے۔ کھانے پینے کے لیے تھوڑی ہی دور ایک بڑے سے میدان میں کھلے ریستوران کا ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ یہاں لاتعداد ننھے منے جھونپڑوں سے مہمان خالص ویجی ٹیرین فوڈ لے کر کھا رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہیں اڈلی دوسے، پوری، چھولے اور کہیں اناس کا تازہ جوس۔ خوب ورائٹی تھی اور مزے مزے کے نظارے دیکھنے کو مل رہے تھے۔ غالباً کسی کو بھی گرد، مٹی اور بنچوں پر بیٹھ کر کھانے پر اعتراض نہ تھا، کیونکہ ساری دنیا ہی وہاں بیٹھی بھوجن کر رہی تھی۔ نہ کوئی ناز نہ نخرہ۔ ہر ہم نشیں، خاک نشیں، ہم پیالہ، ہم نوالہ اور خدا کے بنائے ہوئے مختلف رنگوں، نسلوں کے انسان بھی وہیں موجود تھے اور اپنائیت بکھیر رہے تھے۔ صدر بش کی پالیسیوں اور عراق جنگ کے خلاف بہت سے جلوس نکالے گئے اور پتلے جلائے گئے۔ کہیں چائلڈ لیبر قوانین پر بات ہو رہی تھی اور کہیں خواتین کے خلاف امتیازی سلوک پر بحث جاری تھی۔ تبت کے بھکشو اپنے لال چوغوں میں ملبوس جلوس نکال رہے تھے اور ایک طرف مساوی حقوق کے خواہش مند ہیجڑے اور ہم جنس پرست لوگوں میں اپنا لٹریچر بانٹتے پھر رہے تھے۔ سوچنے کی بات ہے جب دنیا کے اتنے سارے لوگ مل جل کر دنیا میں امن کی شمع جلانا چاہتے ہیں تو پھر یہ بات اتنی ناممکن تو نہیں ہونی چاہیے۔ اے کاش خواہش کی ان چڑیوں کی پھڑپھڑاہٹ صرف ہوا میں ہی تحلیل نہ ہوتی رہے بلکہ نیچے آئے، زمین کو چھوئے، خوابوں کو حقیقت میں بدل ڈالے۔ ایسی ہی باتیں سوچتی ہم دونوں سارا دن ہجوم کے درمیان پھرتی رہیں، تماشہ دیکھتی رہیں اور میلہ گھومتی رہیں۔ فورم سے واپسی پر ہم دونوں بے حد تھک گئی تھیں۔ پاؤں دکھ رہے تھے، کمر ٹوٹ رہی تھی، لہٰذا ہوٹل پہنچتے ہی بے حال ہو کر بستر پر گر گئے اور گھنٹوں اٹھ نہ سکے۔

عطیہ داؤد نے جب یہ دیکھا کہ ممبئی میں قیام کے لیے ہمیں اپنے ہی زور بازو پر جینا مرنا، سفر کرنا، کھانا پینا ہوگا تو انہوں نے اگلے ہی دن وہاں سے کوچ کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دہلی

میں ان کے کچھ دوست تھے۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ واپس چلی جائیں اور کھجل خواری سے بچ سکیں۔ اپنا واحد ساتھی جاتے دیکھ کر مجھے بھی کچھ تشویش ہونے لگی کہ اب میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ سو میں نے ممبئی میں مقیم اپنے ایک انڈین افسانہ نگار دوست سورج پرکاش کو فون کر دیا کہ آ کر مجھے مل جائیں۔ وہ میری آمد کے پروگرام سے پہلے ہی واقف تھے، لہٰذا اپنی بیگم کے ساتھ فوراً چلے آئے اور مجھے اپنے گھر لے جانے پہ اصرار کرنے لگے۔

سورج پرکاش سے میری چند برس قبل لندن کے ایک ادبی ایوارڈ ''کتھا سمان'' کے پروگرام میں ملاقات ہوئی تھی جہاں انہوں نے مجھے چیف گیسٹ بنایا تھا جو میرے لیے ایک پاکستانی ادیب ہونے کے ناطے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ سورج کے اور میرے درمیان انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ رہا اور دوستی بڑھتی رہی۔ میں نے سورج اور مدھو سے کہا کہ میں عطیہ کے روانہ ہوتے ہی ان کے ہاں چلی آؤں گی جس پر وہ دونوں خوش ہو گئے۔ مجھے اس سے اچھی جگہ کہاں ملنا تھی۔ اتنے پیارے لوگ مجھے اپنے گھر ٹھہرانا چاہتے تھے تو مجھے بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا۔

اگلی صبح ناشتہ پر پھر اپنے پاکستانی گروپ کے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ آئے ہوئے بیشتر لوگوں نے فورم میں شرکت نہ کر کے اس کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ سندھیانی تحریک کی خواتین اور کنگن ہار کے سندھی فنکاروں کے سوا تقریباً سبھی اس فیصلے میں شامل تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی این جی او کے خلاف احتجاج کریں گے اور ہوٹل میں ہی ٹھہرے رہیں گے۔ ان کے کسی پروگرام میں شامل نہ ہوں گے۔

گلشن کے کمرے میں کالے فراک نما سفید سیپیوں سے سجے کیلاشی جوڑے بکھرے ہوئے تھے جنہیں پہن کر ان کے گروپ نے فورم میں شرکت کرنا تھی مگر اب چونکہ حالات بدل گئے تھے، لہٰذا وہ جوڑے جوں کے توں پڑے رہ گئے۔ کیلاشی کپڑے پہن کر رقص کرتے یہ خوبصورت لوگ کتنے پیارے لگتے۔ میں نے سوچا مگر افسوس کہ ایسا ہو نہ سکا۔ گلشن اپنے گروپ کی مناسب پذیرائی نہ ہونے پہ بہت خفا اور این جی او والوں کے رویے پہ لال پیلی ہو رہی تھی۔ انہی کے گروپ کی طرح کشمیری گروپ، سکھ، پٹھان اور کئی دیگر بھی ناراض ہوئے بیٹھے تھے اور گھومنے پھرنے کے اپنے اپنے ذاتی پروگرام بنا رہے تھے۔ سب کچھ بڑا عجیب سا ہو گیا تھا۔ ہر شخص بددل تھا۔ مجھے ایک کیلاشی لڑکی کی بات بڑی پیاری لگی۔ اسے اردو تک بولنا نہ آتی تھی مگر اب جو اپنے دیس سے نکل کر اتنی دور آ گئی تھی تو بہت حیران ہو رہی تھی۔ اس کے شوہر نے بتایا کہ میری بیوی کہہ

رہی ہے، زندگی تو یہ ہے۔ اونچی بلڈنگیں، بارونق سڑکیں اور روشنیاں، ہمارے پہاڑوں میں کیا رکھا ہے؟اس کے بھولپن پہ میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ اکثر گیلری میں کھڑی ممبئی کی سڑکوں کو گھورتی نظر آتی۔ شاید وہ ہر وقت یہی سوچے جاتی تھی۔ عطیہ کہنے لگی'' مجھے دہلی کے لیے ٹرین کی سیٹ بک کروانا ہے۔ ساتھ چلتی ہو؟'' مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا، میں تو آئی ہی ممبئی نوردی کے لیے تھی، لہٰذا ساتھ ہو لی اور ہم دونوں رکشے میں سوار ہو کر ممبئی ریلوے ہیڈکوارٹر ممبئی سنٹرل جا پہنچے۔ کافی دیر عطیہ لائن میں کھڑی رہیں، آخرکار باری آ ہی گئی۔ انہوں نے انڈیا کی ڈی لکس لگژری ٹرین راجدھانی ایکسپریس میں بکنگ کروائی اور پھر مجھے ایک قیمتی مشورہ دیا کہ کیوں نہ میں بھی اسی روز اپنے لیے سیٹ لے لوں، بعد میں مجھ سے اکیلی کہاں آیا جائے گا۔ مجھے خود تو عقل نہ آئی تھی مگر میں نے ان کی بات سمجھ کر کہنا مان لیا اور تین دن بعد کی راجدھانی ایکسپریس میں اپنے لیے جگہ رکھوالی۔ یہ ٹرین مہنگی مگر بے حد آرام تھی، لہٰذا پیسے خرچتے ہوئے مجھے کوئی خاص تکلیف محسوس نہ ہوئی۔

سیٹ بک کروانے کے بعد ہم لوگ عطیہ کی ایک دوست نینسی کے گھر جانے کی سوچنے لگے۔ رکشے والے سے پوچھا تو اس نے جواب دیا'' دو سو روپے لگیں گے۔'' یہ تو بہت زیادہ ہے، کیوں نہ ہم بچت کریں اور لوکل ٹرین میں چلیں۔ عطیہ نے تجویز پیش کی تو میں رضامند ہوگئی۔ جب سے فلم'' ساتھیا'' میں ممبئی کی لوکل ٹرینوں کے سین دیکھے تھے، مجھے بھی ان میں سفر کرنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ ہم دونوں نے دس دس روپے کے دو ٹکٹ لیے اور پلیٹ فارم پہ کھڑے ہو کر ٹرین کا انتظار کرنے لگیں۔ امریکہ کی سب وے ٹرین کی طرح پلک جھپکنے میں ممبئی کی لوکل ٹرین بھی آ گئی۔ ہم لپک کر اپنے سامنے آ جانے والے ڈبے میں سوار ہو گئے اور سیٹ پر بیٹھ کر آرام سے گاڑی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سانولی سلونی خواتین جو زیادہ تر ورکنگ ویمن تھیں، تیز شوخ رنگوں کی ساڑھیاں زیب تن کیے سیٹوں پر ٹھنس کے بیٹھی ہوئی تھیں۔ رش کافی تھا، منزل ابھی کافی دور تھی اس لیے میں نے حسب عادت ریلیکس ہو کر اپنے جوتے جرابیں اتار دیے اور پینڈوانہ انداز میں گھٹنے اوپر کر کے آرام سے بیٹھ گئی۔ لوگ اتر رہے تھے، چڑھ رہے تھے اور عطیہ مزے سے نظارہ لے رہی تھی۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ شلوار قمیض میں ملبوس ایک جوان سی خاتون ٹکٹ کلکٹر نے آ کر سب کے ٹکٹ چیک کرنے شروع کر دیئے۔ ہماری باری آئی تو ہم نے بھی سادگی سے اپنے

ٹکٹ آگے بڑھا دیے۔ اس نے ایک لمحے کو ہماری طرف دیکھا پھر ٹکٹوں کو اور پھر دوبارہ ہمیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ یکا یک وہ درشت لہجے میں بولی۔ ''آپ لوگوں نے ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے لیے ہوئے ہیں اور بیٹھی فرسٹ کلاس میں ہیں۔''

''یہ فرسٹ کلاس ہے؟'' میں نے ہمیشہ کی طرح ہونق ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ڈبے کو دیکھا، ظالم کسی طرح سے بھی فرسٹ کلاس نہیں دکھتا تھا۔ ایمان کی بات ہے سیکنڈ تو کیا تھرڈ کلاس کہلانے کا بھی اہل نہیں ہو سکتا تھا۔ ''یہ فرسٹ کلاس ہے؟'' میں نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی ہماری ہمسفر ممبئی کی بیبیوں نے ٹی ٹی بی بی کا ساتھ دیتے ہوئے بولنا شروع کر دیا'' آپ کو نظر آ رہا! وہ دیکھیں لکھا ہوا فرسٹ کلاس۔ دیکھ کر چڑھنا چاہیے تھا آپ کو۔'' چاروں طرف سے لعن طعن سنائی دینے لگی۔

ہم نے دوبارہ غور سے دیکھا۔ وہ سچی تھیں، واقعی دروازے کے اوپر ''فرسٹ کلاس'' لکھا ہوا تھا مگر ہمیں کہاں پتہ چلتا تھا۔ میری تو نظر ہی کمزور تھی، کون بار بار عینک لگا کر ہر چیز پڑھتا، لہٰذا میں تو عطیہ بی بی کا دم چھلا بنے ہوئے ان کے ہی پیچھے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ میں نے ٹکٹ کو تکا تک نہیں تھا کہ کس درجے کا ہے۔ بہر حال اب تو مصیبت میں پھنس چکی تھیں۔ عطیہ سمجھداری سے بولیں ''دیکھیے ہمیں پتہ نہیں تھا کیونکہ ہم لوگ فارنر ہیں۔'' ''جو بھی ہیں، فائن لگے گا۔'' ٹی ٹی بی بی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''فائن؟'' ہماری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ نہ جانے پردیس میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ ہم نے بہت احتجاج کیا کہ یہ سب لاعلمی میں ہوا ہے مگر سنگدل لڑکی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کا دل کسی صورت نہ پسیجا۔ فوراً بولی۔ ''ابھی اسی وقت گاڑی سے اتر جائیں۔ سٹاپ آ رہا ہے۔ ہم کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ شش و پنج میں گرفتار ہم دونوں نے پھر اس سے مودبانہ درخواست کی کہ کچھ خیال کرے، ہم غیر ملکی ہیں۔ ابھی ہماری بات پوری طرح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ٹرین پھر چل دی اور ٹی ٹی بی بی مزید بگڑنے لگی۔ ''اگر آپ لوگ نیچے نہ اتریں تو ایک ایک سٹاپ گزرنے پہ فائن بڑھتی جاؤں گی۔'' ہائے اللہ یہ کیسا ستم ہونے جا رہا ہے۔ اب چلتی گاڑی میں سے تو چھلانگ لگانا ممکن نہ تھا۔ جیسے ہی اگلا سٹاپ آیا، میں نے اپنے جوتے جرابیں سنبھالیں اور اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم پہ کود گئی۔ اتنی ذلت! اس بی بی کو کیا بتاتے کبھی ہم دونوں پاکستان کی معزز شہری ہیں اور جرائم کی دنیا سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بس ہم دونوں بے بسی سے تلملا کر رہ گئیں۔ ہمارے ساتھ ہی ظالم لڑکی بھی نیچے اتر آئی اور

چالان فارم بھرنے لگی۔

''آپ لوگ پاکستان سے ہیں؟'' یکایک اس کے لہجے میں نرمی پیدا ہوگئی۔ ''جی ہاں۔'' میں نے روٹھ کر منہ پھلالیا جیسے اس کو بڑی پرواہ تھی۔ بڑی آئی فائن کرنے والی۔ ''پاکستان کے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میرے پھوپھا پاکستانی ہیں اور بہت اچھے ہیں۔'' بھتیجی نے اظہار رائے کیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ''دیکھیے، ہم نے آپ کو بتایا کہ ہم فارنر ہیں۔ ہمیں ٹرین کی کلاس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔'' عطیہ نے پھر بات دہرائی۔

''ہم بھلا جان بوجھ کر غلط کلاس میں کیوں چڑھتے؟'' میں نے جل کر کہا۔

''سوسو روپیہ فائن دے دیں۔'' اس نے فارم پھاڑ کر ہمیں تھمادیے۔ بڑی بے رحم تھی، اس نے ہماری ایک نہ سنی۔

''ویسے آپ اگر پاکستان میں ہوں تو وہاں آپ کے ساتھ کوئی ایسا نہیں کرے گا۔ ہم آپ کے مہمان تھے، آپ ذرا خیال ہی کرلیتیں۔''

''دیکھیے یہ میری مجبوری ہے۔ مجھے اپنا روز کا کوٹہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ فائن تو لگانا ہی پڑتا ہے۔'' اس نے ہم سے پیسے لیے، رسید دی اور ہمیں حیران و پریشان چھوڑ کر آگے چل دی۔ شاید وہ اپنی جگہ سچی تھی۔ شاید ملک میں رشوت ستانی کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ایسے سخت رویے ضروری ہوتے ہیں۔ اگر وہ ہم سے رشوت لینے کے بعد ہمیں چھوڑ دیتی یا مسافروں کو قانون کی خلاف ورزی کرتے دیکھ کر گزر جاتی تو ٹھیک نہ ہوتا کہ اس سے حکومتی ادارے کمزور ہوتے ہیں اور نظام کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہندوستان میں چند روز گزار لینے کے بعد مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ ہماری نسبت وہاں قانون کی پاسداری زیادہ کی جاتی ہے۔ اصولوں کو آسانی سے توڑا نہیں جاتا۔ کچھ بھی ہو بہر حال یہ واقعہ ہمیں بدمزہ کر گیا اور ہم جھنجھلا کر رہ گئے۔

ایک ہانپتی کانپتی شاعرہ اور منہ بسورتی افسانہ نگار، ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ رکشے میں جا سوار ہوئیں۔ جس نے ہم سے بھاڑے میں وہی دو سو روپے لے لیے جنہیں بچانے کے لیے ہم اس اللہ ماری ٹرین میں جو سوار ہوئی تھیں۔ قسمت میں یہ زیاں بھی لکھا تھا، سو ہوگیا اور ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔ رکشے والا بہت نیک تھا اس نے پوچھتے پچھاتے دو اجنبی مسافروں کو ان کی منزل پہ صحیح سلامت بخیریت پہنچا دیا تھا۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں فینی کے فلیٹ کے دروازے پہ کھڑے ان کی بیل بجا رہے تھے۔

مجھے فینی سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا تھا کیونکہ عطیہ داؤد کی سہیلی ہونے کے علاوہ وہ ممبئی کے ایک مشہور فلمی جوڑے کی قریبی رشتہ دار بھی تھیں۔ ان کی بھابھی ہندوستانی سکرین کی بہت پر وقار مستند اداکارہ کے نام سے جانی جاتی ہیں اور بھائی فلموں کے گیت لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہندو پاک میں ان دونوں کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم بڑے خوش تھے کہ اتنی خاص اور معتبر حیثیت کے حامل فلمی جوڑے کے گھر جانے کا موقع مل رہا ہے۔
فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہی فینی نے دلآویز مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا اور ہم اندر چلے گئے۔
فینی کے شوہر اشوک ہندو تھے، لہٰذا گھر میں رکھی چیزیں ملے جلے ہندو مسلم کلچر کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ فینی کے اکلوتے بیٹے اور ساس نے بھی پرتپاک انداز میں ہمارا استقبال کیا اور اندر آ کر بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ فینی کی ساس کی شفقت بھری شخصیت سے محبت کی پھوار بلاامتیاز بہو، پوتے اور ہم آنے والے مہمانوں پہ مسلسل گر رہی تھی اور سارا گھر شانتی سے بھرا لگ رہا تھا۔
چاندی کے زیور پہنے، سادہ سے سوتی پرنٹ کی چنری میں ملبوس فینی کی ہنس مکھ طبیعت نے چند ہی لمحوں میں ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا اور ہم ہنسی مذاق کرنے لگیں۔
''آج بڑے بھیا کی سالگرہ ہے۔ میں تھوڑی ہی دیر میں ان کو مبارکباد دینے ان کے گھر جانا چاہ رہی تھی۔ آپ لوگ چلیں گے؟'' فینی بولیں ''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' آخر اپنی محبوب فنکارہ کے گھر جانے کا موقع مل رہا تھا۔ انکار کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ یوں تو ان مہان اداکارہ کو پاکستان میں ایک محفل میں دیکھ رکھا تھا مگر قریب سے بیٹھ کر بات چیت کا شرف تو حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ گولڈن چانس تھا کہ ان کی نند ہمیں ان کے گھر لے کر جا رہی تھیں۔ ہم بھلا کیوں انکار کرتے، لہٰذا خوش ہو کر فینی کے ہمراہ ہو لیے۔ اپنی آئیڈیل اداکارہ اور ان کے شاعر شوہر سے ملنے کے خیال سے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ میں نے سوچا، اچھا ہے۔ شاعر جی کو اپنی نئی کتاب ''ستمگر ستمبر'' بھی دے دوں گی۔ ویسے بھی سنا تھا افتخار نسیم نے ان سے میرا تھوڑا بہت تعارف تو پہلے ہی کروا رکھا تھا۔ اس لیے مکمل اجنبیت تو نہیں ہوگی۔ انہی خیالات میں گم ہم فینی کے میاں اشوک کی گاڑی میں جا بیٹھے اور انہوں نے ہمیں منزل سے کچھ پرے اتار کر اپنی راہ لی۔
ہم تینوں کو کچھ راستہ پیدل طے کرنا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مشہور فلمی جوڑے کی بلڈنگ کے آس پاس کا علاقہ کافی خستہ حالت میں تھا۔ آزادانہ گھومتی گائیں اور کتے، دیواروں پہ اوپلے اور ٹوٹی پھوٹی سڑک دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے اہم لوگ اس راستے سے گزر کر جاتے ہوں

گے۔ یوں ہم نے دیکھ ہی لیا کہ سارا ممبئی غربت کی تصویر تھا۔ گندگی کے ڈھیر، جھونپڑیوں کے لاتعداد سلسلے، بے انداز مچھر، دکانوں، ریستورانوں کے آگے بہتے ہوئے گندے پانی کے کالے کالے نالے اور بدبو۔ برسوں سے فلم انڈسٹری کے سبھی لوگ اس انتشار میں رہائش پذیر ہیں جس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سارے لوگ بڑے صابر و قانع قسم کے لوگ ہیں ورنہ ہمارے پاکستانی لوگوں میں تو ذرا کسی کے پاس چار پیسے آ جائیں تو ان کی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ ہند کے لوگوں کی طرز زندگی میں شو یا افراط زر کی نمائش ہرگز نہیں اور یہ بڑی قابل قدر بات ہے۔

یہ ساحل کے کنارے بنی ہوئی عمارات کا علاقہ تھا جن کی بالکنیوں کو بہتے پانی کا نظارہ ہر وقت نصیب رہتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ علاقہ یقیناً بہت مہنگا اور خوبصورت سمجھا جاتا ہوگا۔ لفٹ میں سوار ہونے سے پہلے دربان نے پوچھا کہ ہم نے کہاں جانا ہے؟ فینی سے بات کر کے تسلی ہو جانے کے بعد اس نے ہمیں اوپر جانے کا اذن دیا اور ہم روانہ ہو گئے۔ فینی نے بیل بجائی تو کسی نے دروازہ کھول دیا۔ میرا دل یکدم دھک سے رہ گیا۔ آخر میں اپنی محبوب فلمی اداکارہ کے گھر میں قدم رکھنے جا رہی تھی۔ میں نے ان کی کبھی کوئی فلم نہ چھوڑی تھی۔ ان کی شخصیت میرے لیے محترم تھی کیونکہ باشعور، وسیع النظر خاتون تھیں۔ عورتوں کے حقوق کے لیے انہوں نے ہمیشہ ہی آواز اٹھائی تھی۔ عوام کے لیے ان کے دل میں بہت درد تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نظر ان پر پڑی، گلابی شلوار کرتے میں ملبوس وہ کتنی باوقار لگ رہی تھیں۔ تنی ہوئی گردن، سنجیدہ آنکھوں اور سپاٹ چہرے سے انہوں نے ہمارا استقبال کیا۔ سب نے ایک دوسرے کو ہیلو ہیلو کہا اور ہم لاؤنج میں بچھے صوفوں پہ بیٹھ گئے۔ ''میں جادو کو ہیپی برتھ ڈے وش کرنے آئی ہوں۔ کہاں ہیں وہ؟'' فینی نے بھابھی سے پوچھا ''وہ تو نہیں ہیں۔'' بھابھی نے مختصراً جواب دیا اور اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ میں نے لاؤنج کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ ایک کھلا سا فلیٹ تھا۔ جس کی بالکنی سے سمندر نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اچانک مجھے افتخار نسیم کا شکاگو والا گھر یاد آ گیا جس کی بالکنی کے نیچے ایک خوبصورت جھیل لیٹی رہتی تھی اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر دھیرے دھیرے مسکراتی تھی۔

کمرے کی دیواروں پہ اداکارہ کے شاعر باپ کی شاعری کے نمونے فریم ہوئے سجے تھے اور جدید آرٹ کے نمونے سے ماحول دلچسپ اور رنگ دار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر میں میری محبوب فنکارہ اندر کے کسی کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جاتی دکھائی دیں۔

''یہ دونوں میری دوست ہیں۔ پاکستان سے آئی ہیں اور بھیا کو ملنا چاہتی ہیں۔'' نینسی نے بھابھی سے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔ آیئے آپ لوگ لنچ کھا لیجیے، کھچڑا پکا ہے۔'' بھابھی نے سادگی سے جواب دیا اور پھر اپنے ملازم رام لعل کو کچھ ہدایات دینے لگیں۔ ''نہیں نہیں شکریہ.... تو تھینکس۔'' فینی نے تکلف سے جواب دیا تو ہم بھی چپکے بیٹھے رہے۔ حالانکہ دوپہر کے دو بجے رہے تھے اور آنتیں قل ہو اللہ بھی پڑھ رہی تھیں مگر کیا کرتے..... اتنے بے تکلف نہ تھے کہ میزبانوں کی ہلکی سی دعوت پہ اچھل کر ڈائننگ روم تک چلے جاتے، لہٰذا صبر کیے بیٹھے رہے۔ گرمی بے انتہا تھی اور مجھے پیاس لگ رہی تھی۔

''کیا مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟'' میں نے ان سے انگریزی میں پوچھا کیونکہ سبھی وہاں انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ رام لعل نے مجھے پانی لا کر دیا تو میں نے پی کر رب کا شکر ادا کیا۔ سارا گھر ہیپی برتھ ڈے کی ڈیکوریشنز سے سجا ہوا تھا اور کمرہ پھولوں کے گلدستوں کے انبار سے مہک رہا تھا۔ یکدم فینی بولی ''اُف میں بھیا کے لیے پھول لانا بھول ہی گئی۔'' تھوڑی تھوڑی دیر بعد جب وہ یہی کہے گئے تو میں نے کہا ''آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ دیکھیے تو سہی یہاں پہلے ہی کتنے پھول موجود ہیں۔ آپ نہیں لائیں تو کیا ہوا؟'' یہ سن کر وہ خاموش ہو گئیں اور ہم سب مل کر بھیا کی راہ تکنے لگے۔ ڈائننگ روم سے ہنسنے بولنے کی آوازیں سن کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر لنچ چل رہا ہے۔ پانی پینے کے بعد میرا کام باتھ روم جانا ہوتا ہے، لہٰذا میں نے فینی سے پوچھا ''ان کا باتھ روم کس طرف ہے؟'' فینی نے ہراساں ہو کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے گل بکاؤلی والے باغ کا پتہ پوچھ لیا ہو۔ ''مجھے تو پتہ نہیں ان کا باتھ روم کہاں ہے۔'' فینی نے جواب دیا۔ ''آپ کو پتہ نہیں کہ ان کا باتھ روم کہاں ہے؟'' میں نے بے یقینی کے عالم میں فینی کا جملہ دہرایا۔ فینی سوچ رہی ہوگی کہ کس مصیبت کو ساتھ لے آئی ہوں۔ آرام سے بیٹھ ہی نہیں رہی۔ شبانہ جی پھر ہمارے پاس سے گزر کر کچن میں جانے لگیں تو میں نے کہا ''ایکسکیوزمی میں آپ کا باتھ روم یوز کرنا چاہتی ہوں۔'' میری اس گستاخ تمنا پر وہ تحمل سے بولیں ''شیور شیور، اس طرف ہے۔'' اور پھر ڈائننگ روم میں چلی گئیں۔

ہائے اللہ اتنی بڑی فنکارہ کے گھر میں باتھ روم جا رہی ہوں۔ میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ کیا پتہ شاہ ایران کے باتھ روم کی طرح وہاں بھی سونے کے نلکے لگے ہوں، لوٹا

چاندی کا ہو، صابن کی جگہ گلاب کی پتیاں ہوں، خدا جانے۔ اندر پہنچ کر دیکھا تو سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ارے یہ کیا؟ یہ تو بالکل نارمل سا باتھ روم تھا۔ ہمارے ہاں باتھ روم جیسا۔ گرے اور سفید ٹائل لگے تھے اور بعینہٖ فلش سسٹم بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے اس کی سائیڈ ٹونٹی کھولی، اسے استعمال کے قابل بنایا اور ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کر کے باہر آ گئی۔ ہم تینوں باہر بیٹھے خلاؤں کو تکتے تکتے بور ہونے لگے تھے۔ گھر کی مالک پھر پاس سے گزریں تو ہمیں دیکھتے ہوئے بولیں "دیکھیے میں کسی کو مجبور نہیں کرتی لیکن آپ لوگ کھا لیجیے، کھچڑا پکا ہے۔" "نو تھینکس۔" فینی پھر اسی طرح تکلف سے بولی اور ہم خاموش بیٹھی رہیں۔ جی میں آیا کہ دیکھیں تو سہی یہ کھچڑا ہے کیا بلا؟ کھچڑی کا شوہر ہے یا حلیم کا دوسرا نام؟ لیکن جب بھابھی جان اپنی نند کو ہی بازو پکڑ کے پیار سے اندر کھینچ کر نہیں لے جا رہی تھیں تو ہم وہاں کھانے کی میز تک کیسے پہنچ سکتے تھے؟

ہم لوگ چپ ہو کر ایک دوسرے کو کبھی گھر کو دیکھتے تھے کہ فینی بولیں۔ "بھیا کی پہلی بیوی مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ بہت دوستی تھی ہماری۔ بھیا بھی اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں چھوٹے بہن بھائی کا۔" ہم نے سن کر سر ہلا دیا۔ یکدم بیل بجی اور ہم سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ رام لعل نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ہم بھیا سے ملنے کو بے تاب تھے مگر یہ کیا؟ دروازے میں سے سانولے، بھاری جسم والے مدبر سے بھیا کی جگہ ایک خوبصورت، دراز قد، سنہری بالوں والا ہیرو اندر آ رہا تھا۔ "ہائے اللہ انیل کپور!" میں نے دل ہی دل میں ایک چیخ ماری۔ آدھی صدی عمر والی ہونے کے باوجود میرے اندر کی سولہ سالہ چلبلی لڑکی کے دل میں پٹاخے سے چھوٹنے لگے۔ آخر ممبئی آئی ہوئی تھی۔ فلمی دنیا کا کوئی بھی ستارہ نہ ملتا تو یہ ٹرپ بیکار رہتا۔ شکر ہے کہ کسی کو تو میں نے بھی دیکھ ہی لیا تھا۔ "ہیلو ہیلو" انیل کپور اپنی خوبصورت مسکراہٹ بکھیرتا ہمارے قریب آیا اور پھر مسکراتا ہوا اندر ڈرائنگ روم میں غائب ہو گیا۔ جہاں بڑے زور و شور سے کھچڑا کھایا جا رہا تھا۔ مجھے اس وقت شدت سے اپنے بچے یاد آ گئے۔ وہ ہوتے تو انیل کپور کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔ چلو ان کے حصے کا میں اُسے دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی کافی تھا۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ مزید صم بکم بنے بیٹھے رہے کہ اچانک بیل بجی اور گھر والے یعنی بڑے شاعر صاحب بنفس نفیس اندر تشریف لاتے نظر آئے۔ نیلے کرتے، سفید پاجامہ میں ملبوس وہ بالکل اسی طرح لگ رہے تھے جیسے ٹی وی پہ دکھائی دیتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پل بھر کو تو یوں لگا جیسے انہوں نے اپنی بہن فینی کو پہچانا ہی نہیں اور پھر

پہچان بھی لیا تو خوشی سے اچھل کر چیخ نہیں ماری۔ نہ یہ فلمی جملہ بولا ''فینی تم، یہاں اور اس وقت؟ کتنی خوشی ہو رہی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر۔'' وہی خشک سے انگریزی ہیلو ہیلو کے گیند اس طرف سے اس طرف پھینکے گئے اور ہم سب دوبارہ صوفے پہ بیٹھ گئے۔

فینی نے ہم دو پردیسیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ پاکستانی لکھنے والیاں آپ سے ملنے آئی ہیں۔ عطیہ نے انہیں یاد دلایا کہ وہ ان سے ماضی میں ایک بار پہلے بھی دہلی میں تفصیلی ملاقات کر چکی ہیں۔ میں نے اوچھی شوبدی بن کر بتایا کہ میں نیلم ہوں، افتخار نسیم کی دوست۔ بشریٰ انصاری کی بہن.... شاید آپ میری تحریریں پڑھ چکے ہیں (افتخار نے تو یہی بتایا تھا) شاعر جی کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہ ہوا۔ آنکھوں میں پہچان اور خوش آمدید کی کوئی شمع نظر نہ آئی۔ شاید ان کا دھیان کسی اور طرف تھا۔ میں آپ کو سالگرہ کی مبارکباد دینے آئی ہوں۔ ہپی برتھ ڈے..... فینی نے پر جوش انداز میں کہا تو بھیا نے جواباً ہوں ہاں کر دی اور کچھ نہ کہا۔

''آپ بھیا کو اپنی کتاب دے دیں نا جو آپ ان کے لیے لائی ہیں۔'' فینی اشتیاق سے بولی۔ ''کتاب؟ وہ تو میں ہوٹل میں بھول آئی ہوں۔'' میں صاف جھوٹ بول گئی۔ حالانکہ کتاب میرے بیگ میں ہی تھی مگر نہ جانے کیوں بس انہیں دینے کو دل ہی نہیں چاہا۔ سوچا کہیں کتاب کی بھی ویسی پذیرائی نہ ہوئی جیسی ہماری ہوئی ہے۔ کہیں ماچس نہ ملنے کی صورت میں رام لعل اسے چولہا سلگانے کا کام ہی نہ لے لے۔ بس اپنی کتاب وہاں لاوارث چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ شاعر بھیا اگلے ہی لمحے اندر کھانا کھانے چلے گئے اور ہم لوگ وہیں کے وہیں بیٹھے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں اور کسی نے ہمیں ہاتھ لگا کر نہ دیکھا ہو کہ زندہ بھی ہیں یا مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

اس مشہور فلمی جوڑے کے سرد رویئے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں اس طرح کے ناگہانی مہمانوں کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ ایک لحاظ سے وہ سچے بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں بلایا تھوڑا ہی تھا؟ ہم ہی بن بلائے وہاں آن ٹپکے تھے۔ ان کے ہاں برتھ ڈے کا لنچ چل رہا تھا اور اداکارہ کا خاندان اکٹھا ہو رہا تھا۔ ان کے ہاں بھائی بھابھی، شاعر شوہر کی بہو اور پوتی کبھی بیٹھے گپھڑا اڑا رہے تھے اور ہم باہر بیٹھے ان کی آوازیں اور قہقہے سن رہے تھے۔ کھانے کے بعد کچھ لوگ اٹھ کر لاؤنج میں آنے لگے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے احساس ہوا کہ اندر صرف انیل کپور یا ایک آدھ شخص اور رہ گیا ہے۔ باقی سب گھر میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ میں نے سوچ

رکھا تھا کہ اداکارہ اور ان کے شاعر شوہر کے ساتھ اپنی تصویر کھنچواؤں گی مگر اب ارادہ بدل گیا تھا۔ پھر بھی کیمرہ ہاتھ میں لیے انجی اور اندر چلی گئی جہاں انیل کپور بیٹھے تھے۔ سوچا انہی کے ساتھ تصویر کھنچوالوں ورنہ بچوں کو کیا منہ دکھاؤں گی کہ ممبئی گئی اور کسی فلمی ایکٹر سے نہ ملی۔ وہ تو مجھے عاق کر دیں گے کہ آپ خالی اپنے جیسے ادیبوں کو ہی مل ملا کر آ گئی ہیں۔ ہمارے بارے میں آپ نے کچھ نہ سوچا، لہٰذا انجی اور انیل کپور کو بتایا کہ میں لاہور سے آئی ہوں۔ آپ پلیز میرے ساتھ ایک تصویر کھنچوالیں۔ میرے بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔ انیل کپور سن کر مسکرائے اور کھڑے ہو کر میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اداکارہ کے فوٹوگرافر بھائی نے بڑی خوشدلی سے تصویر کھینچنے کی حامی بھر لی اور میرے کیمرے میں ہماری ایک تصویر اتار دی جس پر میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ فلمی کے بھائی اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ بیچاری بھنیا بھیا سے اتنی مختصر ملاقات کے بعد جانا نہیں چاہتی تھی، اس لیے ہم انتظار کرتے ہی رہے اور وقت گزرتا چلا گیا۔ نینسی اپنی پرانی بھابھی کے گن گاتی رہی اور اس کی وجہ بھی ہماری سمجھ میں آتی رہی۔

یہ بھی ایک انڈین ہندو مسلم فیملی والا گھر تھا جہاں دونوں مذاہب کے مابین شادی والے جوڑے موجود تھے۔ اداکارہ کے بھائی مسلم اور بیوی ہندو تھیں۔ اسی طرح ان کے شوہر کی بہو بھی کچھ مکس مذہب و کلچر کی دکھ رہی تھیں۔ ہندوستان کے کلچر میں ایسی شادیاں آسانی سے قبول کر لی جاتی ہیں۔ کسی کا بھی مذہب خطرے میں نہیں پڑتا۔ نہ یہ کسی کے لیے اتنا بڑا ایشو ہوتا ہے۔ اتنی عمر گزار لینے کے بعد اب میرا یہ خیال تقویت حاصل کرتا ہے کہ دنیاوی طور پر یہ کامیاب افراد کچھ اپنے سے کم درجے کے لوگوں سے ملنے ملانے میں بھی دلچسپی چھوڑ دیتے ہیں، چاہے وہ ان کے خون کے رشتے ہی کیوں نہ ہوں۔ تعلقات بھی طبقاتی نظام کے زیر اثر آ کر بنتے بگڑتے ہیں۔ مذہب اور محبت زمان و مکان کے قیدی ہو جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ طاقت اکنامکس اور کلچر ہی کو حاصل ہے اور یہی حقیقت ہے۔ ہندوستان کا اب بھی یہی کلچر ہے لہٰذا وہاں یہ آسانی سے قبول کر لیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ مذاہب بھی مکس نہیں، لہٰذا مکس شادیاں وہاں نظر نہیں آتیں جس کی وجہ سے ہمارے کلچر میں دو مذاہب کے مابین شادی کو آسانی سے نگلا نہیں جاتا۔ ایک ملک میں رہتے ہوئے اس کے سماج میں یک رنگا ہو کر سما جانے کی خواہش غالباً اتنی طاقتور ہو جاتی ہے کہ مذہبی ترجیحات پس پشت چلی جاتی ہیں اور وہی ہوتا ہے جو اس دیس میں مدغم ہونے کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

خواہش کے باوجود شاعر صاحب سے ہماری ادب کے حوالے سے یا دونوں ملکوں کی صورتحال کے بارے میں کوئی بھی بات نہ ہو سکی۔ ویسے سنا بھی یہی ہے کہ انہیں سرحد پار لوگوں کے ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اور ان کی بیگم اداکارہ اکثر پاکستان کے خلاف بات کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں جب کبھی پاکستان آئے یا پاکستانیوں سے دنیا میں کہیں بھی ملے تو پاکستانیوں نے انہیں بصد محبت و احترام آنکھوں پہ بٹھایا۔ ان پہ صدقے واری گئے۔ کچھ دیر بعد بالآخر ہم لوگوں نے اجازت چاہی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ فینی کے بھائی نے بہن سے یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کیسے آئے تھے اور اب کیسے جاؤ گے؟ ہم لوگ نیچے اترے اور دھوپ میں چل کر آگے جا کر ایک رکشہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت مجھے یاد آیا، آتے ہوئے فینی کے شوہر نے جب ہمیں گاڑی سے ڈراپ کیا تھا تو فینی نے کہا تھا "آپ بھی اوپر آ جائیں۔" اس پر اشوک نے جواب دیا تھا "میں نہیں جاتا بڑے لوگوں کے گھر۔" اس فقرے کی اس وقت یا تو مجھے سمجھ ہی نہیں آئی تھی یا میں نے سنی ان سنی کر دی تھی لیکن اب مطلب صاف سمجھ میں آ گیا تھا۔ اتنی نو لفٹ تو ہمیں زندگی بھر میں کبھی نہیں ملی تھی لیکن خیر میرا خیال ہے ایسے تجربات انسان کو عجز سکھاتے ہیں، لہٰذا میں نے عاجز آ کر پاکستان پہنچنے پہ اپنی بہن بشریٰ انصاری کو یہ واقعہ سنایا تو بڑی حیران ہوئی۔ میں تو اپنے اوپر ہنسے جا رہی تھی کہ بڑے بے آبرو ہو کر ان کے فلیٹ سے ہم نکلے مگر بشریٰ خفا ہو کر کہنے لگی "ہائے اللہ شبانہ اور جاوید جب کراچی آئے تو سٹیج پہ میرا نام لے لے کر مجھے بلا رہے تھے۔ میرے ساتھ بہت وقت گزارا تھا انہوں نے۔ میں نے شبانہ کو تحفے میں ساڑھیاں دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ نے بتایا تھا کہ آپ میری بہن ہو؟"

میں نے کہا "ہاں بھئی بتایا تھا مگر ان کا طنطنہ دیکھ کر میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ وہ سیلف انوالو قسم کی خاتون ہیں۔ شاید اتنی کامیابی ملے تو انسان مغرور ہو ہی جاتا ہے۔ سچ ہے اپنے محبوب ستاروں کو ملنا نہیں چاہیے۔ آپ کا ان کے بارے میں ایک تصور ہوتا ہے جو تبدیل ہو جاتا ہے۔ قصور ان کا بھی نہیں، وہ مصروف اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں مگن تھے اور ہم باوجود اس کے کہ خالی خولی فین نہیں تھیں۔ ایک ان کی بہن اور دو پاکستانی قلم کار تھیں۔ انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔"

اسی روز میری مشہور فلم میکر گلزار صاحب سے بھی اپوائنٹمنٹ تھی۔ انہوں نے فرمائش کر کے مجھ سے خاص طور پر ابا کی کتاب "دل بھٹکے گا" اور تقسیم پاکستان کے حوالے سے ان کی اپنی

کہانی کا مسودہ منگوایا تھا۔ میں یہ دونوں چیزیں ساتھ لے آئی تھی اور اب انہیں منزل پہ پہنچانے کے لیے بے تاب تھی۔ گلزار صاحب نے مجھے چار بجے دوپہر کو ملنے کا وقت دیا تھا۔ اس لیے میں جلدی جلدی ہوٹل پہنچ کر تیار ہونے لگی۔

میں نے رکشہ لیا اور گلزار صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر پالی ہل کھوجنے نکل کھڑی ہوئی۔ آٹو رکشہ اونچی نیچی راہوں پر چلتا چلا گیا۔ یہ لاہور کے ٹیمپل روڈ، کوئنز روڈ جیسا ہی کوئی علاقہ دکھتا تھا جس کی سڑکیں لندن کی سڑکوں کی طرح چھوٹی اور ایک مرکزی گول چکر کے اردگرد گھومتی تھیں۔ پوچھتے پچھاتے ہم بوسکیانہ یعنی گلزار صاحب کے گھر کے آگے جا کھڑے ہوئے۔ دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ آخر اپنے آئیڈیل قلم کار، فلم کار گلزار صاحب سے ملنا تھا۔ کوئی معمولی بات تھوڑا ہی تھی، دنیائے ادب اور فلم میں ان کی ہر تخلیق متبرک سمجھ کر پسند کی جاتی ہے اور ایک ٹرینڈ سیٹر ثابت ہوتی ہے۔

تقریباً کنال رقبے پر پھیلا ہوا ان کا گھر میرے سامنے تھا اور میں ان کے سیکرٹری کے ہمراہ ان کے ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اندر بٹھا کر وہ صاحب کو اطلاع دینے کے لیے اندر چلے گئے تو میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کمرے میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے فنکار، قلم کار آ کر بیٹھتے ہوں گے، میں نے خوشی سے سوچا اور بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ سادہ سا کمرہ خوبصورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ دیوار پہ لگی گلزار صاحب کی بیٹی "بوسکی" کی بہت بڑی میورل سائز تصویر اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ اس گھر کی بہت اہم فرد ہے اور اس کی موجودگی سے یہ گھر زندہ رہتا ہے۔ گلزار صاحب نے بعد میں بتایا کہ اب تو وہ بیاہ کر اپنے گھر جا چکی ہے مگر پھر بھی بابا کے گھر کی تزئین اور انتظامات اس کی ذمہ داری رہتے ہیں۔

وہ یہاں آتی ہے اور جو جی چاہے کرتی ہے جیسے مرضی اسے سجاتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں جا بجا درختوں کے ٹہنے اور شاخیں بڑے آرٹسٹک انداز میں سجے نظر آ رہے تھے۔ مجھے بہت بھلے لگے۔ داخل ہونے والے دروازے کے بائیں طرف ایک فریم میں خانہ کعبہ اور قرآنی آیات جلوہ فگن تھیں جن سے گھر والے کے سیکولر ہونے کا پتہ ملتا تھا۔ میرے دل میں خیالات امڈ رہے تھے۔ اتنے بڑے فلم میکر ہیں، انٹلکچوئل ہیں، نہ جانے کیسے ملیں گے۔ یہ بھی سنا تھا وہ خاصے خلوت پسند ہیں۔ کیا میں انہیں سلام کروں یا نمستے کہوں؟ انڈیا میں اس قسم کی صورتحال میں یہ گڑبڑ ہو جاتی تھی اور اکثر دونوں ہی کہہ دیتی تھی۔

سفید کرتہ پاجامہ پہنے گلزار صاحب ہوا کے نرم جھونکے کی طرح اچانک کمرے میں داخل ہو گئے اور میں کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا اور میں مطمئن ہو گئی۔ کم از کم پہلا مرحلہ تو حل ہو گیا تھا۔ انہوں نے انتہائی دوستانہ انداز میں بات چیت شروع کر دی اور چند ہی لمحوں میں ہم بے تکلفی سے پنجابی میں گفتگو کرنے لگے۔ اسی کمرے کے عقبی حصے میں گلزار صاحب کا ڈیسک اور کرسی رکھی تھی، جس پہ بیٹھ کر انہوں نے نہ جانے کتنے خوبصورت سکرپٹ اور شاعری تخلیق کی ہوگی۔ میز پہ رکھی قاسمی صاحب کی چھوٹی سی تصویر سے ان کی احمد ندیم قاسمی صاحب سے عقیدت کا پتہ چلتا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ گلزار انہیں بہت عزت دیتے ہیں اور ان کی تحریر کو پسند کرتے ہیں۔ گلزار صاحب کی اپنی تحریریں جادو جگاتی ہیں۔ کتنی ہی بار ان کی تحریروں نے ہمیں اندر سے خوش کیا، ہماری روح کو سکون بخشا، ہمیں انٹلکچوئل طمانیت بخشی، زندگی کے وسیع تر معنی سمجھائے۔ آرٹس کے بغیر انسانی زندگی کتنی بے رنگ اور بے کیف رہتی ہوگی میں تو ایسی زندگی کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتی جس میں تحریر، تصویر، موسیقی، قدرت پرستی نہ ہو۔ آرٹس ایک نعمت ہیں اور ہمیں اس نعمت پہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔

''ممبئی کیسا لگا؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں جھجک کر رہ گئی۔ آخر ان کا شہر تھا، مجھے ٹرین والے واقعہ کے ساتھ ساتھ اپنی تازہ تازہ عدم پذیرائی بھی یاد آ گئی۔ پھر یہ بھی یاد آیا کہ گزشتہ صبح ہوٹل سے نکلتے ہوئے میرے ساتھی پاکستانی بھائی کلیان سنگھ نے اپنا ایک تجربہ مجھے سنا کر بددل کر دیا تھا۔ کلیان سنگھ ہمارے گروپ کے ساتھ تھے جو پشاور سے آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کو ایک رکشہ والے نے یہ سن کر کہ وہ پاکستان سے ہیں، اپنے رکشے میں بٹھانے سے انکار کر دیا تھا جس پر کلیان جی کو بہت غصہ آیا تھا۔ وہ کہنے لگے ''تم ہمارے دشمن ہو۔'' کلیان نے بتایا اور پھر وہ بھی اسے گالیاں دے کر کسی اور رکشے میں سوار ہو گئے۔

میں نے گلزار صاحب کو تھوڑا سا یہ سب بتایا تو وہ سر ہلانے لگے اور کہا ''دراصل ممبئی میں بال ٹھاکرے کا بہت ہولڈ ہے اور وہ تو ہم سب کو پتہ ہے کہ بہت اینٹی پاکستان جذبات رکھتا ہے۔'' یہ تو میں نے بھی نوٹ کیا تھا کہ سڑکوں پر جا بجا ٹھاکرے کے انتخابی پوسٹر لگے ہوتے ہیں اور مقامی لوگوں میں اس کو ہیرو کی سی حیثیت حاصل ہے مگر یہ دیکھ کر دل کچھ دکھتا تھا کہ شاید جغرافیائی طور پر (پنجاب کی نسبت) دور ہونے کی وجہ سے اور شاید دیگر جنوبی شہروں، میں پاکستان سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں پائی جاتی۔ تقسیم کے زخم چونکہ پنجاب نے ہی زیادہ سہے تھے، لہٰذا انڈین

پنجابیوں میں اب بھی اس خطہ پنجاب کے لیے جو پاکستان کے حصے میں آیا، محبت اور کشش پائی جاتی ہے۔ انڈین پنجابیوں کے ماں باپ وہاں سے آئے تھے اور آباؤاجداد اب بھی اسی مٹی میں آرام سے لیٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ جذباتی طور پر خود کو اس سے علیحدہ نہیں کر سکتے، اس جنریشن تک تو یہی ہے، اگلی نسلیں جو خالص پاکستان اور خالص انڈیا میں پیدا ہوئی ہیں اس آزار محبت سے آزاد رہیں گے اور ان کے لیے دو ملکوں کی محبت و نفرت شاید اتنا بڑا مسئلہ نہیں رہے گی۔

''میں تو خود پاکستانی ہوں کیونکہ میں جہلم میں پیدا ہوا تھا۔'' گلزار صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ خیال تو پہلے بھی تھا کہ وہ کچھ اپنے اپنے سے ہیں لیکن اب یقین ہو گیا کہ وہ تو اپنے ہی ہیں۔ میں نے انہیں ابا کی کتاب اور تقسیم سے متعلق ذاتی کہانی کا مسودہ دیا تو انہوں نے اسے آنکھوں سے لگایا اور پھر ایک طرف رکھ کر کہنے لگے۔ ''چلو میں تمہیں اپنے سٹاف سے ملواتا ہوں۔'' ہم بیٹھک سے اٹھے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں سر پہ دوپٹہ لیے ایک نوجوان خاتون بیٹھی کمپیوٹر پر کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا ''یہ میرے اردو کمپوزنگ کا کام کرتی ہیں۔'' گلزار صاحب موبائل فون نہیں رکھتے تھے مگر چونکہ مصروف آدمی ہیں، لہٰذا ان کے سٹاف کو بار بار انہیں آ کر کچھ نہ کچھ بتانا پڑتا تھا۔ وہ ان دنوں منشی پریم چند کی کہانیوں کو ٹیلی ویژن کے لیے فلم بند کر رہے تھے۔ اس لیے مسلسل شوٹنگوں میں لگے ہوئے تھے۔ چند ہی دنوں بعد انہیں ایک بڑا سرکاری ایوارڈ بھی ملنے والا تھا۔ ''چلو اوپر کچن میں چل کر چائے پیتے ہیں۔'' انہوں نے مجھے پیار سے دعوت دی اور ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ گلزار صاحب بھی اکثر ہندوستانی لوگوں کی طرح گھر میں ننگے پاؤں گھوم رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو گی کہ اس طرح انسان کا دھرتی سے رشتہ جڑا رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زمین سے قریب محسوس کرتا ہے اور اسے ہر لمحہ اس حقیقت کا ادراک رہتا ہے کہ وہ ایک مشت خاک کے علاوہ کچھ نہیں اور دھرتی ہی اس کی اصل منزل ہے۔

گلزار صاحب نے ہمارے ساتھ چائے پینے کے لیے ایک ساتھی سلیم صاحب کو بھی آفس میں سے اوپر بلوا لیا تھا جن کے ساتھ مزے کی بات چیت ہوتی رہی۔ یہ ایک چھوٹا سا کچن ایریا تھا جس میں ایک طرف کو ڈائننگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی اور گلزار صاحب کا پالتو کتا زمین پہ بیٹھا انگڑائیاں لے رہا تھا۔

سلیم صاحب ابھی ایک روز پہلے ہی کراچی سے اپنے کسی رشتہ دار کی شادی کی تقریب

اٹینڈ کرنے کے بعد لوٹے تھے۔ اس لیے گلزار صاحب کو پاکستان کے چوندے چوندے قصے سنانے لگے۔ کہنے لگے ''گلزار بھائی پاکستان کے لوگ اتنا کھاتے ہیں، اتنا زیادہ پکاتے ہیں کہ بس کیا بتائیں؟''

''پوری رات جاگتے ہیں، ہنگامہ بپا رکھتے ہیں۔ صبح پانچ بجے سوتے ہیں۔ دن چڑھے اٹھتے ہیں۔ قیمتی کپڑے پہنتے ہیں، عیش کرتے ہیں عیش۔''

گلزار صاحب یہ سب سن کر زیرلب مسکرائے جا رہے تھے اور میں تائید میں سر ہلائے جا رہی تھی کہ سچ ہی تو کہہ رہے ہیں وہ۔ سوچ رہی تھی واقعی انڈیا کے لوگوں کی سادہ طرزِ زندگی کے مقابلے میں ہم لوگ تو شہنشاہی ٹھاٹ سے رہتے ہیں۔ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے، کم کماتے، کم بچاتے ہیں۔ ہم لوگ لاپرواہیں۔ غیر سنجیدہ ہیں اور شاید اسی لیے ہندوستان کے مقابلے میں تعلیم، تکنیکی پیداواری قوت میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہمارے حکمران ہمارے بابر بھی عیش کوش ہیں اور عوام مادی مسرتوں کے پیچھے دوڑنے والے، ایسے میں ترقی کیسے؟ پڑھائیاں اور کمائیاں کیسے ہوں؟ ہمارے ہاں اب بھی خواتین کو بیشتر مردوں کے شانہ بشانہ کام نہیں کرنے دیا جاتا جبکہ ہندوستان کی ورک فورس میں خواتین کا بھی تقریباً مردوں جتنا ہی حصہ ہوتا ہے۔

''آپ پاکستان کیوں نہیں آتے؟ وہاں آپ کے اتنے چاہنے والے ہیں۔'' میں نے گلزار صاحب سے پوچھا۔

''دراصل میں مجلسی آدمی نہیں ہوں۔ مجھے اپنے لیے شامیں یا فنکشن کروانا پسند نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھے گھیر لیں، ویسے بھی جاوید اختر نے مجھے کہا ہے کہ پاکستان نہ جانا وہاں لوگ آپ کو کھلا کھلا کر ماردیں گے اور مجھے کھانے کا خاص شوق نہیں۔'' وہ ہنس کر بولے۔

کہتے تو وہ ٹھیک ہی تھے۔ واقعی اگر وہ پاکستان آجائیں تو ان کی یقیناً تکہ بوٹی ہو جائے گی۔ لوگ ان کو اتنا چاہتے ہیں کہ انہیں ایک پل بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ ویسے یہ بھی خوب رہی، ہم بے چارے پاکستانی اگر ہندوستان بھائیوں سے دشمنی رکھیں تو غلط کہلائیں، محبت کریں تو ستم گر سمجھے جائیں، آخر ہم جائیں تو جائیں کہاں؟

ممبئی میں گھریلو کام کرنے والی خواتین کو بائی بلایا جاتا ہے۔ گلزار صاحب کی بائی نے کچھ ہی دیر میں کڑھتی ہوئی چائے ہمارے کپوں میں ڈال دی تو ہم اسے پینے لگے۔ ساتھ میں نو ڈلز اور پنیر توسٹ بھی رکھ دیئے جنہیں گلزار صاحب نے اصرار کر کے مجھے کھلایا ورنہ میں نوڈلز کی کوئی

خاص شوقین نہیں ہوں۔ ان کے ہاں کی خاص امردوں کی چٹنی بھی میں نے کھائی تو بڑی انوکھی لگی۔ گلزار صاحب نے مجھے اپنی کتاب دی اور امرود کی چٹنی کا پیالہ بھی پیک کر کے ساتھ کر دیا کہ میں اسے بعد میں کھاتی رہوں۔

''اسی کچن سے راکھی اور میں نے اپنی زندگی شروع کی تھی۔'' گلزار صاحب نے بتایا تو میں نے غور سے اس کچن کو دیکھا جہاں ماضی کی اتنی خوبصورت اور منجھی ہوئی فنکارہ کھڑی ہو کر ہنڈیا بھونتی ہو گی۔ کیسی لگتی ہو گی وہ؟ میں نے تصور کرنے کی کوشش کی تو راکھی میرے سامنے آ گئی مگر کتنی عجیب بات ہے، وقت گزر جاتا ہے۔ لوگ چلے جاتے ہیں مگر یادیں گھروں سے چمٹی رہتی ہیں اور یادوں کو کون گھر سے نکال سکتا ہے؟ اتنا بااختیار تو انسان کبھی نہیں ہو سکا۔ چائے پینے کے بعد ہم لوگ پھر گھر کے نچلے حصے میں چلے آئے جہاں گلزار صاحب کا باقاعدہ آفس تھا، وہ اپنے سٹاف ممبران سے یہ کہہ کر ملانے لگے کہ ''یہ پاکستان کی بہت بڑی افسانہ نگار ہیں۔'' اس بات پر میں جھینپ جاتی اور گھبرا کر کہتی'' پلیز ایسا نہ کہیں، میں کسی قابل نہیں ہوں۔ آپ جیسے بڑے قلم کار کے آگے میری کیا حیثیت۔'' مگر وہ باز نہ آئے اور مسکرا کر بار بار یہی کہتے رہے۔ ان کے ساتھ گزرا ہوا وقت اتنی جلدی کٹا کہ پتہ بھی نہ چلا اور شام ہو گئی۔ میرے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ گلزار صاحب نے اپنا ڈرائیور بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ مجھے ہوٹل ڈراپ کر کے آئے۔ پچھلے واقعے کے بعد یہ عزت افزائی بہت اچھی لگی کہ قلم کے ناطے سے ہی سہی، انہوں نے مجھے ایک پاکستانی مہمان سمجھا، قیمتی وقت اور محبت دی۔ مجھے پیار سے رخصت کیا۔ ان سے پہلی ملاقات میرے دل میں ایک میٹھی یاد بن کر ہمیشہ چٹکیاں لیتی رہے گی۔

شام کو سورج اور مدحو آئے اور پورا سامان اٹھوا کر مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ ممبئی کراچی کی طرح فلیٹوں کا شہر ہے۔ جہاں اکثر لوگ بلڈنگوں میں ہی رہتے ہیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ممبئی اور کراچی میں بہت مماثلت ہے۔ وہاں کا موسم بھی ایک سا ہے لیکن مجھے ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا جس میں کراچی میں مزیدار قسم کی خنکی ہوتی ہے مگر ممبئی تو گرمی سے دہک رہا تھا۔ پسینہ مستقل آ رہا تھا اور مچھر بھی بے اندازہ تھا۔ میں سوچ رہی تھی نہ جانے گلزار صاحب ممبئی کے اس موسم میں بیٹھ کر سردیوں کی دھوپ اور فروری کی شاموں کے مدھر نغمے کیسے لکھ لیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے اس کے لیے انہیں خاص طور پر دہلی وغیرہ جانا پڑتا ہو گا جہاں ہمارے

پنجاب جیسی سردی بھی پڑتی ہے اور گلابی دھوپوں کی حدت بھی ہوتی ہے۔ جذبے دہکنے لگتے ہیں۔
روھی گارڈنز کے علاقے میں واقع سورج اور مدھو کی بلڈنگ بڑی صاف ستھری اور محفوظ سی تھی۔ ان کا فلیٹ کھلا ہوادار تھا۔
قریب ہی ایک بڑا سا بازار تھا جہاں میں مدھو اور سوج کے ساتھ اکثر جاتی اور عجیب و غریب نئی نئی سبزیاں دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ ممبئی کے کھیرے اور گاجریں بہت پتلی اور لمبی تھیں۔ سورج بتاتے کہ یہ میڈم پاکستان سے آئی ہیں تو سبزی والے بڑے اشتیاق سے بات چیت کرتے اور دلچسپی کا اظہار کرتے۔ ایک میوزک سی ڈیز کی دکان سے میں نے کچھ نایاب کلاسیکل موسیقی کی سی ڈیز خریدیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دکاندار کو کلاسیکی موسیقی کی پوری طرح شد بد تھی۔ اسی نے مجھے بتایا کہ آج کل سب سے اچھا کون گا رہا ہے اور کون ٹاپ پر ہے۔
سورج اور مدھو کے دو بیٹے ہیں جن کی تعلیم و تربیت میں دونوں اس حد تک سنجیدہ ہیں کہ انہوں نے گھر میں کیبل ٹی وی کا کوئی انتظام نہیں رکھا۔ نہ کوئی زی نہ کوئی سونی، نہ ہی این این نہ سٹار، پڑھنے کو بس کتابیں اور اخبار۔ آج کے دور میں ٹی وی کے بغیر رہنا آسانی سے کہاں ممکن ہے، کم از کم پاکستان میں تو میں نے ایسا کوئی گھر نہیں دیکھا جہاں بچوں کی پڑھائی کی خاطر ٹی وی نہ لگوایا گیا ہو۔
سورج ممبئی کے ادبی حلقوں میں بہت سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ ایک شام مجھے بھی ان کے ہمراہ ایک ادبی شام اٹینڈ کرنے کا موقع ملا تو بہت سے ادیبوں، شاعروں سے ملاقات ہوئی اور ان کی مختصر کہانیاں ''لگو کتھا'' سننے کا موقع ملا۔ یہ تقریب ایک ہندی فلم ایکٹر کے گھر تھی جنہوں نے ''لگان'' فلم میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ راجندر (شاید یہی ان کا نام تھا) کا گھر بہت آرٹسٹک انداز میں سجا ہوا تھا۔ باہر لان میں زمین پہ بیٹھ کر سب نے کہانیاں سنیں اور سورج نے چارپائی پہ بیٹھ کر نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ مجھے بھی یہاں ایک کہانی پڑھنا تھی۔ سو میں نے پڑھی۔ سبھی لوگوں نے میرا بڑی گرمجوشی سے سواگت کیا اور میری مختصر کہانی سن کر مجھے خوب داد دی۔ وہیں ایک نوجوان شاعرہ کویتا سے بھی ملاقات ہوئی جن کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ ایک کامیاب بزنس ویمن بھی ہیں۔ ''آپ کا کیا بزنس ہے؟'' میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔ ''بوتلوں کے ڈھکن بنانے کی فیکٹری ہے میری۔'' یہ سن کر میں پل بھر کو سوچ میں پڑ گئی۔ بوتلوں کے ڈھکن واقعی کتنی ضروری چیزیں ہیں اور ہم نے کبھی خیال ہی نہیں کیا کہ آخر انہیں کون

بنتا ہوگا؟ اور اگر ڈھکن نہ ہوں تو بوتل کا کیا ہو۔ یہ بات بڑی دور تک جاتی تھی۔ کویتا بہت پیاری لڑکی تھی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں ایک شام ان کے گھر آؤں کہ وہ ایک تقریب ملاقات رکھنا چاہتی ہیں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اتنا پیار مل رہا تھا تو خوشی ہو رہی تھی کہ لوگ اندر سے اچھے ہی ہوتے ہیں، بس وقتی مصلحتیں اور ترجیحات انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیتی ہیں جنہیں آج کے دور میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دینے میں ہی ہماری بہتری ہے۔

مدھو کی اور میری بہت دوستی ہو گئی مگر وہ مجھے میڈم کہہ کر بلاتی تھیں، بہت عجیب لگتا۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ آپ میرا نام لیں مگر وہ ہچکچائیں۔ پھر میں نے نوٹ کیا کہ انڈیا میں لوگ خواتین کو زیادہ تر میڈم کہہ کر بلاتے ہیں۔ باجی، خالہ، آپا جی اور خاص طور پر آنٹی نہیں کہتے۔ ہمارے ملک میں تو آپ کو ہر عمر کا آدمی لڑکا، بچہ، بابا فوراً آنٹی کہہ دیتا ہے۔ چاہے وہ ہم سے صرف دو گھنٹے ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ میرا تو خیال ہے پاکستان میں خواتین کو ایک تحریک چلانا چاہیے جس میں یہ ہو مطالبہ کہ ہمیں آنٹی نہیں میڈم کہا جائے۔ کتنا اچھا اور کتنا باوقار لفظ ہے یہ میڈم۔ دودھ والا، سبزی والا، چوکیدار بھی مدھو کو میڈم کہہ کر بلاتے تو بہت اچھا لگتا۔ ایک روز میں نے چائے میں دودھ ڈالتے ہوئے مدھو سے حیران ہو کر کہا ''یہاں کا دودھ بہت اچھا ہے۔ کیا بات ہے۔ آپ کا دودھ والا پانی کم ڈالتا ہے؟'' مدھو نے بے وقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھ کر کہا ''پانی؟ وہ بھلا پانی کیوں ڈالنے لگا؟'' اس سوال کا یہ جواب سن کر میں تو پانی پانی ہوگئی۔

ایک روز میں اور مدھو واک کرنے جا رہے تھے۔ مدھو نے اپنی بلڈنگ کے نیچے موجود واچ مین کو اپنے گھر کی چابیاں دیتے ہوئے کہا ''بیٹا سکول سے آئے گا تو اسے دے دینا۔'' اور آرام سے میرے ساتھ چل دی۔ میرے اندر کی ہمیشہ کی فکر مند خوفزدہ ماں ایک دم بے چین ہوگئی۔

''چوکیدار کو چابی دے رہی ہو۔ بچہ گھر میں اکیلا ہوگا جب وہ اسے چابی دے گا۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات؟ کوئی چوری؟'' میں نے دبے لفظوں میں اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو سالہا سال سے واچ مین کو گھر کی چابی دے دیتی ہوں۔ کبھی کچھ نہیں ہوتا۔'' مدھو نے یہ کہہ کر مجھے مطمئن تو کر دیا مگر میں سوچ میں پڑ گئی۔ یہ لوگ کتنے اصولی اور ایماندار اور ہم پاکستانی مسلمان لوگ اتنے موقع پرست اور بے ایمان کیوں ہیں؟ ہم تو پاکستان میں چوروں، ڈاکوؤں، نوکروں، چوکیداروں، دودھ والوں اور سیاست دانوں

کے ہاتھوں اتنے غیر محفوظ ہو گئے ہیں کہ اس طرح کسی پر آسانی سے اعتماد کرنا جانتے ہی نہیں۔ ہم اسے شکی، وہمی اور ڈرے ہوئے لوگ بن گئے ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا اور کوئی اچانک ہم پر وار کر جاتا ہے اور ہم بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ جاتے ہیں۔ آخر ہندوستان میں کونسی یہ کہ غربت نہیں ہے مگر وہاں اس طرح کی پریشانیاں نہ ہونا کم از کم میرے لیے ضرور حیران کن بات تھی۔

نوجوان شاعرہ کویتا نے ایک شام اپنے خوبصورت فلیٹ میں میرے لیے ''گوشتی'' یعنی ادبی نشست رکھی۔ ان کا فلیٹ گو ایک پرانی سی بلڈنگ کا بالائی فلور تھا مگر اسے جدید ترین انداز میں اس طرح سے ری ماڈل کیا گیا تھا کہ بالکل نیک لگ رہا تھا۔ خوبصورت لکڑی کا فرنیچر اور آرٹ کے نمونے، چھت پہ دلکش لائٹنگ سب کچھ گھر کو بہت انفرادیت عطا کر رہا تھا۔ ہر انڈین گھر میں میں نے دیکھا کہ ایک کمرہ یا ایک گوشہ مندر کے لیے مخصوص رہتا ہے۔ کویتا کے گھر کا مندر بہت خوبصورت تھا۔ میں نے اسے جھانک کر دیکھنا چاہا تو یکدم کویتا بولی ''آپ اندر جا سکتی ہیں، ہم لوگ مائنڈ نہیں کرتے۔'' یہ سن کر مجھے خیال آیا کہ مجھے یونہی ہر کمرے میں بے دھڑک نہیں گھس جانا چاہیے۔ آخر میں مسلی ہوں، دوسرے مذہب سے ہوں مگر پتہ نہیں کیوں کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ ایک بار لندن میں ایک انڈین ادیب دوست کے گھر میں تھی تو انہوں نے مجھے کچن میں سبزی کاٹنے کے لیے بلایا۔ اس پر میں نے ہنس کر انہیں کہا'' دیکھ لیں کہیں آپ کی رسوئی بھرشٹ نہ ہو جائے۔'' اس پر خوب قہقہہ پڑا۔ شکر ہے اب لوگوں میں وسیع النظری آ گئی ہے اور پڑھے لکھے لوگ اس طرح کا تعصب نہیں رکھتے۔

کویتا نے بتایا کہ امیتابھ بچن صاحب کا گھر بھی ان کے ہی علاقے میں تھا۔ میں تو سمجھے بیٹھی تھی کہ ہالی وڈ سٹارز کی طرح امیتابھ بچن بھی کسی شاندار محل میں رہتے ہوں جس کے آس پاس میلوں ویرانہ اور سبزہ زار ہوگا مگر سن کر حیرت ہوئی کہ وہ وہیں کہیں رہتے ہیں۔ میں نے سنا کہ ان کے گھر کے آگے صبح شام ان کے مداح یعنی عوام الناس جمع رہتے ہیں۔ وہ جب شام کو گھر آتے ہیں تو گیٹ کھلنے کے بعد بند ہو جاتا ہے۔ امیتابھ اندر جا کر پھر ایک بار باہر آتے ہیں۔ آکر لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہیں اور مسکرا کر اندر چلے جاتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت اچھا لگا کہ اتنے بڑے سپر سٹار ہونے کے باوجود انہیں اپنے چاہنے والوں کی محبت کا کتنا احساس رہتا ہے۔ واقعی ایک سپر سٹار میں اسی طرح کی سپر کوالٹی ہونا چاہیے ورنہ وہ تو انسانیت کے زمرے میں ہی نہ آئے۔

ماضی کے اداکار جیتیندر کی بیٹی ایکتا کپور اپنے کامیاب ٹی وی سیریلز کی وجہ سے آج

گھر گھر میں جانی جاتی ہیں۔ کو بتا نے بتایا کہ ایکتا نے ایک بہت بڑا گھر خرید رکھا ہے جس میں وہ اپنی ساری فیملی کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس گھر میں اتنے زیادہ کمرے ہیں کہ اس کی بتیاں جلانے اور بجھانے کے لیے ایک ملازم الگ سے مخصوص ہے۔ مجھے یقین ہے وہ گھر بڑا ضرور ہوگا لیکن اس میں بے جا نمود و نمائش کے لیے دولت ضائع نہیں کی گئی ہوگی۔ یقیناً وہ بھی سادگی اور کفایت شعاری کا نمونہ ہی ہوگا۔ ایک بار میں نے کئی برس پہلے دہلی میں اندرا گاندھی کا کمرۂ شب خوابی دیکھا تھا تو میں حیران ہوگئی تھی۔ ایک عام سی میز کرسی، الماری اور ایک بستر۔ نہ کوئی جھاڑ نہ فانوس نہ قیمتی ڈیکوریشن آئٹمز نہ نوادرات۔ بس ایک کمرہ تھا جس میں وہ رہ لیتی تھیں اور دیکھا جائے تو رین بسیرے کے لیے اس سے زیادہ اور چاہیے بھی کیا ہے؟ انسان شب بھر کا مسافر ہی تو ہے۔

ہمارے حکمرانوں کا موج میلہ دیکھ کے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بے نظیر صاحب نے جب تخت چھوڑا تو ایک دن یہ دکھی بیان دیا کہ میرے بچے اپنے بڑے سے خوبصورت گھر یعنی پرائم منسٹر ہاؤس کو بہت یاد کرتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پیاری امی ہم اپنے راج محل کب لوٹیں گے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں وہاں واپس ضرور لے جاؤں گی۔ بندہ پوچھے، اس محل کو حاصل کرنے کے لیے اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے آپ دوبارہ پاکستان کی ملکہ بننا چاہتی ہیں جبکہ وہاں (دوبارہ) گدی نشین ہونے کے باوجود آپ نے پاکستان کے غریب بھوکے بچوں کی بہبود کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ان کے منہ سے سوکھے نوالے چھین کر بچوں کو سونے کے نوالے کھلاتی رہیں۔ چھ کروڑ روپے کا منرل واٹر ان کے گلے میں انڈیلا جبکہ غریب عوام صاف پانی کے ایک گلاس کو ترستے رہے۔

نواز صاحب بھی پرائم منسٹر ہاؤس میں شہزادوں کی طرح تیتر بٹیر کا شکار کھیلتے، کھاتے کھاتے رہتے تھے۔ پرائیویٹ جہاز، لاڈ پیار، ناز نخرے، اقربا پروری، ذخیرہ اندوزی سے ان کا پیٹ کبھی نہ بھرا اور وہ بھوکے ہی رہے۔ اب انڈین انتخابات کے نتائج کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ سونیا جی جیت کر بھی ایک طرف ہوگئیں، نہ کوئی لڑائی نہ جھگڑا، نہ خون نہ خرابہ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی لوگ سیاست میں تحمل اور برداشت کا رویہ رکھتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں برداشت نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ تہذیبی طور پر ہم لوگوں کے رویئے اتنے مختلف کیسے ہوگئے؟ ہم کو خود غرض حکومتوں، منافقانہ معاشرے اور جھوٹ موٹ کی جمہوریت نے ہمیشہ نقصان ہی پہنچایا ہے مگر ہندوستان میں صورتحال ایسی نہیں، ہم سے بہت بہتر ہے۔

کویتا جی کے گھر گوشٹی یعنی ادبی سنگت بہت خوبصورت رہی۔ ممبئی کے نامور شاعر، ادیب آئے اور آ کر میری عزت افزائی کی۔ شام کی یہ نشست مکمل طور پر میرے لیے وقف تھی جہاں میں نے اپنا ایک افسانہ "جڑیں" پڑھا جسے سب نے بہت تحمل اور دلچسپی سے سنا۔ یہ کہانی چونکہ ہند و پاک تقسیم، ہجرت کے موضوع کا احاطہ کرتی ہے، لہٰذا سبھی نے اس سے ربط محسوس کیا اور مجھے مکمل کر داد دی۔ خوشی ہوئی کہ میری کہانی کو اتنی پذیرائی ملی۔ افسانہ کے بعد سوالات کا دور چلا اور شرکاء نے مجھ سے پاکستان، پاکستانی ادیب اور معاشرے کے بارے میں استفسارات کیے جن کے میں حتی المقدور جوابات دیتی رہی۔ سبھی بہت دوستانہ انداز میں باتیں پوچھ رہے تھے مگر دو مسلمان ادیبوں کا رویہ مجھے کچھ جارحانہ لگا۔ نغمہ نگار ندا فاضلی اور صحافی فیروز اشرف صاحب کی ناقدانہ باتیں سن کر احساس ہوا کہ انہیں پاکستان سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں۔ فیروز صاحب کو ہمارے ملک میں باقاعدہ جمہوری نظام نہ ہونے کے باوجود ابھی تک چلتے رہنے پہ حیرت اور اعتراض تھا۔ میں نے انہیں اپنی عظیم سیاسی سمجھ بوجھ کے مطابق جواب دے کر تسلی کرنا چاہی مگر شاید میں اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے کہا "دیکھیے بھائی ہمارے ہاں جمہوریت آنی جانی چیز ہے۔ آ کر جب چلی جاتی ہے تو بھی کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نظام تبدیل ہوتا نہ دن پلٹتے ہیں۔ نہ خوشحالی آتی ہے نہ بحالی تو پھر ہمیں کیا فرق ہے، جمہوریت ہو یا نہ ہو۔ ہمیں نہ جمہوریت اچھے دن دیتی ہے نہ فوجی حکومت۔ اس لیے ہم تو اب اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ نام نہاد الیکشن کے وقت اپنے حصے کا ووٹ تک نہیں ڈالنے جاتے....."

ندا فاضلی صاحب کو ہمارے بانی پاکستان حضرت قائداعظم کے بارے میں کچھ ناخوشگوار کلمات ادا کرتے سن کر میرے دل میں درد سا اٹھا۔ آخر انہوں نے ہمیں ہمارا ملک دیا ہے۔ میں ان کا یہ احسان کیسے بھول سکتی ہوں۔ کہنے لگے "میں کراچی جاتا ہوں تو ان کے مزار پہ نہیں جاتا۔ میں کیوں جاؤں، انہوں نے میری ماں کو مجھ سے جدا کر دیا تھا۔" اس طرح سے دیکھا جائے تو ہزاروں، لاکھوں لوگ اپنے ذاتی نقصانات کی بنا پر پاکستان کے وجود کو رد کر سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے اتنے بڑے اور اہم واقعہ کو صرف ذاتی تناظر میں دیکھیں اور پرکھیں۔ تقسیم کے ذمہ دار صرف قائداعظم تو نہیں تھے۔ جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے، قائداعظم کی نسبت گاندھی جی نے تقسیم پہ زیادہ زور دیا تھا۔ قائد کو مسلمانوں کی دقتوں کا احساس تھا، اس لیے وہ بھی ان کی زندگیاں، کاروبار، عزتیں بچانے کے

لیے ایک الگ ملک کے نظریہ کے قائل ہو گئے تھے۔ آج ہم پاکستانی ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک اعتماد محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا ایک اپنا وطن ہے جہاں ہم آزادی سے سانس لیتے ہیں، ہمارا ایک قومی تشخص ہے کیونکہ ہم بے زمین نہیں۔ اس کا کریڈٹ قائداعظم کو دینے سے کیسے پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میں جب بھی کسی ہندوستانی مسلمان سے ملی ہوں، ان کے اندر ایک تلخی سی محسوس کی ہے جس کی وجہ شاید بے وطنی کا کوئی پوشیدہ کامپلیکس ہے۔ مسلمانوں نے اتنے برس ہند پہ حکومت کی لیکن آج وہ اقلیت ہیں، اس لیے تعصب اور تفریق کا شکار ہوتے ہیں۔ شاید لاشعوری طور پر انہیں ہم سے کوئی گلہ ہے یا غصہ آتا ہے کہ ہم ان سے الگ ہو کر بیٹھ رہے ہیں اور انہیں وہاں چھوڑ دیا ہے۔ امریکہ میں بھی جب بھی میرا کسی انڈین مسلم سے ملنے کا اتفاق ہوا اس نے واپسی کے کسی خواب کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی نسبت پاکستانیوں میں ہمیشہ اپنے وطن لوٹ جانے کی ایک خواہش ضرور پلتی ہے اور اس کا وہ گاہے بگاہے اظہار بھی کرتے رہتے ہیں کہ اک دن ہم لوٹ کر گھر جائیں گے کیونکہ لوٹ جانے کو ان کے پاس ایک وطن جو ہے۔

اگلے روز جب مدحو اور سورج کام پر چلے گئے تو میں نے سوچا مجھے سوشل فورم کا ایک اور چکر لگا ہی لینا چاہیے۔ آخر اسی کے لیے تو اتنے کشٹ کاٹ کر یہاں پہنچی ہوں۔ بس یہی سوچ کر گھر سے نکلی اور رکشہ تلاش کرنے لگی جو بڑی آسانی سے مجھے مل گیا۔ اس رکشے پر بھی دوسرے کئی رکشوں کی طرح پچھلے پہیوں کے اوپر دھاگے سے بندھے لیموں اور ہری مرچیں لٹک رہی تھیں۔ کئی بار سوچا کیا یہ اچار کے لیے سکھانے کا کا طریقہ ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب کی بار رکشہ والے سے پوچھا تو اس نے بتا کر گتھی سلجھا دی کہ ''یہ ہم اپنے رکشے کو بری نظر سے بچانے کے لیے لگاتے ہیں۔'' بدروحوں کو بھگانے کے لیے لہسن کے استعمال کا تذکرہ تو میں نے پہلے بھی سنا تھا مگر یہ لیموں مرچیں؟ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ شاید گھر میں ہری مرچوں، لیموں والے اچار کی بوتل کا کوئی ایسا بھی مصرف ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ کیا پتہ؟

گوراگاؤں کے سوشل فورم میں وہی رونقیں تھیں، ہنگامے تھے جو میں پہلے روز دیکھ چکی تھی۔ سٹیج کے پنڈال پہ لگے بڑے سے کالے کپڑے پر فیض صاحب کی تصویر اور نام دیکھ کر دل فخر سے بھر گیا کہ ہمارے پاکستانی شاعر کو بین الاقوامی سطح پر اتنی شناخت حاصل ہے۔ ایک گوشے میں ایک ادبی محفل سجی دیکھ کر میں بھی پل بھر کو ستانے کے لیے بیٹھ گئی۔ کچھ لوگ انگریزی میں اپنی نظم

اور نثر پڑھ رہے تھے اور کچھ موسیقی کے ساتھ سنا رہے تھے۔ برگد کے بڑے سے درخت کی چھاؤں تلے بجی یہ ادبی محفل دیکھ کر جی میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ انمول گھڑیاں میں کسی کے ساتھ شیئر کر رہی ہوتی لیکن میں اکیلی تھی اور سارا سنسار میرے سامنے تھا۔ یہ تنہا خاک نوردی اس پوری کائنات میں خدا نے آخر میری وحشتوں کے لیے کوئی ساتھی کیوں نہیں پیدا کیا؟

واپسی پر سوچا کیوں نہ بازار سے کچھ شاپنگ کرلوں، لہٰذا رکشہ لے کر ایک شاپنگ ایریا میں اتر گئی۔ اس شہر انتشار کی ادھڑی ہوئی سڑکوں والے پرہجوم بازار میں پھرتے میں کئی دکانوں میں گئی اور ریڈی میڈ جوڑے دیکھتی رہی۔ کچھ دکاندار یہ جان کر میں پاکستانی ہوں، بڑے اخلاق سے ملے اور کچھ نے اس بات کو بالکل بھی اہمیت نہ دی۔ میں نے چند ایسے خوبصورت سوتی جوڑے خریدے جو میرا خیال تھا کہ پاکستانی سٹائل سے مختلف ہیں اور بیگ اٹھائے کافی دیر گھومتی رہی۔

ممبئی کی لڑکیاں جینز، ٹراوزر، ٹاپ، سلیولیس قمیصیں پہنے آزادانہ گھوم رہی تھیں، موٹر سائیکلیں چلا رہی تھیں مگر انہیں کوئی گھور گھور کر یا بری نگاہ سے دیکھتا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے بھی سنا کہ اس لحاظ سے ممبئی بہت بے پرواہ اور محفوظ شہر ہے۔ وہاں لڑکیاں مغربی کپڑے پہن لیں تو کسی کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا نہ ہی کوئی کسی کو چھیڑتا ہے۔ (حالانکہ فلموں میں یہی دیکھتے ہیں کہ غنڈے اکیلی لڑکی کو گھیر لیتے ہیں اور اسے بچانے کے لیے ہیرو صاحب کو ہی میدان میں کودنا پڑتا ہے) ایسے وقت میں میرے ذہن میں یہ سوال شدت سے کلبلانے لگتا ہے کہ آخر کیا بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت اتنی غیر محفوظ رہتی ہے۔ وہ رات کو آزادانہ اکیلی باہر گھومے تو مصیبت آجاتی ہے، اسے پیشہ ور یا بدکردار سمجھ لیا جاتا ہے۔ جتنا زیادہ ہم اسلام کا زبانی پرچار کرتے ہیں ہمارے ہاں عورتوں کے خلاف اتنے ہی زیادہ جرائم ہوتے رہے ہیں۔ آخر مسلم ممالک کی خواتین اپنے معاشرے میں اعتماد اور تحفظ کے احساس کے ساتھ کیوں نہیں جی سکتیں؟

ممبئی چھوڑنے سے پہلے ایک دن سورج مجھے ممبئی کے مشہور ساحل چوپائی کی سیر کو لے گئے جہاں ہم نے ریت پر بیٹھ کر موجوں کا نظارہ کیا اور پاپڑی چاٹ کھائی، پوری بھاجی اڑائی۔ یہ وہی ساحل تھا جو اکثر ممبئی کی پرانی فلموں میں نظر آتا ہے۔ شہر کی مخدوش حالت دیکھتے ہوئے دل میں سوال اٹھتا تھا کہ بالی وڈ کی فلموں میں جو گلیمر ہے، آخر وہ کہاں ہے؟ اس کا جواب سورج نے یوں دیا کہ زیادہ تر فلمیں ممبئی سے باہر بنتی ہیں اور جو شہر میں بنتی ہیں وہ ''فلم سٹی'' میں شوٹ ہوتی ہیں۔ ''فلم سٹی'' ایک ایسی سٹی ہے جہاں نقلی سیٹ، در و دیوار، گلیاں، دروازے، جیل وغیرہ بنے

ہوئے ہیں اور وہی فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے یونیورسٹل سٹوڈیو ہالی وڈ یاد آ گیا جہاں سیاحوں کی دلبستگی کے لیے اسی طرح جھوٹ موٹ کی عمارات، نقلی شارک، وہیل مچھلی، کنگ کانگ گوریلا وغیرہ ملتے ہیں جو ہالی وڈ کی فلموں میں ہم نے دیکھ رکھے ہوئے ہیں۔

ممبئی کی فلم انڈسٹری کو یہ کریڈٹ تو دینا پڑے گا کہ وہ لوگ اپنی فلموں کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے برصغیر کے لوگوں کو تفریح مہیا کرتے ہیں اور خود بھی زرمبادلہ کماتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چپکے چپکے اپنی ثقافتی یلغار کے ذریعے فلم بینوں کے ذہنوں کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ایک بار سونیا گاندھی نے یہ کہا تھا تو ہمیں بہت برا لگا تھا مگر حقیقت کچھ ایسی ہے، لہٰذا ماننا ہی پڑے گا کہ انڈین فلمیں پاکستان میں بھی گھر گھر شوق سے دیکھی جاتی ہیں اور آج کوئی بھی ان کے اثرات سے محفوظ نظر نہیں آتا۔ آج ہمارے بچے، مندر، پھیرے، وشواس جیسے شبد (او وہ سوری الفاظ) سے بڑی اچھی طرح واقف ہیں اور انہیں اکثر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ میں تو ایک لحاظ سے انڈین فلموں کو ایک اور کریڈٹ دوں گی۔ ذاتی تجربے کی بنا پر کہ آج پردیسوں میں رہنے والے بچے (جن میں میرے بچے بھی شامل ہیں) انڈین فلموں اور گانوں کی وجہ سے برصغیر کی تہذیب، زبان اور رسم و رواج سے جڑے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ فلمیں نہ ہوتیں تو ہمارے بچے مکمل طور پر انگریز اور امریکن بن گئے ہوتے اور باوجود ہماری کوششوں کے ہم انہیں اپنے کلچر کی خوبصورتیوں اور رنگارنگی سے متعارف نہ کروا سکتے۔ شاید کچھ لوگ میری اس بات سے اتفاق نہ کریں گے لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔

ممبئی سے رخصت ہوتے ہوئے سورج اور مدھو جیسے پیارے دوستوں سے بچھڑتے وقت دکھ ہو رہا تھا مگر اب مجھے دہلی جانا تھا جہاں میرے پیارے دوست آتم سہگل کی فیملی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اب اپنے پاکستانی گروپ سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ اس لیے مجھے اکیلے ہی ممبئی سے سفر کرنا تھا۔ اب کی بار سوچا تھا کہ اچھی ٹرین میں جاؤں گی، لہٰذا میں نے راجدھانی ایکسپریس کی پہلے سے ہی ٹکٹ خرید رکھی تھی اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی تسلی ہوئی کہ یہ بہت صاف ستھری اور جدید قسم کی ٹرین تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک تمیزدار بیرا آتا اور کھانے پینے کے لیے کچھ دے جاتا۔ صاف کمبل، تولیے دیکھ کر جان میں جان آئی اور میں آرام سے اپنی ریزرو برتھ پہ براجمان ہو گئی۔

سفر چونکہ یہ بھی لمبا تھا، اس لیے کچھ ہی وقت میں مسافر ایک دوسرے سے کھلنے ملنے لگے اور ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ چند نوجوان لڑکے

لڑکیں (یہ جان کر کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے) میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور رات گئے تک مجھ سے پاکستان کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ان کے والدین انہیں بار بار بلاتے تو وہ انہیں ہنس کر واپس بھیج دیتے اور ''ابھی آتے ہیں'' کہہ کر پھر مجھ سے باتیں کرنے میں محو ہو جاتے۔ پاکستان کے بارے میں ان کی معلومات بہت کم تھیں۔ اس لیے وہ بہت متجسس تھے کہ پاکستان کیسا ہے؟ وہاں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کی فلمیں کیسی ہیں؟ لاء اینڈ آرڈر کی کیا صورتحال ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان بہت اچھا اور مزے کا ہے۔ فلمیں بڑی بکواس ہیں اور دن دیہاڑے ڈاکو گھروں میں بے دھڑک آ گھستے ہیں تو ایک نے بڑے بھولپن سے کہا ''ڈاکو تو صرف گاؤں میں آتے ہیں، فلموں میں ہم نے یہی دیکھا ہے۔'' یہ سن کر مجھے ایک بار پھر حسد محسوس ہوا کیونکہ میں پہلے بھی سن چکی تھی کہ انڈیا کے بڑے شہروں میں دن دیہاڑے ڈاکو پروگرام نہیں ہوتے۔ یہ وہاں کا کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو ڈاکوؤں کی دہشت میں رہنا طرز زندگی بن کر رہ گیا ہے۔ ایک دو بچوں نے مجھ سے اردو میں اپنے نام لکھوا کر دیکھے کہ کیسا لگتا ہے اور بڑے خلوص سے گھنٹوں مجھ سے چپک کر بیٹھے رہے۔ ان کا بھی کسی پاکستانی عورت سے ملنے کا شاید یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس لیے انہوں نے مجھ سے جی بھر کے باتیں کیں اور ہمارا راستہ کٹتا چلا گیا۔

---------O---------

میں بالآخر عالم میں انتخاب شہر دہلی پہنچ ہی گئی۔ آتم سہگل نے بخیریت مجھے ٹرین سے اتار لیا اور راجندر نگر میں واقع اپنے پیارے سے گھر لے گئے جہاں ان کی دلآویز مسکراہٹ والی بیوی وجے لکشمی نے مزیدار ماش کی دال اور روٹیاں پکا کر رکھی ہوئی تھیں۔ آتم سہگل سے قریباً پانچ برس پہلے لاہور میں منعقدہ ایک پنجابی کانفرنس کے دوران ملاقات ہوئی تھی جہاں وہ اپنے ساتھی پروفیسر نریندر اور گرپریت سنگھ کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں گھر بلایا، ملاقاتیں ہوئیں اور بعد میں انٹرنیٹ کے ذریعے ہمارا رابطہ قائم رہا۔ آتم نے نریندر اور گرپریت کو بھی فون کر کے میری آمد کے بارے میں بتا رکھا تھا، لہٰذا وہ لوگ بھی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتے تھے، لہٰذا کچھ ہی دیر میں نریندر آ گئے اور مجھے دہلی کی سیر کروانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔

دہلی کا موسم لاہور ہی کی طرح خوشگوار اور پرلطف تھا۔ نرم نرم دھوپ، کھلا کھلا سبزہ اور شفیق دوستوں کا ساتھ اور کیا چاہیے تھا؟ دہلی کی سڑکیں لوکل ٹرین چلائے جانے کے لیے جگہ جگہ سے کھدی ہوئی تھیں جن کو دیکھ کر دل میں حسرت پیدا ہو رہی تھی کہ ہمارے ملک میں عوام کی آمد و

رفت کی مشکلات دور کرنے کو آخر کوئی جدید ٹرانسپورٹیشن نظام چلانے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا جاتا۔ ہماری حکومتوں میں تو بس حکمران آتے ہیں، حکمران جاتے ہیں، مدد کے ڈالر آتے ہیں، وہ ڈالر کھاتے ہیں اور عوام اسی طرح مسائل میں جکڑے بے بسی کی زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ نریندر جی مجھے لے کر قطب مینار کو چلے جس کی تعمیر اور خوبصورتی دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس انوکھے شاہکار کی اونچائی اور ڈیزائننگ دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ گزرے زمانے میں کچھ مختلف کر گزرنے والوں کے خیالات کی اڑان میں انہیں کس بلندی تک لے جا سکتی تھیں۔ یہ شاندار، پرشکوہ تاریخی مینار کسی بھی لحاظ سے دنیا کے کسی عجوبے سے کم نہیں۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں کی عظیم تخلیقی صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے اور پھر افسوس کہ یہ سب کچھ یوں زوال پذیر ہوا۔ میں نے اٹلی کا ایک جانب جھکنے والا ٹاور تو نہیں دیکھا مگر میرا خیال ہے وہ بھی قطب مینار کے حسن کے آگے کچھ نہ ہوگا۔ 239 فٹ کا یہ مینار انڈیا کا سب سے اونچا مینار ہے۔ اس کے اردگرد پھیلے سبزہ زار میں اور بھی قابل دید عمارات ہیں۔ ایک دوسرا مینار جو بنوانے والے کی وفات کے بعد ادھورا چھوڑ دیا گیا، قوت الاسلام اور قطب الدین ایبک مسجد یں، التمش اور علاؤ الدین خلجی کی قبریں، امنوں پتھر کے بنے قدیم دروازے وغیرہ مینار کی پہلی منزل قطب الدین ایبک نے بنائی تھی مگر دوسری، تیسری اور چوتھی کو اس کے داماد اور اگلے بادشاہ التمش نے ختم کروایا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ نریندر نے مجھے اتنی خوبصورت تاریخی جگہ کی سیر کروادی کیونکہ یہ مینار نظارہ واقعی مِس کر دینے والی چیز نہیں تھا۔

ایک بات جو ممبئی کے بعد میں دہلی میں بھی نوٹ کر رہی تھی۔ یہ تھی کہ سڑکوں پہ بھکاری نظر نہیں آ رہے تھے۔ گلی محلے، بازار، سڑکیں ان کے بغیر سُونے سُونے نظر آ رہے تھے۔ ہمیں تو اپنے پاکستان میں بھکاریوں کے حملوں کی اتنی عادت ہو چکی ہے کہ ان کے بغیر گھر سے باہر ہر جگہ عجیب سی لگتی ہے۔ میں نے ایک روز آتم سے پوچھا ''یہاں فقیر نظر نہیں آ رہے؟'' آتم نے جواب دیا ''وہ تو صرف مسلم ایریاز میں ہوتے ہیں۔'' یہ سن کر میں پانی پانی ہو گئی اور کیا پوچھتی؟ آتم نے یہ بھی بتایا ہند سرکار نے بھیک مانگنا قانوناً جرم قرار دے دیا ہے اس لیے کوئی بھکاری نظر آ جائے تو پولیس اسے پکڑ کر لے جاتی ہے۔ ''ہائے انڈین لوگوں کو یہ کتنا آرام ہے۔'' میں نے حسرت سے سوچا۔ آرام سے باہر پھر سکتے ہیں لیکن یہ مجھے بھی پتہ ہے کہ سکھ مذہب میں بھیک مانگنے کو قطعی طور پر ناپسند کیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اسلام میں چونکہ

خیرات، صدقہ، زکوٰۃ کا نظریہ موجود ہے اس لیے لوگ اس رعایت کو غلط طور پر اپنے مفاد کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عملی طور پر یہ زندگی میں بھیک مانگنا، دوسروں پر انحصار کرنا اسی لیے جائز اور قابل قبول ہے کہ مذہب اور معاشرے نے اس کی گنجائش پیدا کر دی ہے۔ نکمے، کام چور اور بے غیرت لوگوں کے لیے یہی بہانہ کافی ہے۔ حکومتیں غریب کے لیے آسانیاں نہیں پیدا کرتیں، عوام لوٹ مار، چوری چکاری، بیروزگاری کے مصائب کا سامنا نہیں کر سکتے۔

سردیوں کا موسم تھا مگر سڑکوں پہ پھرتے مجھے لنڈے کے کپڑوں کی ریڑھیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے ان کی بابت آتم جی کے بیٹے ایو سے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔ ''یہاں پرانے کپڑے نہیں بکتے۔ ہم کیوں امپورٹ کریں جبکہ ہمارے ہاں لدھیانہ میں اتنا کپڑا بنتا ہے کہ ہم خود کو پہنانے کے بعد دیگر ملکوں کو بھیجتے ہیں۔ ہمیں سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' یہ سن کر مجھے بہت اچھا لگا کہ ہماری جیسی غربت اور معاشی ناآسودگی کے ماحول کے باوجود انڈیا والے مغربی ممالک کے استعمال شدہ کپڑے نہیں منگواتے۔ ایک ہم ہیں۔ طرز رہائش ہماری ان سے کہیں بہتر ہے مگر کپڑے اتنے سستے نہیں بناتے کہ اپنی قوم کا ننگا تن ڈھانپ سکیں۔ جن گوروں کے ساتھ ہم نظریاتی طور پر برسر پیکار رہتے ہیں انہی کی اترن پہن کر موسموں کی سختیوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ سبحان اللہ۔

اگلی صبح نریندر جی مجھے اپنے گھر لے گئے جہاں ان کی پروفیسر بیگم سبودھ کے خیالات اور بیٹی پریتی کی موسیقی سننے کا مدھر موقع ملا۔ سبودھ مذہبی تنگ نظری اور خواتین کے معاشرتی استحصال کے خلاف مختلف محاذوں پر ڈٹی رہتی ہیں اور اپنے طالب علموں میں نئی سوچ جگانے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی ہیں۔ مجھے ان کی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی اور ہمارا وقت آپس میں بہت اچھا کٹا۔ ان کی بیٹی پریتی نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہوئی ہے، لہٰذا ان کا گانا ان کی اعلیٰ پائے کی فنکاری کا نمونہ تھا۔ شام ہوتے ہی ان کے طبلہ نواز عزیز صاحب آ جاتے ہیں، پریتی گاتیں، میں اور سبودھ سنتے اور سر دھنتے۔ یہ سارا گھرانہ ہی بہت میوزیکل تھا۔ نریندر صاحب خود بھی موسیقی کے انتہائی دلدادہ ہیں اور جب پریتی گاتے گاتے تان لگاتی تو ان کی گود میں لیٹی ان کی ننھی سی کتیا بھی زور سے میاؤں کر کے داد دیتی۔ ایک سماں سا بندھ جاتا۔

اگلی صبح میں آتم، نریندر اور گرپریت جی کے کالج گئی جہاں ان کے ساتھی اساتذہ اور پرنسپل شاہد صاحب سے تفصیلی ملاقات رہی۔ سبھی نے میری خوب آؤ بھگت کی اور مجھے پل بھر کو بھی

محسوس نہیں ہوا کہ میں اپنے نہیں کسی دوسرے ملک میں ہوں۔ شاہد صاحب نے اس تاریخی ذاکر حسین کالج کے بارے میں مجھے معلوماتی لٹریچر دیا اور اس کے پرانے قصے سنائے۔ ایک مزیدار واقعہ کچھ یوں تھا کہ انگریز کے زمانے میں ایک بار اس کالج میں فارسی کے معلم کے طور پر مرزا غالب کو نوکری کے لیے بلایا گیا۔ مرزا صاحب رضامند ہو گئے اور کالج کو چل دیئے مگر گیٹ پر پہنچ کر واپس لوٹ گئے کہ ہم ایسے کالج میں نوکری کیسے کر سکتے ہیں جہاں ہمیں کوئی گیٹ پہ لینے ہی نہ آیا ہو۔ مرزا غالب یقیناً انا پرست تھے مگر انہیں یہ انا پرستی زیب دیتی تھی کیونکہ وہ موجوں اور آنے والے زمانوں کے ایک منفرد شاعر تھے۔ اردو فارسی زبانوں کی شاعری کے ماتھے کا جھومر تھے۔ ایسا غرور ان کو سجتا تھا، لہٰذا انہوں نے کیا اور اپنی بات کو نبھایا۔

میں نے مرزا غالب کا گھر دیکھنے کی خواہش کی تو کالج کے چند نیک دل پروفیسران میرے ہمراہ چلنے پہ تیار ہو گئے۔ کلاس ختم ہوتے ہی ہم لوگ ایک جتھہ بنا کر پرانی دہلی کے بازاروں، پر پیچ گلیوں کو چلے جہاں ہمارا عظیم شاعر رہائش پذیر تھا۔ میرے ساتھ ایک بڑی ہی ہنس مکھ پروفیسر مدحو بھی ہو لیں۔ ہم دونوں ایک ہی سائیکل رکشے پر بیٹھ کر اپنے قافلے کے ہمراہ بلی ماراں کے قدیم بازار کی سیر کو چل دیئے جو اگلے وقتوں کی طرح اب بھی زندگی سے دھڑکتا تھا۔ در و دیوار دیکھتے تھے کہ زمانے گزر رہے ہیں کوئی آ رہا ہے تو کوئی جا رہا ہے اور وقت کا پہیہ اپنا چکر کاٹ رہا ہے۔ میرے ساتھی ہندوستانی پروفیسران کہہ رہے تھے کہ میری وجہ سے آج ایک مدت بعد اس بازار کو دیکھ رہے ہیں ورنہ ان گلی محلوں کی طرف اب کون آتا ہے؟ اندرون لاہور جیسے بازار کو دیکھنے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ مسلمانوں کا علاقہ ہے اور یہاں کے مسلمان ان پڑھ اور غریب رہ گئے ہیں، جیسے تقسیم کے بعد انہوں نے کوئی ترقی نہیں کی اور وقت ان سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ برقعوں میں چھپی عورتیں، معمولی کپڑوں میں ملبوس بچے، گندگی کے ڈھیر دیکھ کر حیرت اور افسوس ہوتا تھا کہ جو قوم ہندوستان پر صدیوں حکومت کرتی رہی آج اتنی محرومی اور پسماندگی کا شکار ہے اور دوسرے درجے کے شہریوں جیسی زندگی گزارنے پہ مجبور ہے۔ ہند کے مسلمانوں میں زیادہ تر کاریگر طبقہ ہے جو چوڑی گری، کشیدہ کاری اور محنت مزدوری کر کے اپنے خاندانوں کو پال رہے ہیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ چونکہ تعلیم سے کوسوں دور رہ گئے ہیں، لہٰذا اچھی ملازمتیں نہیں ملتیں اور معیار زندگی بہتر نہیں ہو پاتا۔

مرزا غالب کے گھر میں قدم رکھا تو دل کو ایک عجیب سی طمانیت محسوس ہوئی۔ آخر اتنی

بڑی بستی کا گھر تھا مگر نئے سرے سے تعمیر و تزئین شدہ اس مکان میں مجھے اور یجنل پن کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ نئی اجلی سرخ اینٹوں کی دیواریں اور فرش، چھوٹا سا صحن، مجھے یقین ہے کہ غالب کا اصلی گھر ایسا نہیں رہا ہوگا۔ سننے میں آیا کہ یہ اصلی حویلی کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو شائقین کے لیے کھول دیا گیا ہے ورنہ اصل عمارت تو اب کسی کی ذاتی تحویل میں ہے اور وہ اس سے جدا ہونے کو قطعاً تیار نہیں۔ غالب خستہ کے گھر کے موجودہ مالک صاحب کوئی ہوٹل چلاتے ہیں اسی لیے آنگن میں اوپر سے پائپ جھول کر نیچے آتا نظر آ رہا تھا اور زمین پہ رکھے بڑے بڑے دیگچے زور شور سے مانجھے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دکھ سے مسکرا رہے تھے اور سامنے دیوار پہ ٹنگا ان کا شعر فریم میں جڑا جگمگا رہا تھا

بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کچھ بھی ہو محبانِ اردو فارسی کے لیے غالب کا گھر دیکھنا کسی حج سے کم نہیں ہے۔ اس لیے مجھے تسلی ہوئی کہ میں بھی حاجن ہو ہی گئی۔

رات کو آتم سہگل اور ان کی فیملی مجھے لے کر پرانی دہلی جامعہ مسجد کے علاقے میں کھانا کھلانے کے لیے لے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں مشہور و معروف کریم ہوٹل اپنے لذیذ مغلئی کھانوں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے تو کیوں نہ ہم آپ کو بھی وہاں کھانا کھلائیں؟ نیکی اور پوچھ پوچھ، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، لہٰذا ہم سب کار میں سوار ہوئے اور چلے کریم بھائی کے مغلئی ہوٹل کو۔ پرانے لاہور جیسی پرانی دہلی کی گلیاں آتے دیکھ کر ہم لوگ کار سے اتر گئے اور پیدل چل کر ہوٹل کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ علاقہ بالکل پاکستان لگ رہا تھا کیونکہ جگہ جگہ اردو میں لکھے ہوئے بورڈ، پان کھاتے ہوئے آدمی اور بوٹیاں نوچتے ہوئے بھکاری بچے اور بچیاں۔ ہندو دوستوں کے ہمراہ چلتے ہوئے مجھے یہ نظارہ دیکھ کر بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ یا اللہ یہ مسلمان قوم کو کب غیرت آئے گی؟ ان کی غیرت صرف تبھی جاگتی ہے جب کوئی مسلم لڑکی اپنی پسند سے شادی کر لے۔ اس وقت تو وہ غیرت کے نام پہ اسے موت کے گھاٹ بھی اتار دیں گے مگر بھیک مانگتے انہیں نہ شرم آئے گی نہ غیرت محسوس ہوگی۔

مغلئی کھانا واقعی مزیدار تھا۔ سب نے خوب مزے لے لے کر تکے کباب، نان چٹنیاں کھائیں سوائے مسز آتم کے جنہوں نے اس روز برت رکھا ہوا تھا۔ ان کے برت میں روٹی

سالن کھانا منع تھا اس لیے وہ کینو اور حلوہ کھا رہی تھیں" واہ کتنے مزے کا روزہ ہے یہ...." میں نے دل میں سوچا۔ اب انہیں کیا بتاتی کہ اس طرح سے تو میں سدا کی ہی روزہ دار ٹھہرتی ہوں کیونکہ میں روٹی چاول سالن نہیں کھاتی، سبزی فروٹ وغیرہ سے ہی پیٹ بھرتی ہوں مگر مجھے غلط نہ سمجھیے اس کی وجہ کسی قسم کا تیاگ نہیں بلکہ محض ڈائٹنگ ہے۔ یہ جسم اب اتنا بے قابو ہو گیا ہے کہ کچھ بھی کھاؤں اس کی چربی بنا دیتا ہے اور مسلسل کوششوں کے باوجود وزن ہے کہ بس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

اب گرپریت سنگھ، میرے تیسرے انڈین دوست کو بھی میری میزبانی کا شوق ہو رہا تھا، لہٰذا ان کے اصرار پہ ایک دن میں ان کے گھر چلی گئی جہاں ان کے والدین، بیوی بچے اور انتہائی پر تکلف لنچ ہماری راہ تک رہا تھا۔ کھانے کے بعد گرپریت نے اپنی امی کو لیا اور ہم تینوں دہلی کے گردواروں کی سیر کو چل دیئے کیونکہ میں نے ہی فرمائش کی تھی کہ مجھے گردوارے دیکھنا ہیں۔ سب سے پہلے ہم لوگ رکب گنج گردوارہ پہنچے جو اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ وہاں گرو تیغ بہادر کا سر جسم کے بغیر جلا دیا گیا تھا اور سر کو کہیں اور لے جایا گیا تھا۔ بنگلہ صاحب گردوارہ میں ہم نے لنگر کا پرشاد بھی کھایا اور خاموشی سے بیٹھ کر گربانی سنی۔ مجھے وہاں اللہ کی موجودگی محسوس کر کے بڑا سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ عقیدت مند ماتھے ٹیک کر خدا کے حضور دعا مانگ رہے تھے۔ اس کی صفات بیان کر رہے تھے۔ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا جب سبھی خدا کے بندے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں تو پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟ کیوں لڑتے ہیں ہم انسان ایک دوسرے سے؟ کیوں نفرتوں سے اپنی قیمتی زندگیاں آلودہ کر دیتے ہیں؟ ایک گردوارے میں نیچے بنا بابا بگھیل سنگھ میوزیم اپنی طرز کا انوکھا میوزیم تھا کہ اس میں سکھ تاریخ کی کہانی بیان کرتی انتہائی خوبصورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سکھوں کے مذہبی رہنما بابا بگھیل سنگھ نے 1783ء میں شاہ عالم کے دور حکومت میں اس کے خلاف معرکہ آرائی کر کے بڑا نام کمایا تھا۔ ان پینٹنگز کو دیکھ کر صاحب اندازہ ہو رہا تھا کہ سکھ ایک جنگجو قوم تھی اور انہوں نے کسی بھی دور حکومت میں حاکموں کو چین سے جینے نہیں دیا بلکہ ان سے مقابلہ کرتے رہے اور ان کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ مغل شاہوں کو تو ویسے بھی عیش پرستی، شراب و زنا، افیم نوشی سے کبھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ انہوں نے خاک حکومتیں کرنا تھیں، لہٰذا سکھوں نے بھی گاہے بغاوتیں کیں اور لڑائیاں لڑتے رہے۔ ایک بڑی خوبصورت پینٹنگ میں گرونانک اور ان کے مستقل ساتھی مسلمان بھائی مردانہ صاحب تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں

جس سے سکھ مسلم مذاہب میں ہم آہنگی کا سراغ ملتا ہے۔ یہ دونوں مبلغ اپنا دین پھیلانے پندرہویں صدی میں بغداد اور سری لنکا بھی گئے تھے۔ اس زمانے میں ایسا سفر کرنا کہاں آسان ہوگا مگر جن دیوانوں کے آگے کوئی عظیم تر مقصد ہو، ان کے لیے زمان و مکان کی قیود کوئی معنی نہیں رکھا کرتیں۔ وہ جو کرنا ہو کر گزرتے ہیں۔ اس میوزیم کی دیواروں پر جلیانوالہ باغ میں قتلِ عام کا حکم دینے والے انگریز ڈائیر کے قاتل ادھم سنگھ کی بھی پینٹنگ لگی تھی جسے دیکھ کر میرا سر احترام سے جھک گیا۔ وہ واقعی ایک شہید تھا جس نے پوری قوم کے ساتھ کیے جانے والے ظلم کا بدلہ لے کر تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوالیا تھا۔ بھگت سنگھ کی ہیٹ والی تصویر دیکھ کر بھی دل میں اس کے لیے بہت احترام جاگا۔ گردواروں کے اس دورے نے مجھے اپنے برصغیر ہندو پاک کی تاریخ و تہذیب سے مزید آگاہی بخشی اور مجھے ایک بار پھر احساس ہونے لگا کہ میں اک رچ زمین سے پھوٹا ہوا پودا ہوں۔ بیرون ملک رہائش رکھنے کے باوجود مجھ میں ہمیشہ لوٹ جانے کی کشش زندہ رہتی ہے۔ میری مٹی مجھے پکارتی ہے کیونکہ میں اسی کا ذرہ ہوں اور اسی میں بالآخر سما جانے کی خواہش رکھتی ہوں۔

ممبئی کے بعد اب دہلی کی سڑکوں پہ بھی کتے اور گائیں آزادانہ گھومتے دیکھ رہی تھی۔ بیچاری معصوم سی گائیں لاوارث اور گمشدہ دیکھ کر مجھے کسی انگریز کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس نے کسی انڈین سے پوچھا کہ یہ یوں باہر کیوں گھوم رہی ہیں تو اس نے جواب دیا، یہ ہماری ماں جیسی ہیں اس لیے ہم انہیں روک ٹوک نہیں کرتے وہ بولا مگر تم نے اپنی ماں کو یوں بے سہارا کھلے آسمان کے نیچے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ ایک اور مزے کا واقعہ کچھ یوں تھا کہ میری ایک انڈین دوست نے امریکہ میں اپنی نانی کو شوق سے بیف برگر کھاتے دیکھ کر پوچھا ''آپ یہاں بیف کیسے کھا رہی ہیں۔ انڈیا میں تو آپ اسے ہاتھ نہیں لگاتیں؟'' نانی نے جواب دیا ''انڈیا کی گائیں مقدس ہیں امریکہ کی نہیں!''

کتے دیکھ کر میں ڈر جایا کرتی تھی اور آنکھوں میں خوف ناچنے لگ جاتا۔ ''اتنے زیادہ کتے ہیں یہاں۔'' ایک بار میں نے آتم سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولے ''دراصل ہم انڈین لوگ بڑے Fatalist ہیں۔ ہم سوچتے ہیں جو ہو رہا ہے ہونے دو.... یہاں چیزیں Co-exist کرتی ہیں۔ اگر ہم زندہ ہیں، سڑکوں پہ پھر رہے ہیں تو کتوں کو بھی پھرنے دو۔ ویسے ہماری منیکا گاندھی جانوروں کے حقوق کی اتنی بڑی سپورٹر ہیں کہ کسی کی ہمت نہیں کہ آوارہ جانوروں کو کچھ کہہ سکے۔''

یہ سن کر یاد آیا کہ ممبئی میں بھی جب میں اور مدھو شام کو واک کرنے نکلتے تو کتوں کا ایک غول ہمارے ہمراہ ہوتا۔ مدھو آرام سے چلتی جاتیں مگر میں کبھی تیز، کبھی آہستہ آہستہ چلتی۔ دائیں بائیں دیکھتی، دل ہی دل میں ہوشیار خبردار کا ورد کرتے چلتی چلی جاتی۔ کسی ریسٹورنٹ یا بلڈنگ میں جانا ہوتا تو سوئے ہوئے کتے پرے پھلانگ کر جانا پڑتا۔ اس کرتب میں آدھی جان تو پہلے نکل جاتی اور آدھی پھلانگنے کے بعد یہ سوچ کر کہ کتے صاحب اگر بیچ میں جاگ گئے ہوتے تو کیا ہوتا؟

جتنے بھی انڈین دوستوں کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، دیکھا کہ انہوں نے کتے پال رکھے ہیں۔ میں سمجھتی تھی کتے پالنا صرف مغربی ممالک کے لوگوں کا شغل ہے کہ غریب ممالک کے لوگ اپنے بال بچوں کی کفالت کے اخراجات پورے کرنے میں اتنے جکڑے ہوتے ہیں کہ اپنا جانور پالنے کا شوق پورا نہیں کر سکتے۔ مگر ایک بات ضرور کہوں گی کہ انڈین کتے بڑے شریف ہوتے ہیں، ہمارے والوں کی طرح کتے نہیں ہوتے۔ دال، سبزی جو ملے صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔ شاید دیجی ٹیرین کتے ٹانگ کو پکڑتے بھی کم ہیں۔ آخر ان کے منہ کو گوشت جو نہیں لگا، پتہ نہیں چار پاؤں والے کتوں کے بارے میں میری معلومات اتنی زیادہ نہیں ہیں۔

ہندوستان میں تقریباً دس دن گزار لینے کے بعد بالآخر میری واپسی کا دن آ گیا۔ دہلی سے لاہور روانگی کے لیے مجھے رات نو بجے چلنے والی سمجھوتہ ایکسپریس لینا تھی، البذا آتم اور ان کا بیٹا انو مجھے چھوڑنے کے لیے پرانی دہلی کے ریلوے سٹیشن لے آئے۔ جدائی کے وقت ہم تینوں کی آنکھوں میں نمی اور دلوں میں اداسی تھی۔ انسان کتنی جلدی انسانوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔ چند ہی دنوں میں ہم لوگ ایک دوسرے کے قریبی تعلق دار بن چکے تھے اور یہی انسانیت کی دلیل ہوتی ہے۔
دہلی کا ریلوے اسٹیشن لاہور کے ریلوے سٹیشن سے کہیں بڑا ہے۔ کئی پلیٹ فارم ڈھونڈنے اور پھلانگنے کے بعد میں سمجھوتہ ایکسپریس والے پلیٹ فارم پہ پہنچی تو اسے ویران، سرد اور کافی حد تک تاریک پایا۔ ابھی گاڑی کی روانگی میں دو گھنٹے باقی تھے، البذا میں نے اپنے میزبانوں کو اتنی دیر وہاں روکے رکھنا مناسب نہ سمجھا اور واپس گھر بھیج دیا۔ بارڈر نئے نئے کھلے تھے، البذا مسافروں کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر ویزا ابھی کم ہی لوگوں کو مل رہا تھا۔ اس لیے پلیٹ فارم کافی حد تک خالی خالی نظر آ رہا تھا۔ میرے ڈبے میں میرے علاوہ ایک پاکستانی وکیل صاحب بھی تھے جو میری طرح سوشل فورم اٹینڈ کر کے لوٹ رہے تھے۔ ایک مسافر جے پور کی دبلی پتلی گوری رنگت والی دیہاتی خاتون ''پیکر'' تھی۔ خوبصورت نام والی خوبصورت مسافر اپنی بہنوں سے ملنے کراچی جا رہی تھی اور خوشی سے ان کا

برا حال تھا۔ٹرین آئی اور ہم سب جلدی جلدی اس میں سوار ہو گئے۔دروازے ایک بار بند ہو گئے تو سفر کے دوران پھر نہ کھلے۔شاید سکیورٹی کی وجہ سے۔نہ کوئی اندر آیا نہ کوئی باہر گیا۔ٹرین میں بیٹھتے ہی سفر کے مصائب کا احساس ہونے لگا کیونکہ لکڑی کی بغیر فوم کی سیٹیں بہت سخت اور چبھنے والی تھیں۔ساری رات ٹھٹھر ٹھٹھر کر وقت گزارا اور پھر صبح 5 بجے ہماری منزل یعنی اٹاری کا سٹیشن آ گیا۔

پلیٹ فارم پہ اترتے دیکھا۔سر پہ کسی قسم کی چھت وغیرہ نہ تھی۔رات ظالمانہ حد تک سرد تھی،آسمان تاروں سے سجا تھا کہ آخری پہر کے سحر نے ہر چہار سو اپنا سحر بکھیر رکھا تھا۔کھلے اور وسیع پلیٹ فارم پر ہمیں صبح ہونے کا انتظار کرنا تھا۔جنوری کے آخری دنوں کی ٹھنڈ،یخ بستہ رات تھی اور ایک بے کراں پلیٹ فارم کا سامنا۔معلوم ہوا کہ صبح دس بجے امیگریشن کا عملہ آئے گا۔پاسپورٹ اور ویزے چیک کرے گا۔دن بھر ہمیں پلیٹ فارم پہ ہی ٹھہرنا ہوگا کہ واہگہ لے جانے والی ٹرین شام کو آئے گی۔تب تک کھلا آسمان ہی ہماری چھت ہوگا اور پلیٹ فارم کا فرش ہمارا بستر۔ہم بے گھر بے سروسامان،بے ٹھکانہ تو ہمیشہ سے ہیں ہی،مسافری اپنا مقدر ہے،ڈھٹائی اپنا شیوہ اور ذلالت اپنا تجربہ۔لہٰذا چپکے سے اپنا کمبل اپنے اردگرد لپیٹا،جاگرز سمیت پلیٹ فارم پہ دراز ہو گئے کہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔بیگم بی بی بھی میرے سنگ لیٹ گئیں اور ہم نے آپس میں بات چیت کر کے وقت کاٹنا شروع کر دیا۔اب اس پلیٹ فارم پہ بہت سے کتے بھی ناشتے کی تلاش میں سیر فرما رہے تھے۔ابھی کھانے پینے کو شاید انہیں کچھ ملا نہیں تھا،لہٰذا وہ بھی صابر وشاکر ہو کر کسی آس پر ہمارے قریب ہی آ کر بیٹھ گئے اور خاموشی سے ادھر اُدھر تاکنے لگے۔کالی سیاہ رات میں سناٹا،ٹھنڈا اور پلیٹ فارم پہ لیٹے ہوئے مسافران اور کتے کچھ عجیب سا منظر تھا۔دل کہہ رہا تھا''کب ٹھہرے گا درد دل کب رات بسر ہو گی؟''اور سوچتا تھا،آخر کتوں کی معیت میں ہی لیٹنا کسی کسی کا مقدر کیوں ٹھہرتا ہے؟

صبح قریباً آٹھ بجے امیگریشن والے آئے اور پلیٹ فارم پہ بنے اپنے بہت سے بُوتھ میں بیٹھنا شروع ہو گئے۔مسافر اپنے کاغذات کی پڑتال کروانے کے لیے اٹھنے لگے تو کچھ چہل پہل سی ہو گئی۔سورج نے اپنے تمازت بھرے قدم پلیٹ فارم پہ رکھ دیے تھے۔اس لیے سردی کی شدت میں بھی کمی ہو گئی۔ریڑھی والوں نے چھولے پوڑیاں تلنی شروع کر دیں تو ہم نے بھی صبر شکر کر کے وہی پتلی سی میٹھی چائے کا کوپ پی،ایک خشک بسکٹ کھا کر ناشتہ کر لیا اور رب کا شکر ادا کیا۔

بُوتھ کافی تھے لیکن پھر بھی کام کی رفتار سست تھی۔کہیں کمپیوٹر ڈاؤن تھا تو کہیں صاحب ابھی ناشتہ ہی کر رہے تھے۔سب کچھ بڑے پاکستانی سٹائل میں ہو رہا تھا۔تھوڑی ہی دیر بعد میں تنگ آ کر اٹھی

اور پلیٹ فارم پہ چل قدمی شروع کر دی۔ ایسے میں یکا یک ملکہ ترنم نور جہاں کی مدھر آواز کانوں میں آئی تو میں نے خوش اور حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ کیا کسی پاکستانی مسافر نے کیسٹ لگائی ہوئی تھی؟ نہیں یہ آواز سٹیشن کے لاؤڈ سپیکر سے آ رہی تھی جس پہ لاہور کا ریڈیو سٹیشن لگا ہوا تھا۔ دل ایک عجیب سی مسرت سے لبریز ہو گیا۔ ملکہ کی آواز ترنم بکھیر رہی تھی اور سردیوں کی مزیدار دھوپ میں میں اِدھر اُدھر پھدکتی، اڑتی پھر رہی تھی۔

واہگہ لے جانے والی ٹرین شام کو آئی تو اس وقت تک ہم تھکن سے چُور ہو چکے تھے۔ سامان اندر رکھ کر دروازے میں کھڑے ہو کر سفر کے آخری لمحات محسوس کرتے دل ملے جلے جذبات سے بھرنے لگا۔ ہندو پاک کی سرحدیں آپس میں گلے مل رہی تھیں اور اوپر تنا یکساں آسمان مسکرا رہا تھا۔ وطن واپس لوٹنے کی خوشی سے دل دھڑکنے لگا۔ پاکستان کتنا اچھا، کتنا پیارا، کتنا اپنا تھا۔ یکا یک آنکھوں میں اس خیال سے نمی آ گئی کہ اپنا ایک ملک ہے جہاں ہم جا سکتے ہیں، اسے اپنا وطن کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مٹی کی گود میں سر دے سکتے ہیں۔ گھر جانا بے حد اچھا لگ رہا تھا کہ جن کا کوئی انتظار نہیں کر رہا ہوتا انہیں بھی گھر کر تو لوٹنا ہی ہوتا ہے۔ ہماری ٹرین کے ساتھ ساتھ انڈین فوج کے مستعد سپاہی تنومند گھوڑوں پہ سواری کرتے ہمیں اٹاری سے واہگہ تک چھوڑنے آ رہے تھے۔ شاید اپنے مہمانوں کو بحفاظت ان کی سرحد تک پہنچانے، اپنے میزبانوں کا یہ روایت پوری کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سبھی مسافر انہیں ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے اور وہ بھی جواباً مسکرا رہے تھے۔

ایک سے سبز کھیتوں، زمین، موسم اور رنگ و نسل والے دو مختلف ملکوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے یہ پتہ بھی نہیں چل رہا تھا کہ سرحد کہاں شروع ہوئی اور کہاں ختم؟ یوں ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے رشتہ داروں کے ہاں سے لوٹ رہی ہوں۔ کھٹی میٹھی یادیں اور پھر سے جانے کی خواہش لیے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ بندگلی تبھی کھلے گی جب دونوں ملکوں کے عملی مسائل حل ہو سکیں گے۔ کشمیر ہماری آپس کی دشمنی کی وجہ نہ رہے گا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور تعصب میں کمی ہو گی۔ ہم کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہے، بس یہی چاہتے ہیں کہ دوستی کا پودا پھلتا پھولتا رہے، سلسلے ٹوٹنے کے بجائے جڑنے لگیں کیونکہ اس حقیقت سے اب آنکھیں چرانا ممکن نہیں کہ دونوں ملکوں کے لوگوں کا برصغیر کی تہذیب، تاریخ اور روایات پہ ایک جتنا ہی حق ہے اور کسی بھی قسم کی حکومتی سیاست یا مذہبی مصلحت انہیں اس حق سے محروم نہیں رکھ سکتی۔

----------O----------

تھوڑا سا گلہ بھی

کتنا عرصہ ہو گیا ہے یہ دکھ برداشت کرتے ہوئے لیکن اب رہا نہیں جاتا۔ سوچتی ہوں آج اس بارے میں بات کر ہی لوں۔ دل ہلکا کر لوں۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ عرصہ دس بارہ سال سے میرے بہت ہی پیارے دوست، کرم فرما، خیر خواہ جب بھی مجھے ملتے ہیں تو السلام علیکم کے بعد فٹ سے کہتے ہیں" آپ بہت موٹی ہو گئی ہیں۔" ان کا انداز گفتگو یوں ہوتا ہے جیسے مجھے خبر دے رہے ہیں کہ اطلاعاً عرض ہے کہ آپ...... ان کا خیال ہوتا ہے جیسے مجھے تو اپنے رو بہ زوال حسن و جمال کی کوئی خبر ہی نہیں یا شاید میں نے اپنے گھر سے تمام آئینے ہٹا دیئے ہیں اور مجھے دکھائی نہیں دیتا کہ اب میں کیسی لگتی ہوں؟ ویسے آپس کی بات ہے آئینے ہٹا دینے کو جی تو میرا بھی چاہتا ہے لیکن پھر سوچتی ہوں موٹی ہو گئی تو کیا ہوا؟ کیا موٹے لوگوں کو اس دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں؟ کیا موٹے انسان نہیں ہوتے؟ میں کون سا ان کے گھر سے راشن منگوا رہی ہوں یا ملکی خوراک ذخائر چٹ کر گئی ہوں جو انہیں اتنی تکلیف دے رہی ہے؟ موٹی ہوں تو کیا ہوا؟ ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی، قرضے تو نہیں معاف کروا لیے؟ اب میں ہر ایک کو اپنے موٹاپے کی تفصیلات، توجیہات تو بتانے سے رہی۔ تو یہ لوگ مجھے جیسی ہوں، ویسی ہی قبول کیوں نہیں کر لیتے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے اپنی طرف سے بے ضرر تبصرے زیادہ مرد حضرات ہی کرتے ہیں۔ خواتین چونکہ ایک دوسرے کے مسائل سمجھتی ہیں شاید اسی لیے کچھ نہیں کہتیں یا پھر اندر سے خوش ہو جاتی ہیں کہ چلو یہ تو گئی کام سے۔ شکر ہے یہ بھی موٹی ہوئی۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو مجھے خواتین کی طرف سے ایسی تنقید کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ یہ ایک بڑا احساس معاملہ ہے اور اس پر بغیر سوچے سمجھے مفروضے نہیں قائم کر لینے چاہئیں۔

پچھلے دنوں اپنے پبلشر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی مجھے دیکھتے ہی میزائل داغ دیا اور فرمانے لگے "امریکی گندم کھا کھا کر آپ نے بڑا وزن بڑھا لیا ہے۔" اس حملے کے بعد انہوں نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا تو میں نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا، نظر ان کی کیوٹ سی بتدریج سائز میں اضافہ ہوتی توند پہ جا پڑی مگر میں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ یہ اپنی سرشت میں شامل نہیں کہ کسی گول مٹول کو موٹا، کسی دبلے کو سوکھا، چمکتی ہوئی چندیا والے کو گنجا، سلونے کو کالا، بھولے کو احمق اور بھول جانے والے کو بے وفا کہہ دوں۔ حالانکہ کہہ دینے کو جی بہت چاہتا ہے مگر عورت ذات ہونے کی وجہ سے چیزوں کو برداشت کرنے کی اتنی کنڈیشننگ ہو چکی ہے کہ بات دل کی دل میں ہی رکھی رہتی ہے اور موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ میرے نام کے آخر میں بشیر ضرور آتا ہے مگر جہاں تک امریکی گندم کھانے کا تعلق ہے تو یقین جانیے میرا اس بشیر ساربان سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا جسے ساٹھ کے عشرے میں امریکی صدر جانسن نے پہلی بار امریکہ کا فری ٹکٹ اور وزٹ دیا تھا۔ واپسی میں وہ تھینک یو امریکہ کی تختی گلے میں لٹکائے اترا تھا اور اس کے بعد سے پاکستانی بندگاہوں سے امریکی گندم بھی اترنا شروع ہو گئی تھی۔ تب سے لے کر آج تک ہم امریکہ سے ایڈ لیتے چلے جا رہے ہیں اور گلے میں تختیوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں میں زنجیریں بھی ڈلواتے چلے جا رہے ہیں۔ امریکہ میں ضرور جاتی ہوں مگر اپنے بچوں کو ملنے، ان کی گندم کھانے نہیں۔

جس عمر میں اب میں ہوں، اس میں تو مغربی ممالک میں مجھے بہت عزت سے سینئر سٹیزن کہہ کر بلایا جاتا ہے مگر اپنے ہاں السلام علیکم کے فوراً بعد ہی میری فربہی پہ کمنٹ سننے کو ملتا ہے۔ لگتا ہے کوئی ٹیپ چل پڑی ہے۔ "اطلاعاً عرض ہے کہ آپ موٹی ہو گئی ہیں۔ آپ جیسی ایشوریا رائے کا انجمن بن جانا ہم کو بالکل ہضم نہیں ہو رہا۔" مجھے خیال آتا ہے، یہ میرے پیارے دوست شاید اسی لیے مجھے یہ سب کہتے ہیں کیونکہ میں یقیناً ماضی میں بہت حسین و جمیل، نازک اندام رہی ہو گی۔ تو ظالمو، مجھے تب کیوں نہیں بتایا؟ یہ دلکش راز اپنے تلک ہی کیوں محدود رکھا! پہلے کیوں نہیں پھوٹے۔ میرے بھی چار دیہاڑے خوشی میں گزر جاتے تو آپ کا کیا جاتا۔ مجھے خبر کیوں نہ دی کہ میں ہی تھی جان بہاراں رشکِ چمن، غنچہ دہن، سیمیں بدن؟ میرے حسینۂ عالم کے پیڈسٹل سے اتر ایک بے ہنگم نانی بنتے ہی بریکنگ نیوز آنے لگیں کہ آپ موٹی ہو گئی ہیں۔ بھئی سمجھنے کی بات ہے، میں بوڑھی ہو گئی ہوں تو کیا موٹی نہیں ہوں گی؟ مجھے موٹی ہونے کی

اجازت دے دیجیے پلیز۔

میرے کرم فرما یہیں پر بس نہیں کرتے بلکہ میرے زوالِ حسن کی اطلاع کے بعد مجھے ڈائٹ اور ایکسر سائز کے مفید مشورے بھی دینے لگتے ہیں۔ ایسے میں مجھے وہ بہت معصوم اور بے وقوف نظر آتے ہیں کہ کیونکہ ان میں سے بیشتر نسخے ایسے ہوتے ہیں جو میں گزشتہ تیس چالیس سال سے آزما چکی اور آزما رہی ہوں اور پھر کوششوں میں ناکام رہی ہوں، کیوں؟ کیونکہ اللہ ہی ہمیشہ مجھ سے جیتتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

تمام عمر ڈائٹنگ اور ایکسر سائز کے دشت کی سیاحی میں گزری ہے مگر نتیجہ وہی کیکٹس کا لمبا تڑنگا موٹا درخت جس کے کانٹے اب میرے جسم کے اضافی گوشت میں جا بجا چبھنے لگے ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور میری امی بھی کہ میں نے کبھی رج کے روٹی نہ کھائی، چاول کو محض سونگھ کر ان کی لذت کا اندازہ لگایا، میٹھے کو کڑوا سمجھ کر اس سے دور رہی، سبزیوں میں من کا چین ڈھونڈا مگر کچھ بھی بن نہ پایا۔ یہ جسم ایسا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ جوانی تھی تو واک، ٹینس، بیڈمنٹن سے بھی دو دو ہاتھ کر لیتی تھی، اب اس عمر میں چونکہ بار بار گھر سے باہر بھی نہیں جایا جاتا، ایک عدد جوگنگ مشین گھر میں ہی ڈال لی ہے جس پہ بمشکل آدھا گھنٹہ ہی دوڑ لگانے سے کمر اور گھٹنے یوں کڑکڑانے لگتے ہیں جیسے گرم گرم ریت میں مکئی کے دانے بھونے جا رہے ہوں۔ یہ بدن بڑا کافر ہے۔ مسلمان ہو کر ہی نہیں دے رہا۔ چربی پتھر کا صنم بنی ہوئی ہے، پگھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ گھٹنے کی بجائے اس میں روز بروز یوں اضافہ ہو رہا ہے جیسے چربی نہ ہوئی، سوئس اکاؤنٹس میں رکھے ہوئے ہمارے حکمرانوں کے پیسے ہوں۔ جسم کہنا نہیں مانتا (اب تک) میں اسے اکثر کہتی ہوں۔ تو بچا بچا کے نہ رکھ مجھے، یعنی چربی کو۔ تو آگے سے وہ بدتمیز کہتا ہے۔ تو بھی بچا بچا کے نہ رکھ مجھے۔ کچھ کر او نیک بے بیبو۔ نیکھتی جوانیاں ہیں۔

ابھی اگلے ہی روز درزی کو نیا سوٹ سلنے کے لیے دیا۔ ناپ کی قمیض پر جب نگاہ ڈالی تو دل پارہ پارہ اور لیر لیر ہو گیا۔ یقین نہ آیا کہ یہ ناپ میرا ہو سکتا ہے؟ یہ قمیض تو کسی پہاڑ کو ہی پوری آ سکتی ہے؟ ہائے جانے کہاں گئیں وہ فٹنگیں اور قمیض میں سلے ہوئے نشیب و فراز۔ اب تو سب ایک چٹیل میدان نظر آتا ہے۔ ایسا میدان جس کا کوئی انت ہی نہیں ہوتا۔ اپنے خیال کو باطل کرنے کے لیے جھٹ قمیض کو پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ پہاڑ خیمے میں مکمل طور پر فٹ تھا۔ ارد گرد کوئی فالتو پگڈنڈی یا رہگزر نظر نہ آتی تھی۔ نہ جانے وہ حسین

وادیاں کہاں چلی گئی تھیں؟ اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے بستر پہ لیٹ کر بارہا اس نکتہ عظیم پر غور کیا کہ کائنات جسم کا یہ پھیلنا کیا کسی بگ بینگ کا نتیجہ ہے تو یقین جانیے ایک ہی جواب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب اللہ کی کارستانی ہے۔ ہم عورتوں کو عمر رسیدہ کرتے ہی وہ ہمیں ٹھکانے کی تدابیر کرنے لگتا ہے۔ شاید وہ سوچتا ہے تخلیق کی یہ فیکٹریاں اب زنگ آلود ہو گئی ہیں تو ان کا مجھے کیا کرنا ہے؟ جب تک ہم اس کے کام کی رہتی ہیں، وہ ہمیں حسن و جمال، ناز و ادا سے نوازتا ہے۔ پرکشش اور ہری بھری رکھتا ہے۔ پھر جیسے ہی ہمارا نظام بارآوری سست پڑتا ہے وہ ہم سے ہماری رعنائیاں اور دلربایاں چھیننے لگتا ہے۔ کائنات میں نفوس کی پروڈکشن کا کام تو اس نے لے ہی لیا ہوتا ہے، لہٰذا اب ہم محض ایکسپائرڈ دوائیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارا پھل فروٹ سپلائی سسٹم کے شٹ ڈاؤن ہونے کے مراحل طے کرنے لگ جاتے ہیں۔ جھلملاتے دیئوں کے لویں دھیمی ہو کر کپکپانے لگتی ہیں اور حسن و جمال ڈیلیٹ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے کبھی کوئی پرانی گھسی پٹی کیسٹ تو سنی ہو گی وہی جو کیسٹ پلیئر میں پھنس کر ٹیڑھی میڑھی لینی لینی سی آوازیں نکالنے لگتی ہے اور یہ گانا بجتا سنائی دیتا ہے ...... اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا ...... جی ہاں بس وہی حال ہو جاتا ہے اپنا۔ دل البتہ یہی چاہتا ہے کہ ہم "ابھی تو میں جوان ہوں" گاتے پھریں لیکن پھر ہم سے عمر میں کہیں بڑے اور باریش مرد جب آنٹی، ماسی، اماں کہہ کر پکارتے ہیں تو دل کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں ہزار اور چننے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ وہی گلاب چہرے جنہیں دیکھ کر بہت سوں کے دلوں پر چھریاں چلتی تھیں، اب جھریوں کی وجہ سے مرجھائے، کملائے، روکھے پھیکے نظر آنے لگتے ہیں۔ آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے عاشق اور شوہر میں زیادہ فرق نہیں دکھائی دیتا مگر خیر بوجہ بزرگی اس کا امکان بھی کم کم ہوتا ہے کہ کوئی نیا عاشق سین میں انٹری دے اور پرانے تو ویسے ہی بھاگ گئے ہوتے ہیں۔ قوت سماعت کم ہو جاتی ہے مگر کان اپنے بارے میں کی جانے والی کھسر پھسر کو کسی ان دیکھے سیٹلائٹ سگنل سے کیچ کر ہی لیتے ہیں اور پھر بالآخر ہم موٹی ہو جاتی ہیں۔ موٹی موٹی خالی بوتلیں اور خالی ڈبے۔ ہڈیاں کمزور اور بھربھری ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے اکثر گھٹنوں، جوڑوں، کندھوں اور کمر میں درد رہنے لگ جاتا ہے۔

اپنا بھی یہ حال ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کی مالا میں پروئے ہوئے مہروں کے منکے کافی گھس چکے ہیں اور اپنے مقررہ مقامات سے کھسک کر کہیں اور جا بسے ہیں۔ قد اڑھائی انچ چھوٹا ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے پیٹ شریف جسے اور کہیں جگہ نہ ملی باہر کو لڑھک آیا ہے۔ بیچارہ رہ جاتا بھی

کہاں؟ پیچھے والے مہروں نے تو وفا ہی نہیں کی۔ جب کمر کمر ہی نہ رہی تو پیٹ کو تو ویسے نکالا ملنا ہی تھا۔ سروقد پہلے بھی نہ تھے مگر اب تو زمین اور قریب نظر آنے لگی ہے۔ رات آتی ہے تو اپنے دامن میں کئی دردناک فسانے لیے ہوئے ہوتی ہے۔ باتھ روم شریف کی بار بار حاضری دینے کے لیے بستر سے اٹھنے کا منظر کافی توبہ شکن ہوتا ہے۔ منہ سے وقفے وقفے سے ہائے ہائے، اُف اللہ، توبہ توبہ کے کلمات جاری رہتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم بستر سے اٹھنے کے لیے اپنی شکستہ کمر کو الائنمنٹ میں لانے کے لیے بستر کے سرہانے لگی دو عدد رسیوں کی مدد سے اپنے بھاری بھرکم جُثے کو ایک پٹخنی دیتے ہیں۔ ایسے میں ہمارے مظلوم بے کس مہرے چیخ کر طعنہ دیتے ہیں کہ ان مقامات آہ و فغاں سے گزارنے کے لیے تمہیں یہی پیہر ملا تھا۔ (نوٹ: بستر پہ لگی رسیوں کے اذکار سے اگر آپ ذہن میں کوئی رومانوی تصور قائم کر کے گنہگار ہو رہے ہیں تو اس کا ذمہ کسی طور ہم پر نہیں آ سکے گا۔ آپ مندرجہ بالا سچویشن کو صرف استخوانی مسائل کے تناظر میں ہی رکھ کر سوچیں تو آپ کے لیے اچھا ہوگا) بستر سے اترنے کے بعد زمین پر پڑنے والا ہر قدم یوں متزلزل ہوتا ہے جیسے نیل آرم سٹرانگ پہلی بار چاند پر اتر رہا ہو اور اس نے خلائی سوٹ کی جگہ افغانی شلوار پہن رکھی ہو۔

کمر کی چولیں سنبھالتے، خود کو سہارا دیتے ہم منزل مراد کی جانب یوں روانہ ہوتے ہیں جیسے ایک بے تاب کیکڑا ساحلِ سمندر کی ریت میں کسی مناسب اور متناسب جسم والی کیکڑی کی امید میں آگے ہی آگے رِہتا چلا جا رہا ہو۔ اس جہدِ مسلسل اور سعی پیہم کے بعد ہم بستر پہ لوٹنے سے پہلے ایک گھونٹ پانی ضرور پیتے ہیں۔ یاد رہے ایک گھونٹ کہا ہے، ایک گلاس نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر محض ایک گھونٹ پر ہی غسل خانے کے اتنے چکر لگ جاتے ہیں تو سوچیں، اگر ہم پورا گلاس چڑھا جائیں تو بے چارہ کیکڑا تو پوری رات...... چلیں چھوڑیں۔ ہم نے اپنے پنج سالہ منصوبے میں یہ بھی سوچ رکھا ہے کہ اب بالوں کو رنگنے سے بھی باز آ جائیں گے۔ سو عنقریب آپ ہمیں سفید بالوں والی ایک موٹی سی خاتون کے روپ میں بھی دیکھ لیں گے، لیکن رسک آپ کا اپنا ہوگا۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔ جب ہم نے اپنے آپ کو اس حال میں قبول کر لیا ہے تو آپ کو کیا تکلیف ہوتی ہے؟ آپ بھی ہمیں سمیت ہمارے موٹاپے کے قبول کر لیں۔

---------O---------

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

کہتے ہیں اگلے زمانوں کے بہت سے شہر صدیوں سے پانی میں ڈوبے، چپ سادھے ہوئے ہیں۔ کشتی بان سناتے ہیں کہ ایسے ہی ایک شہر کے کلیسا سے کبھی کبھار گھنٹیوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ یہ چاند لڑکیاں بھی مدتوں زیرِ آب رہیں مگر ان کی صلاحیتوں کے کلیساؤں سے گھنٹیوں کی آوازیں آنا بند نہ ہوئیں۔

ممتاز مفتی اکثر کہا کرتے تھے........

احمد بشیر کے جینز کا جوار بھاٹا ان لڑکیوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دے گا........ احمد بشیر اور محمودہ کے بچوں میں سے کسی نے رائٹر، اداکار، ہدایتکار، گلوکار، ڈیزائنر تو بننا ہی تھا۔ آرٹ، کلچر، ٹیلنٹ کے دریا گھر میں ہی بہہ رہے تھے۔ سو یہ تو ہونا تھا۔

Rs. 30

www.sang-e-meel.com
ISBN-10 969-35-2423-3
ISBN-13 978-969-35-2423-9